۱۰۲
سید کاشف رضا
ذکی نقوی
تصنیف حیدر
ترتیب
اجمل کمال

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 102

اکتوبر 2017

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 950روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 95امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)
بینک: میزان بینک، صدر برانچ، کراچی
اکاؤنٹ: City Press Bookshop
اکاؤنٹ نمبر:0100513669(برانچ کوڈ)0132

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 35213916 35650623
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:
Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391 Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

سید کاشف رضا

چار درویش اور ایک کچھوا

(ناول)

سید کاشف رضا 1973 میں سرگودھا میں پیدا ہوئے اور پاکستانی فضائیہ کے مختلف مراکز شورکوٹ (جھنگ)، رسالپور (نوشہرہ) کورنگی کریک (کراچی) اور چک لالہ (راولپنڈی) میں پرورش پائی۔ راولپنڈی سے بی اے کرنے کے بعد کراچی یونیورسٹی سے پہلے انگریزی ادب اور پھر لسانیات میں ایم اے کیا۔ پیشے کے طور پر اخباری اور الیکٹرانک صحافت کو اختیار کیا۔ اب جیو نیوز ٹی وی چینل کراچی میں ایگزیکٹو پروڈیوسر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ شاعری کے دو مجموعے محبت کا محل وقوع (2003) اور ممنوع موسموں کی کتاب (2012) شائع ہوئے ہیں۔ چار درویش اور ایک کچھوا ان کا پہلا ناول ہے جو جلد ہی کتاب کے طور پر بھی شائع ہوگا۔ نوم چومسکی کی تحریروں کے تراجم پر مشتمل دو کتابیں دہشت گردی کی ثقافت (2003) اور گیارہ ستمبر (2004) سامنے آچکی ہیں اور محمد حنیف کی کتاب کے ترجمے غائبستان میں بلوچ کے ترجمے میں وسعت اللہ خان کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ میلان کنڈیرا کے ناول *The Joke* اور محمد حنیف کے ناول *A Case of Exploding Mangoes* کا ترجمہ کر چکے ہیں، دونوں کتابیں جلد شائع ہونے والی ہیں۔ پڑوسی ملکوں ایران، ترکی، چین اور بھارت کے علاوہ یورپ اور افریقہ کے بعض ملکوں کا سفر کر چکے ہیں۔ سفرناموں کے علاوہ تنقیدی مضامین اور سیاسی کالم بھی لکھتے ہیں۔

ابتدائیہ

راوی کا بیان

پتا نہیں کب انسانوں نے یہ طے کیا تھا کہ کہانی کو بیان کرنے کے لیے کسی نہ کسی راوی کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ مگر ایک کہانی کو ایک راوی کیسے بیان کر سکتا ہے؟ کہانی تو ہر سمت سے دکھائی دیتی ہے، تو پھر اس کے بیان کے لیے ایک عدد راوی کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ پھر بھی میں ایک راوی ہوں، اپنے تمام تر محدودات کے ساتھ صرف ایک راوی۔ میرے پاس کہانی کو بیان کرنے کے لیے ایک زبان ہے، انسانوں کی زبان۔ لیکن میں انسانوں کی طرح گوشت پوست سے محروم ہوں۔ انسانوں کی زبان حاصل کر لینے کے سبب میں زیادہ تر انسانوں ہی کے احساسات و جذبات کے اظہار پر قادر ہوں اور اس کے لیے معانی کا خواستگار بھی۔ مجھے نہیں معلوم کسی ستارے یا درخت نے کوئی زبان ایجاد کی ہے یا نہیں۔ اور اگر کی بھی ہے تو اس کی مدد سے میں انسانوں سے، یا انسانوں کی بات کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔

پتا نہیں کب انسانوں نے یہ طے کیا تھا کہ کہانی کو کہیں نہ کہیں سے، وقت کے کسی نہ کسی نقطے سے شروع ہونا چاہیے۔ سو مجھے بھی ایک کہانی کسی نہ کسی لمحے سے شروع کرنی ہے۔ لیکن کہانی کسی ایک ہی لمحے سے شروع کیسے ہو سکتی ہے؟ کوئی کیسے نہ بتائے کہ کہانی کے پہلے لمحے سے پہلے کے مراحل نے کہانی پر کوئی اثر ڈالا یا نہیں ڈالا؟ اور کوئی کیسے نہ بتائے کہ کہانی کے اختتام کے بعد کہانی کیونکر چلتی رہی؟ لیکن میں راوی ہوں اور راوی کے پاس وقت محدود ہوتا ہے؛ محدود نہ بھی ہو تو سامع اور قاری کو صبر کی تاب تو ایک حد تک ہی ہوتی ہے نا۔ راوی کو اپنی کہانی کہیں نہ کہیں سے شروع کر کے کہیں نہ کہیں ختم کرنا ہی پڑتی ہے۔ میں خود ایک سامع بھی رہا ہوں جسے یہ جاننے کی جستجو بھی رہی ہے کہ شہزاد کے ساتھ ایک

ہزار دوسری رات کو کیا ہوا۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ میں اپنے ہر سامع میں کہانیوں کے لیے ایسی لذت کی توقع نہیں رکھ سکتا۔

پتا نہیں کب انسانوں نے یہ طے کیا تھا کہ ایک کہانی میں ایک یا دو یا تین یا سو یا ہزار کردار ہی ہوں گے۔ جہاں سے میں اس کہانی کو دیکھ رہا ہوں وہاں سے میں یہ بھی دیکھ سکتا ہوں کہ اس کہانی کے کروڑوں کردار ہیں اور کروڑوں ہی راوی۔ یہ سب اس کہانی کے سامع اور قاری بھی ہیں، بلکہ سامع اور قاری تو وہ کروڑوں بھی ہیں جو ان کی کہانی کو بنتے بگڑتے دیکھ رہے ہیں۔ اور شاید وہ نباتات و جمادات، وہ جانور اور وہ حشرات الارض بھی جو انسان کی زبان نہیں جانتے۔ ایک راوی کے طور پر میں اس کہانی کو صرف خود ہی بیان کرنے کا حق محفوظ رکھتا تھا۔ پھر بھی جہاں سے میں اس کہانی کو دیکھ رہا ہوں وہاں سے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس کہانی کو ان کروڑوں راویوں میں سے بھی کچھ کی زبانی بیان کر نے دیا جائے جن پر یہ کہانی بیت رہی ہے۔

میرے سامنے میرے پانچوں مرکزی کردار اپنی اپنی کہانیوں کی پوٹلیاں اٹھائے موجود ہیں۔ میرے ذرا سے اشارے کے منتظر، کہ میں ان پوٹلیوں میں سے زندگی کے رنگ برنگے ٹکڑے نکال کر انھیں دیکھنا دکھانا شروع کر دوں۔ اس مرحلے پر اگر میں انھیں اپنے ارادے سے آگاہ کر سکوں تو اپنی اپنی کہانی سے آگاہ ہونے کے باوجود ان میں سے ہر ایک شاید یہ دیکھنے کے لیے پُرشوق ہو گا کہ میں نے ان کی کہانی میں سے کون سے ٹکڑے منتخب کیے ہیں اور انھیں کیسے بیان کرتا ہوں۔ محدود لفظوں اور محدود سے وقت کے درمیان ان کی زندگیوں کے رنگ برنگے ٹکڑوں کو کیسے توڑتا، موڑتا اور جوڑتا ہوں کہ وہ ایک ایسی کہانی کی صورت نظر آنے لگیں جو کوئی نہ کوئی کلیت، اکائی یا معنی رکھتی ہو، یا کم از کم اس کی کوشش تو ہو۔

لیکن یہ پانچوں کردار آپ کے سامنے بھی تو موجود ہیں۔ تو چلیے ان کی کہانی کو ایک ایسا دسترخوان سمجھیے جس پر میں آپ کو بھی دعوت اڑانے کی پیشکش کر رہا ہوں۔ میں ان کی پوٹلیوں میں سے زندگی کے جو رنگ برنگے ٹکڑے نکالوں ان میں سے کچھ کو منظور کیجیے اور کچھ کو مسترد، اور منظور شدہ ٹکڑوں کو توڑ، موڑ اور جوڑ کر ہر کہانی کو خود ہی ترتیب دینے اور اپنے طور پر دیکھنے، دکھانے کی کوشش کر دیکھیے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہو گی کہ آپ کی جوڑی ہوئی کہانی آپ کی کہانی ہو گی اور میری جوڑی ہوئی کہانی میری کہانی۔ یہ سوال پھر بھی باقی رہے گا کہ یہ پانچوں کردار اگر اپنی کہانی خود کہہ سکنے پر قادر ہوتے تو کیسی کہانی کہتے۔

جہاں سے میں اس کہانی کو دیکھ رہا ہوں وہاں کہانی کو بیان کرنے کے طریقے شہرزاد کی اپنے بادشاہ کے ساتھ بتائی ہوئی راتوں سے بھی زیادہ ہیں۔ مجھے تو کوئی حاتم طائی بھی نہیں مل سکا جسے میں اپنے سات چھوڑ کسی ایک سوال کے سلسلے میں بھی زحمت دے سکتا اور جو مجھے اس کہانی کے پیچ و خم سے گزرنے میں مدد دے سکتا۔ سو میں کہانی بیان کرنے کے طریقوں کے ساتھ ساتھ اپنے سوالوں کے سلسلے میں بھی پُریقین نہیں۔ ایک سامع کے طور پر اپنی جوع البقر جیسی حرص سے آپ کو آگاہ کر چکا۔ بس مجھ کو ایک حریص راوی بھی سمجھ لیجے جس نے بیان کے ہر ہر طریقے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا ہو، مگر جو ان میں سے چند ہی کے استعمال کو ممکن کر سکا ہو۔

ایک حریص راوی کو کسی حریص سامع سے زیادہ کسی کی تلاش نہیں ہوتی۔ سو میری اس حرص میں آپ بھی شریک ہو جائیں تو مل جل کر دعوت اڑانے کا سا مزہ آ جائے۔ لیکن اگر آپ بوفے میں بھی سنگل پلیٹ لے کر پڑ رہنے کے قائل ہیں اور کہانی کے صرف ایک ہی کردار سے یگانگت محسوس کر سکتے ہیں تو کہانی میں صرف اپنے پسندیدہ کردار سے متعلق تفصیلات ڈھونڈتے جائیے۔ ہو سکتا ہے میں نے باقی تمام کردار کسی ایک ہی کردار کی کہانی بیان کرنے کے لیے لکھے ہوں۔ لیکن کیا معلوم وہ کردار ہو کون سا؟ کیا عجب ہے کہ وہ کردار وہی ہو جسے آپ کچھ کچھ پسند کرنے لگے ہیں۔

کہانی میں چار انسان ہیں اور ایک کچھوا۔ آپ نے دیکھا ہے کبھی کوئی کچھوا؟ نہیں دیکھا تو دیکھیے، اور دیکھنا نہیں چاہتے تو پہلی فرصت میں اس سے صرفِ نظر کر جائیے۔ جب یہ اور کسی کو نظر نہیں آتا تو آپ کو بھی کیوں نظر آئے؟ آپ نے اپنے ذہن میں کہانی کی جو ترتیب قائم کر رکھی ہے، اس پر اس کا چنداں اثر نہیں پڑے گا۔ کہانی میں آپ میرے مخاطب نہیں ہیں، آپ دعوت میں میرے ساتھ شریک ہیں۔ اس کہانی پر آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی راوی کا، یا کسی کردار کا۔ ایک کردار کی کہانی پڑھتے پڑھتے اگر آپ اس میں آنے والے کسی دوسرے بنیادی کردار کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں تو جھٹ اس کردار کے نام سے شروع ہونے والے باب میں چلے جائیے۔ اگر آپ کو تنجن پسند ہے تو

وہ اُدھر اور بھی رکھا ہوا ہے۔ جایئے جا کر شوق فرمایئے۔ جیسے آپ گوگل یا کسی اور سرچ انجن پر کسی کے بارے میں پڑھتے ہوئے کوئی نام دیکھتے ہیں تو اس نام کو کلک کر کے اسی کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

آفتاب، جاوید، بالا، اقبال محمد خاں اور ایک کچھوا۔۔ میرے سامنے میرے پانچوں بنیادی کردار اپنی تمام تر زندگیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن مجھے آپ کو ان کی پوری پوری زندگیوں کی کہانیاں نہیں سنانی۔ میں نے ان کی زندگی کے وہی حصے منتخب کر سکا ہوں جو ان کی یا ان سے جڑے ہوئے کسی اور کردار کی شخصیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ میرے سامنے تو ایسا ہے جیسے ان پانچ کرداروں کے بارے میں پانچ کہانیاں لکھی ہوئی پڑی ہوں اور مجھے اب ان میں سے اپنے مطلب کی کہانی نکالنی ہو۔ میرے لیے تو ایسا ہے جیسے کسی ناول نگار نے ان کرداروں کی کہانیاں لکھ کر نتائج قاری پر چھوڑ دیے ہوں اور میں کسی متجسس (اور ظاہر ہے حریص) قاری کی طرح ان نتائج کی کھوج میں نکل کھڑا ہوا ہوں۔ اور وہ ناول نگار کون ہے؟ شاید خدا۔ شاید فطرت کے ازلی اور ابدی قوانین کا کوئی پیچیدہ سلسلہ، کیا خبر؟

میں ان تجربہ کار راویوں پر رشک کرتا ہوں جو اپنی کہانی بڑی ترتیب سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ افسوس، میں ان جیسا ماہر نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں چیزوں سے بہت جلد بور ہونے لگتا ہوں۔ ایک سیدھی سادھی کہانی آپ کو سناتے ہوئے آپ سے پہلے میں خود ہی بور ہو جاتا، اس لیے میں نے کہانی کو ایک سرے سے نہیں بلکہ کئی سروں سے پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ مجھے یہ بھی کہنے دیجیے کہ اس کہانی کا کوئی ایک سرا ہے ہی نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ بہت سنجیدہ چیزیں بھی مجھے بور کرتی ہیں، اس لیے جہاں جہاں واقعات زیادہ سنجیدہ ہوتے چلے جاتے تھے وہاں آنفرتھاٹ کے طور پر میں نے ان سے چھیڑ خانی بھی کی ہے اور ان کی حد سے بڑھتی ہوئی سنجیدگی کا مضحکہ بھی اڑایا ہے۔ آپ بھی تو کہانی پڑھتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں سوچتے ہیں۔ ابھی بھی تو سوچ رہے ہیں نا؟ میں نے بھی ایسی باتیں سوچ لیں، اور بہت سی باتیں کر بھی لیں، تو کیا ہوا؟

اب آغاز قصے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔

باب اوّل

آج کا فن، حقیقت میں مکمل طور پر گھس گھسا چکا ہے...
ژاں بودریاغ (Jean Baudrillard)

جاوید اقبال

1

اٹھارہ، انیس اکتوبر دو ہزار سات

زندگی کے اگلے برسوں کے دوران اُس روز کو کئی مرتبہ دھیان میں لاتے ہوئے اسے واضح طور پر یاد آتا تھا کہ اُس روز وہ مشعال کی گردن کی ناڑ کو بہت دیر تک دیکھتا رہا تھا۔ کسی عورت کو سوچتے رہنا، اسے دیکھنے اور اس کے جمال کی ذاتی ترین تفاصیل کو کھوجنے کی جستجو کرنا اور پھر ان تفاصیل کو اپنانے کی خواہش اور کاوش کرنا زندگی کی کتنی بڑی عیاشی تھی جو اُن دنوں اُسے فراوانی سے فراہم تھی، وہ سوچا کرتا۔ اُسے یاد تھا کہ اُس روز دفتر کی کرسی پر بیٹھی ہوئی مشعال اپنے کمپیوٹر انٹرنیٹ پر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ وہ کبھی مسکراتی، کبھی اپنی آنکھیں سکیڑ کر کچھ پڑھنے کی کوشش کرتی، کبھی اپنے ہونٹ ایک دوسرے سے الگ کر کے کچھ سوچتی اور کبھی ان ہونٹوں سے وہ الفاظ ادا کرتی جو آواز سے خالی ہوتے اور جو وہ اپنے آپ سے کہہ رہی ہوتی تھی۔ اپنی باریک اور نازک انگلیوں سے وہ اپنے ماتھے پر بار بار آ جانے والے بالوں کو ہر تھوڑے سے وقفے کے بعد اپنے دائیں کان کے پیچھے کر کے جمانے کی کوشش کرتی اور کبھی اپنی دو انگلیوں سے اپنا دایاں رخسار دھیرے سے بجانے لگتی۔ جب وہ انٹرنیٹ پر کسی تحریر کے مطالعے میں کھو

سی جاتی تو اس کا نچلا ہونٹ کسی بھولے سے بچے کی طرح اس کے بالائی ہونٹ سے دامن چھڑا کر الگ ہو جاتا۔ وہ اس کے دو ہونٹوں کے درمیان بنے ہوئے اردو کے حرف 'ڈ' کو دیکھتا اور اس حرف کی بیرونی اور اندرونی ساخت کے رنگ میں مہین سے فرق کو نوٹ کرتا۔ مطالعے کے دوران مشعال کو اپنے جسم کی ہر اُنگلی، ہر چند نازک سی، حرکت کرتے ہوئے جو معمولی سی قوت صرف کرنا پڑتی اس میں وہ اپنا نچلا ہونٹ پھر سے اوپر والے ہونٹ سے جوڑ لیتی۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک لوری کی سی موسیقی تھی۔ وہ کسی ستار بجاتے ہوئے موسیقار کی طرح اپنے آپ میں مگن تھی اور بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن اس کے پیچھے دائیں جانب کو بیٹھے جاوید کے لیے، جسے اپنی نشست سے مشعال کا صرف پروفائل نظر آ رہا تھا، وہ روز اس کی آنکھوں، ہونٹوں اور انگلیوں کے مطالعے سے یادگار نہیں تھا جن کا وہ پہلے بھی کئی بار مطالعہ کر کے ان کی داد دے چکا تھا۔ اس کے چہرے سے نظریں نیچے کرتے ہوئے وہ اُس کی گردن پر اترا تو اس کی نظریں اس گردن کی ناڑ پر ٹھہر گئی تھیں جس نے اس کے مشعل کی طرح فروزاں سر کو سہارا سا دے کر اٹھایا ہوا تھا۔ بائیں جانب ایسی ہی ایک اور ناڑ تھی جو اُس وقت اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ دونوں ناڑیں مل کر ایک نیم مثلث بناتی تھیں جس کے اندر ایک قوس کی سی شکل میں مشعال کا حلق تھا اور جس کی گہرائی میں اس کی رنگت کی سفیدی کچھ اور بھی سفید، نفیس اور نازک ہو جاتی تھی۔ جب مشعال سامنے بیٹھی ہوتی تو وہ ان دو ناڑوں کے درمیان حلق کی حیرت انگیز سفیدی میں کھو سا جاتا اور سوچتا کہ کسی روز وہ اپنی ناک اُس حلق میں گھسا کر اس کی خوشبو بھی دریافت کر سکے گا۔ لیکن اُس روز سے پہلے تک اُس کی توجہ اس بات پر نہیں ہو پائی تھی کہ حلق کے مقام پر اس قوس کی تعمیر میں ناڑ کی جس جوڑی کا ہاتھ ہے وہ خود کتنی دلفریب ہو سکتی ہے۔ اب جب اُس روز وہ مشعال کی گردن کی ناڑ دیکھ رہا تھا تو وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی توجہ پہلے اس بات پر کیوں نہیں گئی تھی کہ مشعال جب بھی دائیں یا بائیں گردن موڑتی تھی تو اس کے حسن و جمال میں نمایاں ترین حصہ اس کی گردن کی ناڑ ہی کا ہوتا تھا۔ سو وہ دن اسی ناڑ کی ستائش کا دن تھا جو اُس کے نازک سے کان کے نیچے سے شروع ہوتی تھی اور جس کی سفید رنگت میں بہت سی مہین شریانیں گلابی رنگ کو وسیع کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ ناڑ اُس روز اس نے پہلی مرتبہ اتنے غور سے اور اتنی دیر تک دیکھی تھی اور سوچا تھا کہ وہ ایک روز اس کی نزاکت اور نفاست کو اپنی انگشت سے ضرور محسوس کرے گا۔

مشعال کی گردن کی ناڑ کی دریافت جیسا تاریخی واقعہ نہ بھی ہوا ہوتا تو بھی اسے وہ روز ہمیشہ کے

لیے یاد رہ جانے والا تھا اور وہ تاریخ بھی، کیونکہ بے نظیر بھٹو اسی روز دبئی سے کراچی ایئرپورٹ اتری تھی اور جاوید اقبال دن بھر استقبالی جلوس کی کوریج کے بعد کچھ ہی دیر پہلے دفتر پہنچا تھا۔ جاوید مشعال کے حسن کے دیگر اجزا کی یکے بعد دیگرے دریافتوں کی تاریخ کا تعین کرنے میں اگر کامیاب نہیں ہو پاتا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے کسی دریافت کے روز کوئی اور تاریخی واقعہ رونما نہیں ہو پایا تھا۔ کچھ دریافتوں کی تاریخ کا تعین البتہ وہ اپنی ڈائری کے کسی اندراج سے کر سکتا تھا۔

بے نظیر کی کراچی ایئرپورٹ آمد سے بہت پہلے سے اس کے استقبال کی لائیو کوریج جاری تھی اس لیے ڈیسک پر کسی نے اسٹوری بھی بنا دی تھی اور اس کے لیے مشعال کو دیکھنے اور اس کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرنے کے علاوہ کوئی خاص کام نہیں رہا تھا۔ مشعال کے ہونٹوں اور رخساروں پر جو لطیف اور پرسکون سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے بھی جاوید کی ستائشی نظروں کا مرکز بنے ہونے کا اندازہ تھا۔ جو ہلچل ٹی وی چینلوں میں نظر آ رہی تھی وہ نیوز روم میں مفقود تھی کیونکہ سب لوگ اپنی توانائی دن بھر کی بھرپور سرگرمی میں ختم کر چکے تھے۔ اُن دنوں ڈی ایس این جی وین کے ذریعے ہر ہر لمحے کی لائیو کوریج نہیں ہوا کرتی تھی اور جلوس کے تازہ ترین مناظر ہر لمحے ہماری ٹی وی اسکرینوں پر نہیں آ رہے ہوتے تھے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے اور تاریخ اگلے ہندسے میں داخل ہو چکی تھی۔ مشعال کی وین بھی آنے والی تھی اور وہ وین آنے سے پہلے یوں ہی کچھ دیر کمپیوٹر پر بیٹھ کر سرفنگ کیا کرتی تھی۔ اس روز وہ مشعال کو دیکھتے ہوئے جو آخری چیز سوچ سکا تھا وہ بھی اسے اچھی طرح یاد تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ جب بالآخر مشعال کی گردن کی ناڑ کی نزاکت اور نفاست کو اپنی شہادت کی انگشت سے چھوئے گا تو کیسا محسوس کر رہا ہو گا۔

ایسے میں شاید اس نے آخری لمحات میں اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں پر حسرت سے ایک نظر کی تھی کہ یکایک اس کا موبائل بج اٹھا تھا اور اس نے بے دلی کے ساتھ اسے اٹھایا تھا۔ یہ ذوالفقار تھا، عوامی اخبار کا رپورٹر۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ استاد بہت زور کی آواز آئی ہے۔ شاید بی بی کے قافلے میں دھماکا ہو گیا ہے۔

2

پہلے دھماکے کے بعد کسی نے جیمر آن کر دیے تھے جس کی وجہ سے قریب موجود کسی بھی رپورٹر

کے موبائل فون پر کال نہیں جا پا رہی تھی۔ ذوالفقار اس وقت بی بی کے قافلے سے کافی دور ایک جگہ چائے پینے بیٹھا تھا جہاں اسے دھماکے کی آواز سنائی دی تھی اور وہ بھاگ کر کچھ دور جانے کے بعد جاوید کو کال ملانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ ابھی وہ بول ہی رہا تھا کہ اس کی آواز کے عقب سے ایک دھمک سنائی دی۔ کچھ دیر کے لیے اس کی آواز ڈوبی رہی جو ابھری تو بس ایک ہی جملہ بار بار دہرا رہی تھی: "دوسرا دھماکا ہو گیا استاد... دوسرا دھماکا ہو گیا... اے دوسرا دھماکا ہو گیا..." جاوید یہ سنتے ہی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا اور لفٹ کا انتظار کرنے کے بجائے چھلانگیں مار کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ اُس کی وین ابھی نیچے ہی کھڑی تھی۔ ڈرائیور اس میں موجود تھا اور کیمرا مین اپنا کیمرا اتار رہا تھا۔ اُس نے چلّا کر ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔ کیمرا مین خود ہی وین میں بیٹھ گیا اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی کارساز کی طرف روانہ ہو گئی۔ کچھ ہی منٹ بعد وہ کارساز کے سامنے کھڑا تھا۔

ہجوم چھٹ چکا تھا لیکن سڑک پر جو منظر اُس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ بیان سے باہر تھا۔ رات کی ٹھنڈک سے خنک سڑک پر ہر طرف آدمی بکھرے ہوئے پڑے تھے اور پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی اپنے چاروں طرف اور کبھی اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے۔ بعض کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں، لیکن لگتا تھا کہ انھیں کوئی بڑا زخم نہیں لگا۔ سڑک کے ایک کنارے پر بے نظیر بھٹو کا ٹرک کھڑا تھا جسے اس جلوس کے لیے خصوصی طور پر تیار کیا گیا تھا اور پاکستان کی کوئی سواری جس سے مشابہ نظر نہیں آتی تھی۔ یہ بیک وقت ٹرک بھی تھا، ٹریلر بھی اور ایک گھر بھی۔ قریب ہی ایک پجیرو کھڑی تھی جس پر کارکنوں نے ہجوم کر رکھا تھا۔ بازوؤں پر جاں نثارانِ بے نظیر کے بیج لگائے یہ کارکن گاڑی پر اتنے مشکل اور ناممکن زاویوں سے کھڑے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے جسموں سے گاڑی کے شیشوں کو چھپا رکھا تھا۔ پجیرو چلنا شروع ہوئی جسے ترشی ہوئی داڑھی والا ایک شخص چلا رہا تھا جو سفید کپڑوں میں ملبوس تھا۔ گاڑی جاوید کے پاس سے گزری تو اُس نے پہچان لیا: وہ ذوالفقار مرزا تھا، پیپلز پارٹی کا ایک لیڈر۔ جب دھماکے کے مقام سے وہاں موجود سب سے بیش قیمت رہنما رخصت ہو گئی تو رہی سہی پولیس بھی وہاں سے غائب ہو گئی اور ہلاک و زخمی ہونے والوں کو اسپتال لے جانے کا کام نجی ایمبولینسوں نے سنبھال لیا۔ جاوید کافی دیر اس سواری کے پاس کھڑا رہا جس میں بے نظیر سوار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سواری نہیں بلکہ کوئی بلا تھی جو یکا یک اپنے ہی اندر سے نکلی اور اپنے اردگرد بیسیوں افراد کو ہلاک اور مجروح کرنے کے

بعد ایک بار پھر سواری کی صورت میں مجسم ہو گئی۔
وہاں کھڑے کھڑے جاوید کو وہ سواری کسی بڑے اور مہیب جانور سے مشابہ لگی۔

3

پجیرو پر کارکن انتہائی ناممکن زاویوں سے سوار تھے اور انھوں نے شیشوں کو اپنے جسموں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس سے لگتا تھا کہ گاڑی میں کوئی اہم ترین شخصیت ہی سوار ہو گی۔ وہ بے نظیر ہی ہو سکتی تھی، چاہے اسے کوئی زد پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ میں نے اپنے دفتر فون کر کے یہی بات اپنے بیپر میں بتا دی۔ بیپر ختم ہو گیا تو مجھے سڑک پر پڑے لوگوں کا خیال آیا۔ ان میں سے کافی کو اٹھایا جا چکا تھا۔ سڑک کے درمیان میں بنے گھاس والے قطعے کے ساتھ ایک شخص لیٹا ہوا تھا جس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ بظاہر اسے کوئی سنگین زخم نہیں لگا تھا۔ میں اس کے پاس گیا تو اس کی سانسیں بہت مشکل سے چل رہی تھیں۔ میں نے چلّا کر اس سے کہا کہ ہمت کرو، تمھیں کوئی چوٹ نہیں آئی۔ یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔ پاس ہی سے دو لڑکے دوڑے ہوئے میری طرف بڑھے اور ایک نے پوچھا کہ مضروب میرا کیا لگتا ہے۔ "کچھ نہیں لگتا یار میرا،" میں نے دکھی لہجے میں کہا اور پھر ان لڑکوں کے ساتھ اسے اٹھا کر ایمبولینس میں ڈال دیا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ بظاہر جسم پر کوئی خاص چوٹ نہ لگنے کے باوجود وہ کسی قریب المرگ بوڑھے کی طرح مریل سی سانسیں کیوں لے رہا ہے۔ پھر دوسرے دھماکوں میں جاں بحق ہونے والوں کا خیال آیا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک علامہ بھی بم دھماکے میں جاں بحق ہوئے تھے لیکن ان کے جسم پر زخم کا کوئی واضح نشان نہیں تھا۔ اسی طرح نشتر پارک دھماکے میں جاں بحق ہونے والے جن افراد کی لاشیں میں نے دیکھی تھیں ان میں سے کچھ کے جسم پر صرف ایک آدھ چھرّے کا نشان تھا اور ان کے جسم سے خون بھی زیادہ نہیں نکلا تھا۔ شاید دھماکے کی دھمک سے دور جا گرنے والوں کی حرکتِ قلب اس سے بری طرح متاثر ہوتی ہو، میں نے سوچا۔

اس کے بعد میں اسی سڑک پر اپنے دوسرے صحافی دوستوں کے ساتھ چلنے پھرنے لگا۔ ہر طرف دکھ اور اداسی کا ماحول تھا۔ میں سڑک سے اتر کر فٹ پاتھ کے ساتھ چلنے لگا۔ ایک درخت کے کنارے مجھے ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ کچھ اور قریب گیا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ گگی بھائی تھے جو

درخت کے تنے سے ٹیک لگائے، اپنی ٹانگیں سیدھی کیے گم صم لیٹے تھے۔ ان کے کھلے ہوئے منہ کے گرد رال جمع تھی اور آنکھیں ٹکر ٹکر سامنے ہی دیکھے جا رہی تھیں۔

"صادق بھائی!" میں نے ان کا اصلی نام پکارا اور پھر ان کے قریب پہنچ کر ان کا نام لے کر انھیں جھنجھوڑنے لگا۔ ٹکی بھائی کی آنکھوں میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اب میرے چہرے پر متوجہ ہو گئیں۔

"کیا ہوا صادق بھائی؟ کہیں چوٹ تو نہیں لگی آپ کو؟" میں نے پوچھا اور پھر خود ہی ان کا جسم ٹٹولنے لگا۔ ان کی پیٹھ پر شلوار گیلی ہو رہی تھی اور وہاں ایک مٹیالا بھورا سا رنگ پھیلا ہوا تھا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خون ہو سکتا ہے۔ میں نے انھیں اٹھانے کی کوشش کی تو ان کے بھاری بھرکم جسم نے تعاون سے انکار کر دیا۔ ایک لڑکا پانی کا گلاس لیے دوڑا دوڑا میری ہی طرف آ رہا تھا۔ میں نے اس سے پانی لے کر ٹکی بھائی کے منہ سے لگایا۔ ان کی رال میرے ہاتھ سے چپک گئی اور میرے اندر غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں نے گلاس لڑکے کو پکڑا دیا جس نے اپنا ایک بازو ان کے سر کے گرد پھیلا کر اسے سیدھا کیا اور دوسرے ہاتھ سے انھیں پانی پلانے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں انھیں سہارا دے کر میرے دفتر کی وین کی طرف لے گئے۔ ان سے داہنی ٹانگ ہلائی بھی نہیں جا رہی تھی مگر اس پر کوئی زخم نہیں تھا۔ ہم نے انھیں وین میں لٹا دیا لیکن تب تک ان کے ہوش و حواس کچھ حد تک درست ہو چکے تھے۔ وہ وین کی ایک نشست سے سر ٹکا کر وین کے فرش پر بیٹھ گئے۔

"صادق بھائی، آپ کو کوئی چوٹ نہیں لگی۔ ہمت کریں صادق بھائی،" میں نے کہا۔

ان کا ہاتھ اپنی پیٹھ کی جانب بڑھا اور واپس آیا تو اس پر خون کی ہلکی سی نمی موجود تھی۔

ایک مرتبہ پھر ان کے لباس کو اوپر نیچے سے دیکھنے کے بعد میں نے مناسب یہ سمجھا کہ انھیں اسپتال کے بجائے ان کے گھر ہی پہنچا دیا جائے، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اسپتال جاں بحق اور شدید زخمی ہونے والے افراد سے بھر چکے ہوں گے اور وہاں ایک معمولی زخمی کی مرہم پٹی کی بھی کسی کو فرصت نہیں ہوگی۔

4

زرینہ بھابھی گھر پر دھماکے کے بارے میں لائیو نشریات دیکھ رہی تھیں جب ہم وہاں پہنچے۔

دروازہ کھلتے ہی انھوں نے ٹکی بھائی کی حالت دیکھی تو پھٹ پڑیں:

"تم کیوں گئے تھے وہاں؟ کیا ضرورت تھی تمھیں؟ مجھے تو بتا کر گئے تھے کہ میں حضرت شاہ ولی کے مزار پر جا رہا ہوں۔ اُدھر کدھر نکل گئے؟" زرینہ بھابھی کی جلتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کا غصہ ان کی تشویش سے بھی زیادہ تھا۔ ٹکی بھائی کو ہم نے بستر پر لٹایا اور زرینہ بھابھی ان کے لیے دودھ گرم کرنے چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد انھوں نے ٹکی بھائی کو دودھ کا گلاس پکڑایا اور مجھ سے بولیں:

"دودھ میں پتی ڈال دی ہے، کچھ دیر میں چائے بن جائے گی۔ تم چائے پی کر جانا۔"

چائے پی کر میں اپنے گھر روانہ ہوا کہ امی کے فون پر فون آ رہے تھے۔ امی ٹنڈو الہ یار میں رہتی ہیں لیکن میں کہاں ہوں، کیا کر رہا ہوں، اس بارے میں دن میں چھتیس دفعہ فون کر کے پوچھتی ہیں۔ گھر پر ارشمیدس بھی اکیلا تھا۔ شاید وہ بھی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ شاید وہ بھوکا بھی ہو۔ آج دوپہر جب میں اسے چھوڑ کر گیا تو وہ کچھ اداس سا تھا۔ سلاد پتے جنھیں وہ بہت رغبت سے کھایا کرتا تھا، انھیں دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ میں اس کے لیے سلاد پتے چھوڑ کر بھی گیا تھا لیکن پتا نہیں اس نے کھائے بھی ہوں گے یا نہیں۔ اتنی دیر تک تو میرے خیالوں سے کبھی باہر نہیں رہا تھا۔ میرا پیارا کچھوا۔

5

جاوید اقبال کا گھر کیا ہے، ایک فلیٹ ہے۔ کراچی کے علاقے گلشن اقبال میں واقع ہے۔ جاوید اقبال کی والدہ سلطانہ بیگم ٹنڈو الہ یار شہر میں رہتی ہیں۔ جاوید اقبال کی اسکولنگ کے دوران وہ کراچی میں رہیں، لیکن اب اپنا وقت ٹنڈو الہ یار اور کراچی میں تقسیم کرتی ہیں۔ ٹنڈو الہ یار میں ان کی تھوڑی سی زمینیں ہیں جن پر ان دنوں گندم کی کٹائی کا موسم ہے اور سلطانہ بیگم اس موقعے پر وہاں موجود رہنا ضروری سمجھتی ہیں۔

جاوید اقبال چھڑے چھانٹ ہیں اور اکیلے ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ البتہ ایک کچھوا ان کے اس اکیلے پن کی ساجھے داری کرتا ہے۔ اور اگر آپ ایسا کہنا مناسب سمجھیں تو ایک فلمی ہیروئن بھی۔

اس سے پہلے کہ جاوید اقبال یہاں آ دھمکے، ہم آپ کو اس فلیٹ میں لیے چلتے ہیں۔ دروازہ کھولتے ہی آپ کا سامنا کرینہ کپور کی ایک بڑی سی تصویر سے ہوتا ہے۔ پینافلیکس پر بنی سات فٹ

کی اس تصویر میں کرینہ کپور پورے قد کے ساتھ کھڑی نظر آتی ہے۔ اس کے ہاتھ اس کی ٹانگوں کے درمیان ایسے بندھے ہیں کہ ان کے دو انگوٹھوں اور دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں کے درمیان ایک ہارٹ کی شکل بن گئی ہے اور اس ہارٹ کے درمیان اس کے شارٹس کا نیلا رنگ گہرا ہو گیا ہے۔ شارٹس کے نیچے اس کی برہنہ ٹانگیں ہیں اور پیروں میں لمبی ہیل والے سینڈل۔ اس کے چہرے پر مستی ہے اور اس کی آنکھیں آپ کو ایسے دیکھ رہی ہیں جیسے وہ کوئی چیلنج کر رہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے قد سے بھی بڑی دکھنے والی لڑکی کا یہ چیلنج آپ کو اپنی مردانگی آزمانے پر اُکسائے۔

سامنے ڈرائنگ روم ہے جس میں جاوید اقبال اپنے دوستوں سے ملاقات کرتا، پڑھتا اور ٹی وی دیکھتا ہے۔ اسی کمرے میں پانچ فٹ کا ایک پنجرہ رکھا ہے جس میں ایک کچھوا ایک ہی آسن میں ایسے خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھا ہے جیسے گیان دھیان میں مصروف ہو۔ عام لوگ جو کچھوا پالتے ہیں وہ اس کے لیے ویسا ہی کوئی واٹر ٹینک خرید لیتے ہیں جن میں مچھلیاں رکھی جاتی ہیں، لیکن جاوید اقبال کو معلوم ہے کہ کچھوا پانی اور خشکی دونوں میں رہتا ہے۔ اس پنجرے کو پنجرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بالائی حصے پر پنجرہ بنا ہوا ہے ورنہ اس کا زیریں حصہ موٹے شیشے سے بنا ہے۔ شیشے کے اندر پانی بھرا ہے جس کی سطح پر دیدہ زیب پتھر ہیں۔ شیشے کی پچھلی دیوار کی طرف ایک بڑا سا پتھر ہے جو پانی کی سطح سے اوپر ابھرا ہوا ہے۔ دو فٹ کا یہ پتھر ہی ہے جس پر اس وقت ہم کچھوے کو بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ چار انچ کے اس کچھوے کے علاوہ اس پتھر پر سلاد پتے بھی رکھے ہیں جنھیں یہ کچھوا فی الحال کھانے کے موڈ میں نہیں۔ پانی کے اندر بھی دو پودے لگے ہوئے ہیں جن کے سر پانی سے باہر نکل رہے ہیں۔ ایک تو شاید سمندری گھاس ہے اور دوسرا ایک فرن ہے۔

اس کے ساتھ کا کمرہ اس کا سونے کا کمرہ ہے۔ درمیان میں پلنگ پڑا ہے اور پلنگ کے سامنے دیوار پر ایک بڑی سی تصویر لگی ہے۔ تصویر میں بارش برس رہی ہے جس میں کرینہ کپور کی ساڑھی کا سرخ پٹی کوٹ اور نیلی چولی بھیگ رہی ہے اور دونوں کے درمیان اس کا کشادہ پیٹ بل کھا رہا ہے۔ ہندوستان کی عام عورتوں کے برعکس اس کا پیٹ کمر پر بس ذرا سا ہی بل کھاتا ہے اور اس کی وافر وسعت میں آوارہ پھر سکنے والی نظروں کو اس کی ناف، سمیٹ کر اپنے بھنور میں لے جاتی ہے۔ دائیں ہاتھ پر ایک تصویر ہے جس میں وہ اجے دیوگن کے سامنے کھڑی ہے، اس کے پیٹ پر ناف سے نیچے ایک چوڑا سا طلائی کمر بند

بندھا ہے اور اجے دیوگن کے ہاتھ اسے چھو رہے ہیں جبکہ وہ شرمایا شاید صرف مسکرا رہی ہے۔ ایک اور تصویر میں وہ ایک پانی کے چشمے میں کھڑی ہے۔ سرمے یا اس سے ملتی جلتی چیز سے اس کی آنکھوں کا دنبالہ بہت لمبا بنایا گیا ہے اور وہ اپنے ہاتھوں سے چشمے کا پانی اچھال رہی ہے۔ بائیں ہاتھ ایک تصویر میں ایک ہیرو غسلخانے کے ٹب میں لیٹا ہے اور کرینہ کپور اس کے سینے پر سوار ہے۔ ٹب میں موجود پانی سے دونوں کے جسم گیلے ہو رہے ہیں اور کرینہ کے گیلے پاجامے سے اس کے کولھے نمایاں ہو رہے ہیں۔ پلنگ کے کنارے رکھی میز پر تقریباً ڈیڑھ فٹ کا ایک تصویری البم ہے۔ یہ البم بھی کرینہ کپور کی تصویروں سے بھرا ہے۔ میز کے نچلے حصے میں سی ڈیز پڑی ہیں جن میں اور فلموں کے ساتھ ساتھ کرینہ کپور کی اب تک کی تمام فلمیں بھی موجود ہیں۔ جی ہاں، ہمارا جاوید اقبال کرینہ کپور کے غائبانہ عشق میں مبتلا ہے اور آس پاس نظر آنے والی عورتوں میں اسی کی شباہت تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ گلشن اقبال کے اس فلیٹ میں اس کے رہنے کی بھی یہی وجہ ہے۔ یہاں سامنے کے فلیٹوں میں اسے ایک ایسی عورت نظر آ گئی ہے جس کا جسم کرینہ سے ملتا جلتا ہے۔ اس عورت کا نام زرینہ ہے۔ جاوید اسے زرینہ بھابھی بلاتا ہے۔

6

لڑکیاں بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ ہر لڑکی مجھے میرے بارے میں ایک نئی چیز بتاتی ہے۔ دوستی تو میری بہت سی لڑکیوں سے رہی ہے لیکن زرینہ بھابھی مجھے بہت متاثر کن لگتی ہیں۔ میں ان کی عزت بھی بہت کرتا ہوں۔ میرے اور ان کے تعلق کے بارے میں محلے کے کچھ فارغ قسم کے لوگ جو بکواس کرتے ہیں اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ زرینہ بھابھی جوان ہیں، خوبصورت ہیں اور گگی بھائی جیسے سیدھے آدمی کی بیوی، لیکن وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتی ہیں اور میں ایسی ویسی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ خوبصورتی کسے اچھی نہیں لگتی؟ مجھے بھی لگتی ہے۔ اس روز جب میں گگی بھائی کو لے کر ان کے گھر پہنچا تو انھیں دوپٹے تک کا ہوش نہیں تھا۔ چائے میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے انھوں نے مجھے بڑی اپنائیت سے دیکھا اور میں ان کی آنکھوں سے جھلکتی شفقت کو اپنا انعام سمجھ کر وہاں سے چلا آیا تھا۔ باقی جتنے منھ اتنی باتیں۔ کوئی کسی کا منھ کہاں تک بند کر سکتا ہے! میرا ان کے گھر آنا جانا ہے تو اس کا گگی بھائی کو بھی علم ہے۔ زرینہ بھابھی اکیلے میں بھلے ہی مجھے میرے نام سے پکارتی ہوں لیکن دوسروں کے

سامنے انھوں نے مجھے ہمیشہ جاوید بھائی ہی کہا۔ مجھ سے میرے منھ پر کچھ کہنے کی تو ہمت نہیں کسی میں، لیکن ان کی آنکھیں دیکھ کر پتا چل جاتا ہے کہ ان کے دماغوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ لیکن مجھے کیا؟ جب تک زرینہ بھابھی مجھ پر اعتبار کرتی ہیں، مجھے کسی اور کی فکر کرنے کی کیا ضرورت؟

7

کچھ عورتوں کو دیکھ کر جاوید اپنی رگوں میں جھاگ بھرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے جیسے اس کے جسم کو کسی غیر مرئی طاقت نے اپنے شکنجے میں کس لیا ہے۔ اگر کوئی مزے دار عورت اس کے قریب ہو تو وہ اپنے تمام تر جسم سے، اپنی تمام تر حسیات سے اس سے کلام کر رہا ہوتا ہے۔ یہ رابطہ بعض اوقات اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی بعض نسیں پھٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ زیادہ تر مرتبہ تو وہ عورت اس کی اس ٹیلی پیتھی کا کوئی اثر قبول نہیں کرتی، لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہی عورت اس سے اِدھر اُدھر کی کوئی بات کرنے پہنچ جاتی ہے۔ ایسے میں جاوید کو کچھ نہیں سوجھتا کہ اس سے کیا بات کرے۔ اِن فیکٹ وہ طے ہی نہیں کر پاتا کہ وہ عورت کی طرف دیکھتا ہی رہے یا اس سے انسانی سطح پر بات کرنا شروع کر دے۔ اِن فیکٹ اسے کئی مرتبہ یہ طے کرنے کا خیال بھی نہیں آتا۔

جاوید کی بہت سی لڑکیوں سے دوستی رہی اور بہت سی عورتیں بھی اس پر مہربان رہیں۔ لیکن ان سے تعلق کے دوران بس گنے چنے ہی مواقع ایسے آئے جب اسے کسی جنسی قسم کے ایڈونچر کا موقع ملا۔ اصل میں جاوید ہر لڑکی یا عورت سے اپنے تعلق کو ایسے اہتمام اور محبت سے ترتیب دیتا تھا جیسے کوئی شاعر کوئی طویل نظم بنا رہا ہو، یا کوئی مصور ایک بڑی سی تصویر پر آہستہ آہستہ کام کر رہا ہو۔ وہ اس تعلق میں بڑی احتیاط سے مصرعے لگاتا اور اسٹروک جماتا۔ اس کی ڈائری میں بہت سی لڑکیوں اور عورتوں کے نام تھے، وہ جن سے تعلق کے مختلف مراحل میں تھا۔ ان کی باتیں، ان کی ادائیں، ان سے تعلق کے دوران اس کے محسوسات، سب اس میں لکھے تھے۔ وہ دن کے مختلف اوقات میں یہ تمام تفاصیل چیک کرتا اور پھر مختلف لڑکیوں کے بارے میں اگلی منصوبہ بندی کرتا تھا۔ اگر اسے جنسی ایڈونچر کے مواقع کم ملے تھے تو اس میں اس کا اپنا طرزِ عمل بھی بڑی حد تک ذمہ دار تھا کیونکہ وہ اس معاملے میں جلد بازی کا قائل بالکل بھی نہیں تھا۔ عورتیں بھی اسے بھلا مانس سمجھتیں، اور وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ اس سے

اپنی باتیں شیئر کرتیں، اور کئی ایسے معاملات میں اس سے مشورہ کرتیں جن میں انھوں نے کبھی کسی دوسری عورت کو بھی اعتماد میں نہیں لیا ہوتا تھا۔ جاوید کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ کسی لڑکی نے اسے بھائی بنایا ہے یا الّو۔ وہ تو بس ان کی خوشبو کے حصار میں رہنا پسند کرتا تھا، اور یہ خوشبو اب اس کی ہر وقت مسکراتی، اور کبھی کبھار کھوئی کھوئی رہنے والی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ کسی بھی عورت کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے، اور ان میں سے زیادہ تر کی راز کی باتیں اس کے سینے میں محفوظ رہتی تھیں۔ اس کے سینے میں اور اس کی ڈائریوں میں۔

اپنے اردگرد موجود لڑکیوں اور عورتوں سے خوشبو کے اس نشے کی طلب پوری نہیں ہوتی تھی، جسے اپنے ہر ہر مسام میں محسوس کرنے کی اسے ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ یہ کمی وہ فلمی اداکاراؤں سے پوری کرتا تھا۔ وہ انگریزی فلمیں بھی دیکھتا تھا اور انگریز اداکارائیں بھی اسے پسند تھیں، لیکن یہ ہندی فلموں کی اداکارائیں تھیں جو اس کے دل کا قرار لوٹ کر لے جایا کرتی تھیں۔ کچھ دکھاتی، کچھ چھپاتی ہوئی بالی وُڈ کی اداکارائیں اس کا خاص ہدف تھیں۔ وہ مختلف فلموں سے ان کے جسم کے مختلف حصے جمع کرتا اور اپنے ذہن میں ان کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر تصویر مکمل کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ کسی کا ہنستا مسکراتا چہرہ اسے بھاتا، کسی کے گالوں پر پڑا ہوا ڈمپل۔ کسی کا رقص، کسی کے پیٹ کے مرکزے میں کبھی اُتھلی کبھی گہری ناف اور کسی کے سینے کے نشیب و فراز۔ کسی کے چہرے کے تاثرات اور کسی کی ہاتھ یا کولھے مٹکانے کی ادا۔ وہ کئی برسوں سے اپنے ذہن میں ایک آدرش تصویر بنانے کی کوشش کر رہا تھا جس میں کبھی کسی اداکارہ کے جسم پر کسی اور کا چہرہ لگ جاتا، اور کبھی کسی اداکارہ کی بکنی کوئی اور اداکارہ پہنے ہوئے اس کے خیالوں میں جلوہ افروز ہو جاتی۔

وہ حتمی جنسی عمل سے پیشتر کے مراحل میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا، حتمی جنسی عمل کے مواقع کی عدم دستیابی کے سبب تھا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ عورتوں سے لذت اندوزی کی کیفیت کا اختتام بھی عام نوجوانوں کی طرح نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا طریقہ یہ تھا کہ رگوں کو انتہائی حد تک جوش دلا کر ان کا تناؤ خود ہی ختم ہونے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اپنے اس کھیل میں وہ کچھوے کو بھی شامل کر لیتا، اور اسے حسن کے اس جشن میں شریک کرتا۔ اس کی رگوں میں بھری ہوئی جھاگ آگ بن جاتی اور وہ اپنے بازوؤں کی مچھلیوں میں کسی کو بھینچ لینے کی طاقت محسوس کرنے لگتا۔ ایسے میں اس کا جی چاہتا کہ

کچھوے کی گردن مروڑ کر رکھ دے، لیکن زیادہ تر مرتبہ وہ خود کو سمجھا بجھا کر اس کام سے باز رکھ لیتا تھا۔

اس نے بار ہا اس بات پر غور کیا تھا کہ اسے نسوانی جسم کی بعض ادائیں، بعض حصے اور بعض آسن دوسری اداؤں، حصوں اور آسنوں سے زیادہ کیوں پسند ہیں۔ اس نے طے کیا تھا کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں اس کی عقل اس کی رہنما نہیں، بلکہ وہ سراسر اپنی جبلت کے کہے پر چل رہا ہے۔ یہ طے کرنے کے بعد اسے اپنی نسوانی دلچسپیوں میں ایک ایسی پاکیزگی سی محسوس ہونے لگی جو کوئی رشی مُنی یا صوفی صافی اپنے گیان دھیان یا عبادت وریاضت میں محسوس کر سکتا ہوگا۔

جب وہ لڑکا تھا تو عورتوں کا سینہ اس کے سینے میں تلاطم پیدا کر دیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ ان کی آنکھوں کا اسیر ہونے لگا تھا۔ ہر عورت اپنی آنکھوں سے اسے اپنی اندر کی، بہت اندر کی کہانیاں سناتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ عورتیں اپنے جسم کے ساتھ بہت ایٹ ایز ہوتی ہیں۔ کپڑے اتارنے کے بعد انھیں اپنا جسم ویسا اجنبی نہیں لگتا جیسے عموماً کسی مرد کو لگتا ہے۔ چہرہ الگ اور باقی جسم اس سے بالکل الگ۔ اسے لگتا کہ عورتوں کی آنکھیں ان کے سب راز جانتی ہیں۔ یہ آنکھیں اس سب کو دیکھ کر آئی ہوئی ہیں جنھیں دیکھنے کی خود اس کو تمنا ہے۔ ان آنکھوں میں سرخی کے ہلکے ہلکے ڈورے یا ان کے ارد گرد یا نیچے پڑنے والی لکیریں اسے بہت سے قصے سناتیں اور وہ ان قصوں میں کھویا کھویا رہتا۔ آنکھیں اور پھر چہرے کے تاثرات۔ وہ ان کے چہرے کے ہلکے سے ہلکے تاثرات میں بھی کہانیاں تلاش کرنے لگتا تھا اور ایسے میں اسے یہ دھیان بھی نہیں رہتا تھا کہ وہ اپنے ہونٹوں سے بھی کوئی کہانی سنا رہی ہو سکتی ہیں۔

جب وہ لڑکا تھا تو لڑکیاں اسے دبلی پتلی پسند تھیں۔ لیکن اب اسے عام عورتیں پسند آنے لگی تھیں۔ دبلی پتلی لڑکیوں میں اسے ایک تصنع کا احساس ہوتا، لیکن عام لڑکیاں اپنے ساتھ اپنی اپنی طرز کے جسم لگائے اس کی دلچسپی کا محور بن جاتی تھیں۔ چوڑی کمر، اس کے سامنے چوڑا پیٹ، فربہ نہیں، چوڑا، اور اس کو توازن دیتی ہوئی اور کمر کی چوڑائی کے نیچے پھیلی چوڑی پیٹھ اس کے ہوش و حواس میں تلاطم برپا کر دیتی تھی۔ ان آنکھوں، ان آنکھوں کی لکیروں، اس چوڑے پیٹ اور پیٹھ کی تلاش میں اس نے بہت سی عورتوں کو چھان مارا تھا۔

کرینا ایسے ہی اس کی فیورٹ نہیں تھی۔

8

جاوید اقبال

نو نومبر، دو ہزار سات

لیکن مشعال کی بات ذرا مختلف ہے۔ لڑکیاں تو اور بھی بہت سی ہیں جن میں کچھ مجھے خوبصورت بھی لگتی ہیں، لیکن مشعال کچھ ڈفرنٹ ہے۔ کافی میچور لگتی ہے مجھے، بلکہ کچھ بولڈ بھی۔ جب اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے تو ایک عجیب سی فل فلمنٹ کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا احساس باقی لڑکیوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ وہ خوبصورت ہے مگر بعض لڑکیوں کو دیکھ کر جیسی وحشت سی سر پر سوار ہو جاتی ہے کہ ان کے ساتھ کچھ کیا جائے، تو مشعال کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بہت گریس فل ہے۔ خوبصورت بھی کافی ہے۔ اس کی انگلیاں، اس کا جسم، اس کا چہرہ بہت نازک سا ہے لیکن کولھے بھرے بھرے، جن پر جینز اسے بہت اچھی لگتی ہے۔ ویسے جینز پر وہ کُرتا پہنتی ہے اور دوپٹہ اس نے گردن سے لٹکا کر پیچھے کی طرف پھینکا ہوا ہوتا ہے۔ چوڑی دار پاجامہ بھی پہنتی ہے جس میں اس کی لمبی لمبی ٹانگیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ قد عام لڑکیوں سے کچھ لمبا ہے اور وہ چلتے ہوئے تھوڑا جھولتی رہتی ہے۔ نازک جو ہوئی۔ اتنے نازک سے ناک نقشے پر اس کا غرور سے بھرا ہوا سر کچھ عجیب سا لگتا ہے اور اوپر سے وہ کچھ بوائے اِش سا بننے کی کوشش کرتی ہے۔ عجیب سی لگتی ہے مگر ہے بہت پیاری۔ چہرہ چوڑا ہے لیکن گالوں کی ہڈیاں کچھ ابھری ہوئی ہیں اور جی چاہتا ہے ان پر ہلکے ہلکے مکے لگائے جائیں۔ اور میں نے لگائے بھی تو تھے ایک دن۔ کوئی کام دے دو تو بے وقوفوں کی طرح جُتی رہے گی۔ ٹیکنیکل والے ہنستے بھی ہیں اس پر، مگر اسے پتا نہیں چلتا۔ وہ سمجھ رہی ہوتی ہے کہ پتا نہیں کون سا بڑا کام کر رہی ہے۔ تھوڑی سی بے وقوف ہے مگر ہے ذہین۔ بے وقوف اور ذہین۔ ہے نا عجیب بات؟ بٹ آئی لائک ہر۔ ہے بہت پیاری۔ بعد میں اس کے جسم پر چربی چڑھ بھی گئی تو کتنی چڑھے گی؟ اس کے لمبے قد پر اچھی طرح تقسیم ہو جائے گی۔ بلکہ وہ شاید اور بھی مزے دار ہو جائے۔ کبھی اس کے ساتھ چلوں تو مجھ سے بھی لمبی لگتی ہے۔ ویسے ہے نہیں۔ اس کے ساتھ چلنے میں مزہ بڑا آتا ہے۔ میں نے ایک دن پوچھا بھی تھا کہ میرے ساتھ چلنا تمھیں کیسا لگتا ہے۔ کوئی نہیں، کچھ خاص فیل نہیں ہوتا، اس نے نخرے سے کہا تھا۔ مگر آنکھیں ملا کر تھوڑی کہا تھا۔ پھینکتی ہے سالی! باہر کوئی کام ہو تو مجھی کو تو کہتی ہے۔ ٹرسٹ بھی تو مجھی پر کرتی ہے۔

دوسرے لڑکے اس سے جو فلرٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے بارے میں بھی صاف صاف بتا دیتی ہے۔ بس مکھ ہے مگر لوگ جانتے ہیں کہ اس کے ساتھ بہت زیادہ لبرٹی نہیں لی جا سکتی۔ میں نے اس کے ساتھ دوستی کے شروع کے دنوں میں جب اس کے بارے میں ایک فرینک سا فقرہ کہا تھا تو وہ حیران تو ہوئی تھی لیکن اس نے مائنڈ نہیں کیا تھا۔ البتہ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ مجھ سے کہا تھا کہ ایک کولیگ کے بارے میں اس طرح کے ریمارکس سیکسسٹ ہوتے ہیں اور پیٹرونائزنگ ایٹی چیوڈ کی ذیل میں آتے ہیں۔ میں بھی بڑے مزے سے اس کی بات سن رہا تھا لیکن چونکہ وہ خوشگوار موڈ میں یہ سب کہہ رہی تھی اس لیے مجھے معلوم تھا کہ مجھے سوری کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھی لڑکی ہے ویسے۔

I think we'll make a good pair.

میرا خیال ہے اب مجھے مشعال سے کام کی بات کر لینی چاہیے۔ لیکن اس کے لیے ایک اچھی پلاننگ کرنی پڑے گی۔ اس پلاننگ کے لیے ضروری ہے کہ میرے ذہن میں ایسے ویسے خیالات نہ آئیں اور میں سیدھا اپنے ٹارگٹ کی جانب بڑھ سکوں۔ ذہن کو بیلنس کرنے کے لیے مجھے باقی سرگرمیاں جاری رکھنا ہوں گی۔ تو طے یہ ہوا کہ باقی سرگرمیاں جاری۔ اور ساتھ میں مشعال کو حاصل کرنے کی تیاری۔

9

صادق بھائی اور زرینہ گلشن اقبال میں اس کے سامنے والے فلیٹ میں رہتے تھے۔ زرینہ کو دیکھ کر اس کے دل میں کئی بار خواہش پیدا ہوئی کہ اس سے رابطے کا کوئی طریقہ نکالا جائے۔ اردگرد سے تھوڑی بہت معلومات حاصل کرنے سے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ صادق بھائی اور ان کے دو بھائیوں کی گلشن اقبال میں ایک مشہور مٹھائی کی دکان ہے۔ دکان پر بھی صادق بھائی کھوئے کھوئے نظر آتے اور زیادہ کام ان کے بھائی یا دوسرے لڑکے ہی کرتے تھے۔ نام تو ان کا صادق تھا لیکن سب انھیں گگی گگی کہتے تھے۔ ہاں زرینہ بھابھی انھیں صادق بلایا کرتی تھیں لیکن وہ بھی تخلیے میں انھیں گگی ہی کہتی تھیں۔

صادق بھائی عرف گگی بھائی جہاں بیٹھے ہوتے، انھیں دیکھ کر لگتا کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ لیکن اکثر جب بات کرنے کے لیے منہ کھولتے، کوئی چٹیاپے ہی کی بات کرتے۔ اگر وہ دوستوں

کی کسی ایسی محفل میں بیٹھے ہوتے جہاں دوست گپ شپ کر رہے ہوتے، تو وہ ان کے درمیان بہت دیر تک خاموش رہ سکتے تھے۔ پھر اچانک وہ کوئی ایسی بات کر دیتے جس کا موضوع بحث معاملے سے دور کا بھی تعلق نہ ہوتا، اور سب کھلکھلا کر ہنس دیتے۔ عام لوگوں کو پتا نہیں چلتا تھا کہ ان کی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آنے والی خاموشی کے پیچھے کیا تھا۔ لیکن آپ سے کیا چھپانا۔ اس سوچتی ہوئی خاموشی کے پیچھے دو چیزیں تھیں: مزاروں اور اولیاء اللہ کی یادیں اور بھنگ۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور بھی چیز تھی جس کے بارے میں وہ دن کا اکثر حصہ سوچتے ہوئے گزارتے تھے۔ وہ چیز تھی صادق بھائی کے خواب۔

10

جاوید ایک مرتبہ دکان پر جا کر صادق بھائی سے تعارف کی ابتدائی کوشش کر چکا تھا اور اس نے انھیں بتایا تھا کہ وہ ان کے سامنے والے فلیٹ میں رہتا ہے۔ لیکن صادق بھائی نے اس سلسلے میں گرمجوشی نہیں دکھائی تھی۔ اسے اپنا منصوبہ خاک میں ملتا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن صادق بھائی کا پیچھا کرنے سے اسے ان سے میل جول بڑھانے کا ایک اور راستہ دکھائی دے گیا۔

صادق بھائی اکثر صبح سویرے گھر سے نکل کر کسی مزار کا رخ کرتے اور وہاں تا دیر بیٹھے رہتے۔ اس سلسلے میں کراچی کے کئی مزار ان کی توجہ کا مرکز تھے۔ ان میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے علاوہ جاوید اقبال نے انھیں جامع کلاتھ پر بابا عالم شاہ بخاری کے مزار اور کارساز کے قریب پیر بخاری کے مزار پر جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ بعد میں زرینہ نے اسے بتایا تھا کہ صادق بھائی کو منگھو پیر میں حضرت سخی سلطان منگھو پیر کا مزار بھی بہت پسند ہے اور وہ اس کے علاوہ بلوچستان میں جئے شاہ نورانی اور لاہوت لامکان کے مزاروں پر بھی جاتے رہتے ہیں۔ ایک صبح، صادق بھائی اپنی موٹر سائیکل پر گھر سے نکلے تو جاوید اقبال بھی اپنی کار میں ان کے پیچھے گیا۔ ایم اے جناح روڈ پر چلتے ہوئے جاوید کا خیال تھا کہ صادق بھائی آج پھر جامع کلاتھ مارکیٹ کے سامنے بابا عالم شاہ بخاری کے مزار پر جا رہے ہیں۔ لیکن وہ تبت سینٹر سے ریگل کی طرف مڑ گئے۔ پھر پریڈی تھانے پر انھوں نے دائیں ٹرن لی اور اپنی موٹر سائیکل سمیت اندر کی گلیوں میں گم ہو گئے۔ صبح کا وقت تھا اور اندر کی گلیوں میں ٹریفک بھی کم تھا، اس لیے جاوید اقبال کو ان کی موٹر سائیکل جلد ہی ایک جگہ کھڑی نظر آ گئی۔ انھوں نے اس عمارت کے

دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں لکھا تھا: 'مائی کا تازیہ'۔ ظاہر ہے لفظ 'تعزیہ' کے غلط ہجے لکھے گئے تھے۔ اندر صادق بھائی سر پر رومال باندھے بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی پیٹھ دروازے کی جانب تھی۔ اتنا معلوم کر کے جاوید اقبال اس روز وہاں سے واپس چلا آیا۔

'مائی کا تعزیہ' ایک عجیب جگہ تھی۔ دروازے پر 'تعزیہ' کا املا بھی 'تازیہ' لکھا تھا۔ یہاں سے دس محرم کو ایک مائی اپنا تعزیہ نکالتی ہے۔ لیکن اس پر ہری پگڑی والوں نے اپنے ہرے جھنڈے بھی لگا رکھے تھے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ یہ جگہ اصل میں ایک مندر تھی اور اس کے بیچوں بیچ شو جی کا لنگم بھی دھرا تھا۔ جاوید اقبال کو یہ سب معلوم کر کے اور بھی حیرت ہوئی اور اس نے اس عجیب جگہ سے متعلق ایک ٹی وی رپورٹ بنانے کا فیصلہ کیا۔

مائی کا تعزیہ میں جو مائی نظر آتی تھی، جاوید نے اس سے بات کی تو مائی نے اسے اس جگہ کے بارے میں مزید معلومات بھی دیں۔ کچھ روز بعد صادق بھائی کی موٹر سائیکل کا رخ 'مائی کا تعزیہ' کی جانب ہوا تو اُن کا پیچھا کرتے ہوئے جاوید اقبال نے بھی کچھ دیر بعد اپنی گاڑی اس کے باہر پارک کی اور 'اتفاقاً' اندر چلا آیا۔

"ارے صادق بھائی، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"میں تو یہاں اکثر آتا ہوں۔ مگر آپ یہاں کیسے؟"

"وہ میں اپنے ٹی وی چینل کے لیے ایک رپورٹ بنا رہا ہوں اس جگہ پر۔ بڑی عجیب جگہ ہے یہ۔ وہ بھی شہر کے بیچوں بیچ۔ کوئی اور بتاتا تو میں یقین ہی نہ کرتا۔"

اتنے میں مائی بھی آ گئی۔ قریب ہی چولھے پر چائے پک رہی تھی۔ تینوں باتیں کرنے لگے اور مائی کو خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ جاوید نے شد و مد کے ساتھ صادق بھائی کو بتایا کہ اسے مزاروں اور روحانیت سے کتنی دلچسپی ہے۔ اس مرتبہ صادق بھائی کی آنکھوں سے امڈتی نرمی سے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔

وہ صادق بھائی کے ساتھ باہر نکلا تو اس کی ملاقات ایک جاننے والے سے ہو گئی۔ اس نے اس کی نظروں سے بچ نکلنے کی کوشش کی لیکن جاننے والے نے اسے پہچان لیا۔

"یار جاوید، تم ادھر کدھر؟"

"بس یار، یہ جگہ عجیب سی لگی اس لیے اندر چلا آیا۔"

"اور یہ صاحب آپ کے ساتھ آئے ہیں؟"

"نہیں۔ ان سے بھی یہاں اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔" جاوید اس اتفاق کو کوس رہا تھا جب اس جاننے والے کی نظر اس پر پڑ گئی تھی۔

"اچھا؟"، جاننے والے نے مسکرا کر اس پر نظریں گاڑ دیں۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔"

"اپنے دوست سے میرا تعارف نہیں کراؤ گے؟" جاننے والے نے مسکرا کر اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"یہ صادق بھائی ہیں۔ اور صادق بھائی یہ میرے دوست ہیں، کاشف۔ ہم نے ایک چینل میں اکٹھے کام کیا ہے۔"

11

اس کچھوے کے ملنے کی داستان بھی کچھ عجیب ہے۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں اکبر مارکیٹ میں لگنے والے موٹر سائیکلوں کے بازار کو دیکھنے گیا تو وہاں مجھے ایک پرانا سا مندر نظر آیا جس کے باہر والے دروازے پر لکھا ہوا تھا: 'مائی کا تازیہ'۔ تعزیے کے اسپیلنگ بھی غلط تھے اور عین کی جگہ الف لکھا ہوا تھا۔ خیر، اس روز تو مجھے موٹر سائیکلوں کی خریداری کے بارے میں ایک رپورٹ بنانی تھی مگر بعد میں ایک روز اتوار کو صبح کے وقت میں وہاں گیا۔ بڑی عجیب سی جگہ تھی۔ اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ شو کا مندر ہے۔ ایک مائی سی تھی جو اس مندر کی نگران تھی۔ اندرونی کمرے کے درمیان میں ایک پتھر زمین میں گڑا تھا جس پر کسی نے دودھ پھینکا ہوا تھا۔ کمرے میں کچھ اور مورتیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور مائی مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں نے اسے اپنے چینل کا کارڈ دکھایا اور کہا کہ میں اس مندر پر رپورٹ بنانا چاہتا ہوں۔ بعد میں پتا چلا کہ ہمارے سامنے والے صادق عرف ککی بھائی بھی اکثر وہاں حاضری کے لیے جاتے رہتے ہیں۔ کمرے کے باہر ایک چارپائی بچھی تھی، اس نے مجھے اس پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی ایک چولھے پر اس نے چائے بننے کو رکھی تھی۔ میں نے

مائی سے پوچھا کہ مندر کے باہر 'مائی کا تازیہ' کیوں لکھا ہے، تو اس نے بتایا کہ دس محرم کو اس مندر سے محرم کا تعزیہ نکلتا ہے۔ مندر میں ہرے جھنڈے بھی لگے ہوئے تھے جو بریلوی حضرات لگاتے ہیں۔ یعنی مندر میں ہندو، سنی، شیعہ سب کی نشانیاں موجود تھیں۔ چولھے کے پاس فرش اکھڑا ہوا اور گیلا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہاں ایک چھوٹا سا کچھوا بھی رینگ رہا ہے۔ یہ بات مجھے بہت حیرت انگیز لگی۔ مائی نے مجھے بتایا کہ وہ شو کا بھگت ہے۔ اس نے یہ بات مجھے کچھ ایسے یقین سے بتائی کہ میں مسکرا دیا۔ مجھے وہ بہت پیارا لگا۔ میں اس کے قریب گیا تو وہ مجھ سے بالکل بھی خائف نہیں ہوا۔ میں کچھ دیر اس کی معصوم حرکات کو دیکھتا رہا۔ مندر پر رپورٹ بنانے کے لیے مجھے مزید دو مرتبہ وہاں آنا پڑا۔ میں کچھوے کے لیے سلاد پتے بھی لے آتا تھا اور کچھوا میرے ہاتھ پر چڑھ کر انھیں کھاتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ میں نے مائی سے پوچھا کہ کیا میں اسے خرید سکتا ہوں۔ مائی نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد وہ کچھوا مجھے فروخت کر دیا۔ میں نے اس کے لیے ایک خاص ٹینک نما پنجرہ خریدا جس کے آدھے حصے میں پانی ہوتا ہے اور باقی آدھا خالی۔ وہ پانی کی سطح پر جیسے فلوٹ کرتا تھا اسے دیکھ کر مجھے ارشمیدس کا نام یاد آیا جو ایسے ہی پانی سے بھرے ٹب میں تھا کہ ایک سائنسی دریافت پر یوریکا یوریکا کا نعرہ لگاتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ میں نے اس کچھوے کا نام بھی ارشمیدس رکھ دیا۔

12

چار اپریل، دو ہزار سات

وہ بالکنی میں آئی اور تار سے لٹکتے ہوئے تولیے سے اپنے ہاتھ پونچھے۔ بالکنی پر لگی ہوئی لوہے کی رم اور تار سے لٹکے ہوئے تولیے کے درمیان آٹھ انچ کا ایک خلا تھا اور بالکنی اور بالکنی کے پیچھے کا کمرہ اس خلا میں سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اپنا منھ تولیے کے پیچھے ہی رکھتے ہوئے اس نے خود کو ایسے زاویے پر جھکایا کہ اس کی گردن اور سینے کے درمیان کا حصہ اس آٹھ انچ کے خلا میں سے نمایاں ہونے لگا۔ یوں اس نے مجھے یہ مہلت دی کہ وہ اپنے جسم کا ایک دلآویز منظر مجھے یک ایسے طریقے سے دکھا سکے جب ہم دونوں کی آنکھیں ملنے اور ہم میں سے کسی ایک کے جھجکنے یا شرمندہ ہو سکنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے فلیٹ کی پہلی کھڑکی سے دیکھا۔ فلیٹ کے تین کمرے تھے اور تینوں کی کھڑکیاں کھلی

ہوئی تھیں۔ وہ دوسرے کمرے کی الماری کے قریب گئی اور اسے کھول کر کچھ دیر اپنے لیے کسی مناسب لباس کا جائزہ لیتی رہی۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا تو اسے اس کے ہاتھ میں ایک شلوار نظر آئی۔ اس نے اسے خود سے مخالف سمت جاتے ہوئے دیکھا اور پھر وہ چارپائی پر ایسے بیٹھ گئی کہ اس کی پیٹھ میری طرف تھی اور چہرہ مخالف سمت میں۔ پھر وہ کھڑی ہوئی اور اپنی شلوار ٹانگوں کی جانب سرکاتے ہی پھر سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے بیٹھ کر ہی اپنی شلوار کے پائینچے ٹخنوں سے نکالے اور اسے ایک طرف رکھ کر دوسری شلوار پہننے لگی۔ اب تک میری دیدہ ور نگاہیں اس کے جسم کے زیریں حصے کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکی تھیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ اب اس کا موقع آیا ہی چاہتا ہے۔ شلوار کو اپنی پیٹھ سے اوپر لے جانے کے لیے اس کا کھڑا ہو جانا ضروری تھا اور اب اس کا وقت آ گیا تھا۔ وہ کھڑی ہوئی تو اس کے دائیں جانب اس کی موٹی ران کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی شلوار کو اوپر کو کھینچا اور قمیض کے نیچے ہی نیچے سے اسے اوپر لے گئی۔ میرے جسم میں اشتعال کی ایک لہر دوڑ گئی اور میں نے اپنے دانت بھینچ کر اسے ایک گالی دی جسے صرف میرے ہی کان سن سکے۔ میرا خیال ہے مجھے اس کا نام درج نہیں کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اس کے نام کی جگہ صرف 'ز' لکھ دینا چاہیے۔

13

صادق عرف گگی بھائی کے خواب

صادق بھائی کو عجیب و غریب خواب آتے تھے جن کے بارے میں وہ دن بھر سوچتے رہتے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ خوف بلیوں سے آتا تھا جن سے وہ دن بھر تو کسی نہ کسی طریقے سے محفوظ رہ لیتے تھے لیکن وہ رات کی تاریکی میں ان کے خوابوں میں انھیں تنگ کیا کرتی تھیں۔ بلیاں ان کے خوابوں میں اس قدر آزادی سے گھومتی پھرتی تھیں کہ جب جاوید ان کا دوست بنا تو انھوں نے مناسب سمجھا کہ ان بلیوں کے سلسلے میں جاوید کو بھی اعتماد میں لے لیا جائے۔ ان میں سے ایک خواب کی یاد انھیں دن میں بھی ڈرائے رکھتی۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ وہ الف ننگے ہیں اور ان کے بازوؤں اور ٹانگوں کو ایک ستون کے ساتھ رسے سے جکڑ دیا گیا ہے۔ ان کے اردگرد بلیاں ہیں جو ہوا میں ایسے چلتی ہیں جیسے فرش پر چل رہی ہوں اور جو اپنے باریک دانتوں سے، بہت ہی مہین ٹکڑوں میں، ان کے عضو کو

چونڈ چونڈ کر کھا رہی ہیں۔

اس خواب کی مختلف ویری ایشنز انھوں نے کئی اور خوابوں میں بھی دیکھیں۔ ان ویری ایشنز میں کبھی ان کے ہاتھ ستون کے بجائے لکڑی کے کسی تختے سے بندھے ہوتے، کبھی پلنگ کے پائے سے۔ بلیوں کی شکل کبھی مچھلی سے مشابہ ہو جاتی، کبھی کسی اور جانور سے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ تھیں بلیاں ہی۔ وہ اس خواب کا مطلب تو سمجھ نہیں پائے تھے، لیکن اس کے بعد سے ان کی جنسی کارکردگی میں واضح فرق آ گیا تھا، جو پہلے بھی کچھ زیادہ شاندار نہیں تھی۔

14

جاوید اقبال کی دیدہ وری کے بارے میں کچھ خیالات:

ٹریجکٹری اور پرسپیکٹو

جاوید اقبال کی دیدہ وری کی اس واردات میں دن کے ایک خاص وقت، اس وقت کے دوران سستی اور کاہلی کی ایک مخصوص صورتِ حال، روشنی کی مقدار اور اس زاویے کا بڑا ہاتھ تھا جس سے وہ زرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ ان سبھی نے مل کر جاوید پر وہ جادو کیا جس کے نتیجے میں اس نے خود کو اپنے آپ ہی سے ایک ایسا عہد کرتے ہوئے پایا جس کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ یہ تو اسے پورا کرنا ہی ہوگا۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ جاوید اقبال کی کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے دن کے اس سست گام وقت، روشنی کی مقدار اور ایک خاص زاویے کی تفصیلی وضاحت کر دی جائے۔

ان راویوں کی بڑی ہمت تھی جو ریالٹی یا حقیقت کو بس ایک زاویۂ نگاہ اور ایک ہی شخصیت کے نقطۂ نظر سے بیان کر کے مطمئن ہو جاتے تھے۔ میں تو ریالٹی کے بیان کو ایک پیچیدہ مخمصے کی صورت پاتا ہوں۔ ایک حقیقت کو اس کے محلِ وقوع میں موجود بہت سے کردار الگ الگ انداز سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ حقیقت انھی کے ملٹی ڈائمنشنل بیانیوں سے خلق ہوتی ہے۔ ہر کردار کی اپنی ایک الگ ٹریجکٹری ہوتی ہے جہاں سے وہ حقیقت کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ پھر بیانیہ بھی کئی طرح کا ہو سکتا ہے۔ بیانیے کی مختلف تکنیکیں حقیقت کو بڑے مختلف اور متنوع انداز میں خلق کر سکتی ہیں اور حقیقت کے بیان میں کسی ایک تکنیک پر قانع رہ جانے سے ہمیں حقیقت کے صرف کچھ ہی رخ اور پرتیں دکھائی دے سکتے ہیں۔

کردار اور بیانیے سے متعلق ان دو مخمصوں پر ادبی تنقید میں بہت بات ہو چکی ہے لیکن اب سینماٹوگرافی ایک تیسرا مخمصہ بھی سامنے لے آئی ہے۔ راوی کو درپیش سینماٹوگرافک مخمصے کے یوں تو کئی پہلو ہیں مگر ابھی صرف دو پہلوؤں کو لے لیتے ہیں۔ ایک پہلو ہے زاویۂ نگاہ کا۔ یعنی کوئی کردار حقیقت کو کس اینگل سے دیکھ رہا ہے اور اسے دیکھنے کے دوران اس کا فریم کہاں ہے، یعنی وہ کہاں کھڑا ہے۔ اور دوسرا پہلو ہے روشنی کا تبدیل ہوتا ہوا تناسب۔

جاوید اقبال کے زرینہ پر عاشق ہونے کے ضمن میں مجھے پہلے دو مخمصوں کے ساتھ ساتھ ایک تیسرے مخمصے کا بھی سامنا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس عاشقی کو سمجھنے کے لیے آپ کا یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ جاوید اقبال زرینہ کو روز ایک خاص زاویے سے ایک خاص فاصلے پر بالکل آمنے سامنے دیکھتا تھا۔ زرینہ خود در حقیقت کتنی خوبصورت تھی، یا کسی اور زاویے پر لگے کیمرے سے کیسی لگ سکتی تھی، اس کا جاوید کی عاشقی سے بنیادی تعلق نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اس عاشقی کی ابتدا سے تو بالکل نہیں۔ صبح نو سے دس بجے کے درمیان جب بچے اسکول اور مرد دفتر جا چکے ہوتے اور کراچی کے علاقے گلشن اقبال کے اس محلے میں اندر کی گلیوں میں شور تھم چکا ہوتا، تب زندگی بہت سست گام سی لگتی تھی۔ ایسے میں گرمیوں کے سورج کی وافر روشنی میں زرینہ اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول کر بڑی الکساہٹ سے کام کاج کرتی تھی۔ یہ وہ وقت ہوتا تھا جب زرینہ جاوید اقبال کے سامنے اپنی بہت ہی اوریجنل شخصیت میں ہوتی تھی۔ جاوید کے زرینہ کو دیکھنے کی ٹریجکٹری کے ساتھ ساتھ اس کی دیدہ وری کا مقصد نوٹ کرنا بھی بہت ضروری ہے، کیونکہ زرینہ کو دیکھنے سے ابتدائی طور پر اس کا مطلب بہت ہی مردانہ قسم کی لذت اندوزی تھی۔ جاوید جس زاویے اور نقطۂ نظر سے زرینہ کو دیکھتا تھا اور جس زاویے سے میں، یعنی راوی، زرینہ کو آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اسے سینما کی زبان میں پوائنٹ آف ویو شاٹ کہتے ہیں۔ ایک لحاظ سے وہ اینگل جس سے ہمارا جاوید اقبال زرینہ کو دیکھ اور راوی زرینہ کو دکھا رہا ہے وہ مردانہ نظارہ بازی یا گیز (gaze) کا اینگل ہے اور اس سے صرف ایک مرد ناظر ہی حظ اٹھا سکتا ہے۔ یہ بحث بہر حال ہماری کہانی سے براہ راست متعلق نہیں لیکن اس کا اعتراف دو وجوہات سے ضروری سمجھتا ہوں: ایک یہ ہے کہ اپنی خاتون قاریوں (معاون تخلیق کاروں) سے یہ بتاتے ہوئے معذرت کرتا چلوں کہ اس زاویۂ نگاہ اور نقطۂ نظر کا بیان اور پھر وضاحت جاوید اقبال کی داستانِ محبت کے سمجھنے سمجھانے کے لیے بہت ضروری

تھی اور دوسرے اس لیے تاکہ اپنے متنی محدودات کا ایک اور زاویے سے اعتراف بھی کرتا چلوں۔

اگر زرینہ کو دیکھنے کا یہ زاویہ، یہ ٹریجکٹری کبھی تبدیل ہو گئی تو کیا زرینہ کے لیے جاوید کے جذبات بھی تبدیل ہو جائیں گے؟ اور بہت سی باتوں کے علاوہ یہ جاننے کے لیے بھی آپ کو جاوید کی کہانی اور آگے تک جانی ہوگی۔

15

صادق عرف گگی بھائی سے اس کی اگلی ملاقات بھولے بھائی کے ہوٹل پر ہوئی جہاں وہ صبح صبح حلوہ پوری کھا رہا تھا۔ بات مزاروں پر ملنے والے سکون سے شروع ہوئی اور پھر آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس کے بعد جاوید کے ذہن میں گگی بھائی اور بھولا بھائی کے نام ایک ساتھ آتے تھے۔ گگی بھائی بھی شکل سے بھولے لگتے تھے۔ کم گو، کم آمیز۔ قمیض کہیں سے پھٹی ہوئی ہے تو انھیں خبر ہی نہیں۔ آستین کا ایک بازو اُڑا سا ہوا ہے تو دوسرا ویسے ہی چھوڑ رکھا ہے۔ شیو اکثر بڑھی رہتی، لیکن جس روز شیو کر کے نئے کپڑے پہنتے تو خاصے معقول آدمی نظر آتے۔ ذرا سا تتلاتے تھے لیکن اپنے پسندیدہ ترین لفظ کے درمیان سے 'ت' غائب کر دیتے تھے۔ 'کسی چوئیا کو پتا ہی نہیں کہ روحانیت کیا چیز ہے۔'؛ 'وہ چوئیا سمجھتا ہی نہیں'؛ 'چوئیا میں کل مزار میں بیٹھا ہوا تھا' وغیرہ وغیرہ۔ لوگ پیٹھ پیچھے ان کا مذاق اڑاتے لیکن ان کے سامنے ان کی بہت عزت کرتے، گو اس دوران بھی زیرِ لب مسکراتے رہتے۔

زرینہ بھابھی ان کی بیوی تھیں جو خاصی خوش شکل تھیں۔ دونوں کا بیاہ یوں ہو گیا تھا کہ گگی بھائی والے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے اور زرینہ کے والدین کو ان کے متعدد فلیٹوں کا پتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ معقول صورت گگی بھائی کی تصویر دیکھ کر کسی کو خیال نہیں آ سکتا تھا کہ وہ دنیاوی معاملات میں اتنے بھولے ہوں گے۔ اور لڑکی والوں نے زیادہ وقت ان کی تصویر ہی دیکھی اور زرینہ کو دکھائی تھی۔ وہ بردکھوے کے لیے گئے تھے تو ان کی بھابھیوں نے ان پر زور دیا تھا کہ بس منھ بند کر کے بیٹھے رہیں۔ لڑکی والوں نے معقول صورت کا ایک کلین شیو نوجوان دیکھا، جس کا ایک اچھا خاندانی کاروبار بھی تھا، تو ہاں کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ زرینہ کو گھر میں سب کچھ مہیا تھا، سوائے اولاد کے۔ اور اولاد کے لیے بھی گگی بھائی نے اپنی سی کوشش خوب کی تھی۔ مزاروں میں ان کی دلچسپی اگر شادی کے بعد کچھ اور بڑھ

گئی تھی تو اس کی ایک وجہ شاید اولاد سے ان کی محرومی ہی ہو۔ یہ بات انھیں کون سمجھاتا کہ اولاد کے حصول میں ذاتی کوششوں کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔

زرینہ بھابھی کو گگی بھائی کے بھولپن پر پیار بھی بہت آتا تھا۔ ان کی صورت دیکھ کر اس میں ممتا کا وہ جذبہ امڈ آتا جو شادی کے بعد سے ایک بچے کے انتظار میں بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ گگی بھائی نے اس پر کوئی روک ٹوک بھی نہیں لگائی تھی۔ محلے میں اِدھر اُدھر وہ ایک چادر لے کر نکلتی اور تمام پڑوسنوں کے معاملات اور مسائل میں ان سے مشاورت کرتی۔ جاوید ان کے سامنے والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ معصوم سی مسکراہٹ والا لڑکا جو شاید کسی ٹی وی چینل میں رپورٹر تھا۔ زرینہ کو معلوم تھا کہ وہ اپنی کھڑکی سے اسے دیکھتا ہے لیکن اتنے عرصے میں اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ شریف گھرانے کا ہے اور اُس کے لیے کوئی مسائل کھڑے نہیں کرے گا۔ گھر کا کام کاج کرتے ہوئے وہ اپنے گھر کی کھڑکیاں کھلی رکھتی اور ان کاموں کی بوریت اس احساس سے کم ہو جاتی کہ وہ سب معمولی سے کام کرتے ہوئے بھی کوئی اُسے دلچسپی سے دیکھ رہا ہے۔ جاوید کو وہاں آئے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اس دوران اس کی والدہ دو مرتبہ وہاں آئی تھیں، ورنہ وہ وہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔ دن بھر غائب رہنے کے بعد اگر صبح سویرے وہ اسے ذرا سا دیکھ ہی لیتا تھا تو اس میں زرینہ کا کیا جاتا تھا، وہ سوچتی اور اسے اس معصوم پر پیار آ جاتا۔ پھر ایک روز صادق بھائی ہی اسے اپنے گھر لے آئے۔ زرینہ نے دیکھا کہ وہ اس سے نظریں ملانے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب خود ان کی نظر اِدھر اُدھر ہوتی تو اس کے سراپا پر نظر ضرور ڈال لیتا تھا۔ زرینہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا ان کے گھر تک پہنچنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ جب جاوید نے اسے بھابھی کہا تو اس نے اپنے سینے میں ممتا کو امڈتے ہوئے محسوس کیا۔

16

ایک خواب گگی بھائی کو اٹھارہ اکتوبر سے پہلے بھی آیا تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ ایک بہت بڑا جلوس ہے جس میں ہر قسم کے سیاسی نعرے لگ رہے ہیں۔ ایک طرف سے 'جیے بھٹو سدا جیے' کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور گگی بھائی کا دھیان اس طرف لگتا ہے، تو دوسری جانب 'آل طاف آل طاف' کا شور بپا ہے۔ یہ دوسری آواز انھیں کچھ سوئی سوئی سی لگتی ہے۔ ایسا لگتا کہ کہیں مراقبہ ہو رہا ہے یا ذکر کی کوئی محفل

ہے۔ شاید وہ 'آل طاف آل طاف' نہیں بلکہ 'اللہ ہو، اللہ ہو' یا 'حق ہو، حق ہو' کہہ رہے ہوں۔ گگی بھائی کو کچھ سمجھ نہیں آتی۔

پھر آل طاف یا حق ہو کی آوازوں کے درمیان سے ایک بہت موٹی سی آواز میں ایک انتہائی طویل "آ آ آ آ آ آ آ آ آ آ آ..." کی آواز آتی ہے جس میں ایسا خلوص اور درد نمایاں ہے جیسے یہ آواز کسی کے منہ یا حلق سے نہیں بلکہ جسم کی انتہائی اندرونی تہوں سے نمایاں ہو رہی ہو۔ اس کے بعد یہی آواز مزید طوالت اور اس سے زیادہ تکلیف اور خلوص کے ساتھ پیش کی گئی جسے سن کر ایسا لگتا تھا جیسے کوئی دائمی قبض کا مریض اپنی جسمانی خباثت سے پیچھا چھڑانے کے لیے پوری شدت کے ساتھ کوشش کر رہا ہو اور اس کوشش میں اس کی گاف پھٹی جا رہی ہو۔ "آ آ آ آ آ آ آ آ آ آ آ..." وہی آواز دوبارہ بلند ہوئی اور ساتھ ہی ہجوم نے دیوانہ وار نعرے لگانے شروع کر دیے: "آل طاف آل طاف۔ حق ہو حق ہو۔"

پھر ایک جانب سے شور اٹھا اور ایک بہت بڑا اور تنومند بیل دکھائی دیا جس پر ایک شخص سوار تھا جس نے اپنے ہاتھ میں تلوار پکڑ رکھی تھی۔ وہ بیل اپنے اردگرد لوگوں کے نرغے میں یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے دس محرم کو ذوالجناح نکلتا ہے اور جسے دیکھنے کے لیے گگی بھائی سنی ہونے کے باوجود ہر سال نشتر پارک جایا کرتے تھے۔ بیل کے موٹے پیٹ کے اطراف اس کے سوار کی ٹانگیں بار بار اچھل اچھل کر مس ہوتیں۔ اردگرد موجود ہجوم نعرے بھی لگا رہا تھا جو اس شور کے باعث بمشکل ہی سنائی دے رہے تھے جو گگی بھائی کے قرب و جوار میں بپا تھا۔ "آ آ آ آ" کی آواز نکالنے والا شخص بھی اب تک اپنی خباثت جسم سے خارج کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور اب اس کے آ آ آ کے درمیان منہ بسورنے اور رونے کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔ پھر وہ بیل اور اس کا سوار اور ان کے گرد ہجوم قریب آتا گیا۔ صادق بھائی نے ان کے نعروں کو کان لگا کر سننا شروع کیا۔ وہ جیسے جیسے قریب آتے گئے، ان کی آوازیں مزید واضح ہوتی گئیں۔ وہ نعرے نہیں لگا رہے تھے بلکہ کوئی نظم پڑھ رہے تھے:

چوتیوں میں گھر گئی
چوتیوں میں گھر گئی
بنت ارض ایشیا
اے عظیم کبریا

سن غریب کی دعا
بے نظیر کو بچا

بیل سوار جوان کے گرد، نیلے رنگ کی شلوار قمیض پہنے ایک شخص ایک ہاتھ میں لاؤڈ اسپیکر لیے یہ نظم سنا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے ہجوم کو اُکسا رہا تھا کہ وہ اس کا پہلا مصرع اس کے ساتھ ساتھ پڑھیں۔ جب ہجوم سات آٹھ دفعہ اس کے ساتھ پہلا مصرع دہرا لیتا تو وہ آگے بڑھتا، لیکن کچھ دیر بعد پھر پہلے مصرعے کی تکرار شروع کر دیتا۔ گگی بھائی دیکھ سکتے تھے کہ ہجوم خود بھی ان مصرعوں کا لطف اٹھا رہا تھا اور پرجوش سے پرجوش تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ گگی بھائی نے خود کو بھی نظم کے کچھ مصرعے دہراتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر یکا یک بیل سوار نے زور سے 'اللہ اکبر' کا نعرہ بلند کیا اور ہجوم پر تلوار چلانی شروع کر دی۔ اس کے اردگرد موجود چار پانچ لوگ تو حیرانی میں ہی مارے گئے اور انھیں بھاگنے تک کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد ہجوم نے دوڑ لگانا شروع کر دی اور کئی افراد ان کے نیچے کچلے جانے لگے۔ پہلے سے پرشور ہجوم کا شور انتہا کو پہنچ گیا۔ بیل سوار جوان تلوار چلاتا اور گگی بھائی کو گردنیں اڑتی ہوئی نظر آتیں۔ بیل سوار جوان اب ان سے کوئی سو گز کی دوری پر تھا۔ اچانک اس نے اپنا سر موڑا اور اپنی آنکھیں گگی بھائی کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ گگی بھائی نے خوف کی ایک لہر اپنے جسم میں سرسراتی ہوئی محسوس کی۔ انھوں نے بھاگنے کے لیے اپنا پیر اٹھانا چاہا تو پیر نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ یہ حقیقت جان کر ان کا خوف انتہا کو پہنچ گیا اور انھوں نے بیل سوار جوان کی صورت میں موت کو اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے دیکھا۔ بیل سوار جوان ان کے سر پر پہنچا، تلوار اٹھائی اور گگی بھائی نے اس سے بچنے کے لیے اپنی پوری طاقت لگا کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر دیے۔ صادق بھائی کی آنکھ کھل گئی اور انھوں نے خود کو پسینے سے تربتر پایا۔

17

کیسی عجیب رات تھی وہ۔ اٹھارہ اور انیس اکتوبر کی درمیانی رات، جس رات کارساز کے قریب بی بی کے استقبالی جلوس میں دو خودکش بم پھٹے۔ میں اپنی گاڑی میں گگی بھائی کو گھر لا رہا تھا۔ مگر پہلے کیمرا اور دھماکے کی ریکارڈنگ والی منی ڈی وی آفس میں جمع کرائی تھی۔ آفس میں رات کی شفٹ آ گئی

تھی اور میں انھیں یہ کہہ کر نکل آیا تھا کہ دھماکے میں میرا ایک دوست زخمی ہو گیا ہے۔ اصل میں اسپاٹ پر لاشوں کے انبار دیکھنے کے بعد میرا دل اپنے کام کے ساتھ ساتھ دنیا بھر سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا، تا کہ امی سے تفصیل سے بات کروں اور پھر گہری نیند سو جاؤں۔

گکی بھائی کو ان کے گھر پہنچانے سے پہلے مجھے کیسرامین کو بھی اس کے گھر چھوڑنا تھا۔ کیسرامین ساجد پٹیل پاڑہ کے قریب فلیٹوں میں رہتا تھا۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ہم نشتر پارک کے قریب ایک گلی میں داخل ہوئے تو لڑکوں نے ہماری گاڑی روک لی۔ ساجد نے کھڑکی میں سے سر باہر نکالا اور زور سے بولا، ”ارے میں ہوں ساجد۔ نسیم بائی یہیں ہیں کیا؟“

جواب میں ٹی ٹی پکڑے ہوئے ایک لڑکا کھڑکی کے پاس پہنچا اور ساجد کو پہچان کر بولا، ”نسیم بائی برابر آلی گلی میں ہیں۔“

”یار تم لوک اِش ٹیم کیا کر رئے او یہاں؟“ ساجد نے پوچھا۔

”یار وہ بلوچ پاڑہ ساتھ ہی ہے نا۔ وہاں ساری دکانیں جلا دیں ہماری۔ وہ کسی بھی ٹیم حرام پائی کرنے اِدھر آسکتے ہیں۔“

”آگے تو امن ہے ناں؟“

”ہاں بس بلوچ پاڑے کی طرف سے مت جائیو۔ ڈریور سے کہو اِدھر ای سے واپس نکل لے۔“

”سمجھ گئے نا؟“ ساجد اب کے ڈرائیور سے بولا۔

ڈرائیور جو پنجابی تھا، دم سادھے بیٹھا تھا اور اس نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھا ہوا تھا۔ اسے شاید اپنی مونچھ کا شدید احساس ہو رہا تھا جو اس کے پنجابی ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ ساجد کے جواب میں کچھ نہیں بولا۔ کچھ دیر بعد ہم نے ساجد کو اسی گلی میں اتارا اور گاڑی کو اسی گلی سے واپس لے آئے۔ برنس ریکارڈ روڈ سے آگے پٹیل پاڑہ کو جانے والا راستہ بالکل تاریک تھا اور اس کے بیچ میں رینجرز کی ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ہم گاڑی کو واپس گھما کر مزار قائد کی سائیڈ پر لائے اور جیل چورنگی کے بعد یونیورسٹی روڈ پر پہنچے تو جان میں جان آئی۔ گلشن کے علاقے میں بھی جگہ جگہ پولیس اور رینجرز کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سڑکوں پر امن قائم کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ گلیوں میں لڑکے تھے اور پولیس، رینجرز والے جانتے تھے کہ گلیوں کو وہی سنبھال لیں گے۔ پولیس، رینجرز اور لڑکوں کے درمیان ایک شاندار قسم کا باہمی تعاون چل رہا تھا۔ کچھ لڑکے پولیس موبائلوں میں بھی بیٹھے تھے اور پولیس والوں سے گپ شپ کر رہے تھے۔

گکی بھائی کو ان کے گھر چھوڑ کر رات تقریباً پونے تین بجے گھر پہنچا تو پہلے امی کو فون کیا۔ میں نے سوچا تھا کہ دو بیلز جانے کے بعد امی نے نہ اٹھایا تو سمجھوں گا کہ وہ سو گئی ہیں۔ لیکن امی نے پہلی ہی بیل پر فون اٹھا لیا۔ امی کا تشویش کے مارے برا حال تھا۔ اپنے گکی بھائی کے گھر جانے کا میں نے انھیں نہیں بتایا تھا تا کہ انھیں پریشانی نہ ہو۔ لیکن دھماکے کے بعد انھیں میں نے موبائل پر بتا دیا تھا کہ میں خیریت سے ہوں اور مجھے اسپاٹ پر سے رپورٹنگ کرتے ہوئے دیر ہو جائے گی۔ مگر وہ امی ہی کیا جو یہ باتیں سن کر مطمئن ہو جاتیں۔ اس لیے گھر پہنچ کر انھیں ایک طویل فون کرنا پڑا۔ دوسری جانب ان کی آواز سے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ انھیں بی بی کے بارے میں بہت تشویش ہے۔ بی بی سے ان کی محبت کا سبب ہمارے مرحوم ابا تھے جن سے امی نے ویسے تو علیحدگی اختیار کر لی تھی لیکن ان کے سیاسی خیالات اپنے نظریات کا حصہ بنا کر ساتھ لے آئی تھیں۔ امی نے بتایا کہ پنڈی سے آفتاب بھائی کا فون بھی آیا تھا۔ وہ بھی بہت پریشان تھے۔ جب تک ابا زندہ تھے، بڑی امی یعنی آفتاب بھائی کی والدہ اور میری امی ایک دوسرے سے کٹے رہے۔ لیکن ابا کی وفات کے بعد ان سوتنوں نے آپس میں ایک نیا رشتہ ڈھونڈ لیا۔ ایک دوسرے کو لمبی لمبی کالیں کرتیں اور ابا کی باتیں کیا کرتیں۔ اب تو خیر بڑی امی بھی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں، سو آفتاب بھائی کے لیے امی کے دل سے اب ہمیشہ دعا ہی نکلتی تھی۔ امی بتا رہی تھیں کہ آفتاب بھائی کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ میرے بارے میں بھی بہت پریشان تھے کیونکہ انھیں میرے پیپرز سے معلوم ہو گیا تھا کہ میں بھی اسپاٹ پر ہی موجود ہوں۔ بیچارے آفتاب بھائی۔ میں نے اپنی زندگی میں ان جیسا ذہین اور دیانت دار شخص نہیں دیکھا۔ کچھ سال پہلے وہ قائداعظم یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے، لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ ایک دن اچانک استعفیٰ دے کر گھر بیٹھ گئے۔ کچھ پیسے جمع کیے رکھے تھے، ان سے ایک ڈیڑھ سال کے روٹی پانی کا انتظام کیا اور پھر ایل ایل بی کر کے وکیل بن گئے۔ آج کل پرویز مشرف کے خلاف جلوس نکالتے اور گو مشرف گو کے نعرے لگاتے نظر آتے ہیں۔ اللہ انھیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

18

یہ بات مجھے گگی بھائی سے ملاقات کے کچھ ہی روز بعد معلوم ہوئی کہ انھیں ایک اور دلچسپی خوابوں سے تھی۔ خواب تو ہم سبھی دیکھتے ہیں، لیکن گگی بھائی اپنے خوابوں کے بارے میں بہت سنجیدہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ اٹھارہ اکتوبر کے روز وہ کارساز میں پیر بخاری شریف کے مزار پر اس لیے گئے تھے کہ انھیں خواب میں ایک بیل سوار جوان نظر آیا تھا جو ہاتھ میں تلوار لیے لوگوں کو قتل کرتا پھرتا ہے اور یہ جوان اس مزار میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اسی بیل سوار جوان کی تلاش میں وہاں گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے اٹھارہ اکتوبر کو اس بیل سوار جوان کو مزار میں دیکھ لیا تھا اور وہ اس کے پیچھے بھاگے بھی تھے، لیکن غصے کی شدت کے باعث ان کے حلق سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی اور ان کی حالت دیکھ کر مزار میں جو لوگ جمع ہوے انھوں نے بیل سوار جوان کے پیچھے جانے کے بجاے گگی بھائی ہی کو پانی پلا کر اپنے طور پر ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی حالانکہ گگی بھائی اس تمام عرصے میں اپنے بازو کے اشارے سے بیل سوار جوان کی طرف اشارہ کرتے رہے تھے جو مزار سے نکلا تھا۔ جب پانی پی کر وہ کچھ بولنے کے قابل ہوے تو انھوں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بیل سوار جوان کا ذکر کیا اور پھر باہر کو دوڑ لگا دی۔

وہ باہر بی بی کے استقبالی جلوس میں شامل ہو گئے اور مرکزی ٹرک کی طرف جانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ ٹرک سے کوئی پانچ سو گز دور تھے کہ انھوں نے بیل سوار جوان کو ٹرک کے عین قریب دیکھا اور پھر دھماکا ہو گیا۔ اس دھماکے سے وہ زمین پر گر گئے۔ ابھی سب لوگ گرے ہوے تھے کہ انھوں نے ایک درخت کے نیچے سے ایک اور بیل سوار جوان کو آگے بڑھتے ہوے دیکھا۔ انھوں نے اس مرتبہ بھی چیخنے چلانے کی بہت کوشش کی لیکن ان کے حلق سے آواز بھی نہ نکلی۔ لوگ ٹرک کے اردگرد زخمیوں اور مارے جانے والوں کو اٹھا رہے تھے اور تماشا دیکھنے والوں کا بھی ایک رش ہو گیا تھا کہ یہ بیل سوار جوان بھی ٹرک کے قریب آیا اور پھٹ گیا۔

گگی بھائی کی یہ طوطا مینا کی کہانی سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ لوگ ان کے پیٹھ پیچھے انھیں جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ قصہ سناتے ہوے ان کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر ہنسی بھی آتی تھی جسے میں بڑی مشکل سے روک پاتا تھا۔ لیکن پھر ان کی ایک اور بات نے مجھے اس بات

پر آمادہ کر دیا کہ میں ان کے خوابوں کو سنجیدگی سے لوں۔

انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ایک خواب دیکھا کہ ان کی دوستی ایک ایسے شخص سے ہو گئی ہے جو انسانوں کے بجاے ایک کچھوے سے محبت کرتا ہے۔ اس نے کچھوے کو ایک پنجرے میں پال رکھا ہے اور دن رات اسے سونے کا نوالہ کھلاتا ہے۔ ان کی یہ بات سنتے ہوے میں حیران رہ گیا۔ جب ان کی کتھا ختم ہوئی تو میں نے انھیں بتایا کہ میں نے بھی گھر میں ایک کچھوا پال رکھا ہے۔ انھیں یقین نہ آیا۔ میں فوراً انھیں اپنے گھر لایا اور جب انھوں نے میرے ٹینک میں کچھوے کو دیکھا تو حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لیکن اس حیرت میں خواب پورا ہونے کی مسرت کے بجاے خوف کا عنصر حاوی تھا۔ میرے گھر میں لگی تصویروں کو بھی وہ اپنی آنکھیں گول گول گھما کر دیکھتے رہے، لیکن ان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔

19

جاوید اقبال نے صادق عرف گگی بھائی کے خوابوں میں دلچسپی ظاہر کی ہے تو ہمیں خود جاوید کے خوابوں کے بارے میں بھی کچھ علم ہونا چاہیے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ جاوید اپنے خواب تحریر نہیں کرتا۔ دفتری معاملات، نسوانی حسن سے اس کی دلچسپیاں اور پھر ارشمیدس سے اس کی دوستی۔ ان دنوں جاوید کے روز و شب انھی تین دلچسپیوں کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ خواب ہماری تمام دلچسپیوں کو ایک ہی ہانڈی میں پکا کر کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ ایک روز جاوید نے خواب میں دیکھا کہ وہ عالم بالا سے لائیو بیپر دے رہا ہے۔ ایک روز اسے عرفات کے میدان میں سجنے والے یومِ حشر سے رپورٹنگ کرنی پڑی۔ لیکن ایک خواب ایسا تھا جس میں زرینہ، کرینہ کپور اور مشعال سب گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھیں اور جاوید اگلے کئی روز تک اس خواب کو بھلا نہیں سکا تھا۔

کچھ روز پہلے مشعال نے جاوید سے ذکر کیا تھا کہ وہ رپورٹنگ سے تھک جاتی ہے اور کتنی اچھی جاب ہے ان اینکرز کی جو گھر سے آتی ہیں، میک اپ کرتی ہیں اور پھر اسکرین کے سامنے بیٹھ جاتی ہیں۔ پروڈیوسران کے نخرے اٹھاتے ہیں، افسران کو ان سے بات کرنے میں ٹائم ضائع ہونے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، اور دنیا بھر میں ان کا شہرہ الگ ہوتا ہے۔ دوسری جانب رپورٹر دن بھر مارا مارا پھرتا ہے۔ کبھی

کوئی ایمرجنسی ہو تو کئی کئی گھنٹے کھڑے رہ کر رپورٹنگ کرنی پڑتی ہے جس میں رنگ کالا ہونے کا شدید خطرہ ہے۔ جاوید نے مشعال کی بات سن کر اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی چھوٹے چینل میں اینکرنگ کا آڈیشن دے۔ اس روز رات کو مشعال جاوید کو اپنے خواب میں نظر آئی، اور وہ بھی ایک نیوز اینکر کے روپ میں۔

اس نے دیکھا کہ مشعال ایک ایسے شخص کا بیپر لے رہی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ اس نے چھ سات خواتین کو اسلحے کے زور پر یرغمال بنا رکھا ہے اور جو لائیو بیپر کے دوران ان میں سے ایک ایک کو باری باری اپنی ہوس کا نشانہ بنا رہا ہے۔ خواب کے دوران جاوید کو اس بات کا خیال نہیں آیا کہ وہ چھ سات خواتین مل جل کر اس پستول بردار کے خلاف مزاحمت کیوں نہیں کرتیں۔ ایک اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بیپر دینے والے کی تصویر بھی باکس میں لگی ہوئی تھی۔ کیا اس نے ریپ کرنے سے پہلے اپنی تصویر بھی ٹی وی چینل کو بھجوا دی تھی۔ یہ سب خیالات اسے خواب کے بعد ہی آ سکتے تھے، سو آئے۔

بیپر کے دوران وہ شخص خاتون کا نام اس کی ولدیت کے ساتھ بتاتا تھا اور پھر اپنی کارروائی شروع کر دیتا تھا۔ بیک گراؤنڈ میں اس خاتون کی کراہوں کی آواز آتی اور پھر مشعال کی چلاتی ہوئی آواز، جس میں وہ کہہ رہی ہوتی: دیکھیے ناظرین، آپ سب کے سامنے پاکستان کی ایک بیٹی کا ریپ ہو رہا ہے لیکن حکومت یا قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی اور اس حوا کی بیٹی کو بچانے اب تک کوئی اس مقام پر نہیں پہنچا ہے۔ ناظرین، آپ اپنی ٹیلی وژن اسکرین پر سن سکتے ہیں کہ اس وقت پاکستان کی اس بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ناظرین، آپ اس وقت لائیو سن سکتے ہیں کہ حوا کی ایک بیٹی کے ساتھ سرعام زیادتی کی جا رہی ہے۔ اور باقی خواتین بھی لائن لگا کر بیٹھی ہوئی ہیں اور اگر قانون نافذ کرنے والے اداروں نے بروقت کوئی قدم نہ اٹھایا تو ان کے ساتھ بھی باری باری زیادتی کر دی جائے گی۔ اس دوران ٹیلی وژن اسکرین کے ماتھے پر سرخ رنگ کی ایک پٹی پر دو مصرعے بدل بدل کر آ رہے ہیں۔ ایک پر لکھا ہے: ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں۔ دوسری پٹی پر لکھا ہے: مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی۔

بیک گراؤنڈ میں جو خاتون کراہ رہی تھی، اب اس کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ جیسے وہ اپنی تقدیر پر راضی بہ رضا ہو گئی ہو۔

مشعال چلا کر پوچھتی ہے، ''آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ مطالبہ کیا ہے آپ کا؟''

''میرا مطالبہ ہے کہ اس ملک میں شریعت نافذ کی جائے اور وزیر اعظم فی الفور ٹی وی پر آ کر اس کا اعلان کریں۔''

''لیکن اس وقت آپ جو کچھ کر رہے ہیں، کیا وہ شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہے؟ کیا اسلام یہی سکھاتا ہے کہ نہتی عورتوں کو پکڑ کر ان کا ریپ کیا جائے؟'' مشعال کی رندھی ہوئی آواز میں غصے سے زیادہ درد ہے۔ وہ درد جو ان عورتوں کے لیے صرف ایک عورت ہی محسوس کر سکتی ہے۔

''جی ہاں! جب یہ عورتیں بازاروں میں بے پردہ نکلتی ہیں، تب تو آپ کو خیال نہیں آتا۔ جب یہ شادیوں پر ڈانس کرتی ہیں، تب تو آپ کو خیال نہیں آتا۔ جب یہ نیٹ کیفے میں، پارکوں میں، اسکولوں کالجوں میں غیر محرموں سے ملتی ہیں، تب تو آپ کو خیال نہیں آتا کہ یہ کام اسلام کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اب آپ کو اتنا دکھ کیوں ہو رہا ہے؟ میں یہ کہتا ہوں کہ ملک میں شریعت نافذ کریں۔ اس کے بعد میرا یہ عمل اس کے خلاف نظر آئے تو مجھے بھی پھانسی پر لٹکا دیں۔'' اغوا کار ریپسٹ اپنے دلائل پیش کرتا ہے اور ریپ ہونے والی خاتون کو چھوڑ کر دوسری خاتون کو دبوچ لیتا ہے۔ دبوچے جانے پر اس خاتون کی آواز اس مرغی سے مشابہ ہے جسے ذبح کرنے کے لیے قصائی نے دڑبے میں ہاتھ ڈال کر اس کی گردن دبوچ لی ہو۔ اس کے بعد اس کی کراہوں کی آواز آنا شروع ہو جاتی ہے۔

''ناظرین، آپ سن سکتے ہیں کہ حوا کی ایک بیٹی کے ساتھ زیادتی کر دی گئی ہے اور اب اس شخص نے دوسری خاتون کو پکڑ لیا ہے اور لگتا یہی ہے کہ اس کے ساتھ بھی وہی کیا جا رہا ہے جو پہلی خاتون کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اسی معاملے پر بات کرنے کے لیے ہم نے رابطہ کیا ہے مولانا تاج الدین توحیدی صاحب سے۔ جی تاج الدین صاحب، آپ اس شخص کو کیا کہنا چاہیں گے؟'' مشعال ایک مولانا کو بیپر پر لے لیتی ہے۔ بیک گراؤنڈ میں عورت کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے جس کی آ آ آ اغوا کار شخص کے دھکوں سے ابھرتی اور ڈوبتی ہے۔ مولانا اس شخص سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ نہتی خواتین کو چھوڑ دے اور اللہ کے وعدے پر ایمان رکھے کہ اگر وہ نیک اعمال کرے گا تو اسے ان سے کہیں زیادہ خوبصورت عورتیں آخرت میں ملیں گی۔

''شریعت پر ہم سب کا ایمان ہے اور ہم سب چاہتے ہیں کہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ لیکن اس شخص کے طریقۂ کار کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟'' مشعال پوچھتی ہے۔

"شریعت کے نفاذ سے متعلق اغوا کار کا مطالبہ تو بالکل درست ہے لیکن اس کے طریقۂ کار سے ہم اتفاق نہیں کرتے،" مولانا نے جواب دیا۔

اتنے میں بیپر پر وہ شخص چلانا شروع کر دیتا ہے کہ اس کے گھر کے باہر فوج اور پولیس کے دستے پہنچ گئے ہیں۔ مولانا بھی چلاتے ہیں کہ یہ مسئلہ افہام و تفہیم اور مذاکرات سے حل کرنا چاہیے۔ تشدد کسی مسئلے کا حل نہیں۔ دونوں کی چیخ پکار میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی جبکہ بیک گراؤنڈ میں ایک اور عورت کے رونے کی آواز آنے لگتی ہے۔

تھوڑی دیر میں ٹی وی پر وڈیو چلنے لگتی ہے جس میں اغوا کار وکٹری کا نشان بنائے، اپنے دونوں بازو اوپر اٹھائے گھر سے نکل رہا ہوتا ہے اور اس کے پیچھے چھ سات خواتین اپنے چہرے چادروں سے چھپائے بھاگ رہی ہوتی ہیں۔ اسے پولیس وین میں بٹھایا جاتا ہے تو ایک رپورٹر اپنا مائیک اس کے منہ تک لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ شخص کہتا ہے: "میں نے جو کچھ کیا اس پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ انما الاعمال بالنیات۔ اور مجھے ان دنیاوی عدالتوں سے انصاف لینا بھی نہیں۔ میری نیت میرا اللہ جانتا ہے۔ مجھے اسی کی عدالت سے انصاف لینا ہے۔"

خواب میں پتا نہیں کب مشعال کی جگہ زرینہ اینکر کی کرسی سنبھال لیتی ہے۔ اس نے ویسی ہی ایک چادر اوڑھ رکھی ہے جیسی اغوا کار کے چنگل سے بھاگنے والی عورتوں نے اوڑھ رکھی تھی۔ پھر وہ چادر اتار کر ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ اس کی قمیض کندھے پر سے پھٹی ہوئی ہے اور اس میں سے اس کا اسٹریپ نظر آ رہا ہے۔ وہ زرینہ ہے لیکن کنٹرول روم میں سب اسے 'مشعال مشعال' ہی پکار رہے ہیں۔

اب زرینہ مولانا منور قاضی صاحب کو لائن پر لیتی ہے۔

"مولانا صاحب، آپ نے ابھی ٹی وی اسکرین پر خود دیکھا اور سنا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔ جب میرے ساتھ وہ سب کچھ ہو رہا تھا تو آپ نے میری کراہیں تو سنی ہوں گی مولانا صاحب۔ یہ سب لائیو ہو رہا تھا میرے ساتھ۔ آپ کیا کہنا چاہیں گے اس پر؟"

مولانا فرماتے ہیں، "اغوا کار کا مطالبہ بالکل جائز ہے۔ اس ملک میں شریعت نافذ ہونی چاہیے۔ ہاں طریقۂ کار پر اختلاف ہو سکتا ہے جسے مذاکرات کی ٹیبل پر طے کیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن مولانا، یہ شخص تو شریعت کی خاطر خواتین کو ریپ کر رہا ہے۔ کیا آپ اس کی مذمت نہیں

کریں گے؟"

"دیکھیے میں کوئی مفتی نہیں۔ لیکن تاریخ میں ایسی مثالیں خود موجود ہیں۔ اب کون حق پر تھا، کون حق پر نہیں تھا، یہ فیصلہ میں اور آپ تو یہاں بیٹھ کر نہیں کر سکتے نا۔ آپ لوگ کیوں بلا وجہ میڈیا پر ایسے سوال پوچھتی ہیں؟ ایسے معاملات میں پردہ پوشی ہی مستحسن ہے۔ لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ آپ امریکہ کے ایجنڈے پر اور سیکولر ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں۔"

"مولانا صاحب، میرا ریپ ہوا ہے۔ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں ایجنڈے پر کام کر رہی ہوں!" زرینہ کی کپکپاتی ہوئی آواز کے ساتھ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھی آ جاتے ہیں۔

"کٹ مت کرنا! کٹ مت کرنا!" کنٹرول روم سے پروڈیوسر کی چلاتی ہوئی آواز آتی ہے۔ ڈریگ پر ایک افسر کی آواز آتی ہے: "بے وقوف! اس وقت خواتین کے شاٹس کیوں چلا رہے ہو؟ مشعال کو فل اسکرین پر لو۔"

"اچھا جی! بالکل جی!" پروڈیوسر کہتا ہے۔ مگر کنٹرول روم کے اسٹاف نے افسر کا پہلا لفظ سنتے ہی مشعال کو فل اسکرین پر لے لیا تھا۔ پروڈیوسر اسے کہتا ہے کہ "مشعال جذبات! جذبات لاؤ مشعال!"

اس شور و غوغا میں مولانا صاحب کا خطاب سنائی نہیں دے رہا۔ جب وہ خاموش ہوتے ہیں تو زرینہ ٹھوڑی ہلاتی ہے اور فل اسکرین پر ناظرین سے ایک جذباتی خطاب کرنے لگتی ہے۔ لیکن اب اس کی شکل کرینہ کپور جیسی لگنے لگی ہے۔ فلم چنبیلی کی کرینہ کپور۔ وہ اپنی نیلی ساڑھی میں ملبوس اسکرین پر بیٹھی ہے اور اس کے بلاؤز پر سرخ پھول سے بنے ہوئے ہیں۔ اس نے چنبیلی کی کرینہ کی طرح اپنے ہونٹوں پر بہت سی سرخی تھوپی ہوئی ہے اور یہ سرخی اس کے ہونٹوں کے اردگرد اس بات کا ثبوت بن کر پھیلی ہوئی ہے کہ اس کے ہونٹوں کو خوب مسلا جا چکا ہے۔ وہ جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں بول رہی ہے اور اس کی آواز بھی کرینہ کپور کی آواز ہے۔ "ناظرین، میرے ساتھ بدسلوکی کی گئی، زیادتی کی گئی اور وہ بھی لائیو۔ میرے ساتھ کیا ہوا وہ میں آپ کو بتا بھی نہیں سکتی۔ لیکن آپ نے خود میری آوازیں سنیں۔ آپ خود بتائیے کہ قصور کس کا ہے۔ اسلام کا نفاذ کون نہیں چاہتا؟ میں خود چاہتی ہوں۔ لیکن اس کے لیے میرے ساتھ یہ سلوک!" اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر بہنے لگتے ہیں۔

زرینہ یا کرینہ کپور کے پاس ایک اور بریکنگ نیوز آ گئی ہے۔ وہ ٹشو پیپر سے اپنے آنسو پونچھتی ہے اور ایک سانس بھر کر مولانا منور قاضی کا شکریہ ادا کرتی ہے جو ویسے بھی کچھ دیر سے لائن پر موجود نہیں ہیں۔ اب وہ چیخ چیخ کر بول رہی ہے: "ناظرین، اغوا کار نے خواتین کے ریپ کی وڈیو جاری کر دی ہے۔ بچے اور کمزور دل کے حضرات اسے دیکھنے سے گریز کریں۔" وڈیو میں شاٹس کو دھندلا کر دیا گیا ہے لیکن نیچرل ساؤنڈ جانے دی گئی ہے۔ بیک گراؤنڈ میں عورتوں کی کراہیں صاف سنی جا سکتی ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہو رہا کہ وہ درد سے کراہ رہی ہیں یا لطف سے۔ وہ وڈیو کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ ریپ کرنے والا شخص وہ خود ہے جبکہ جس عورت کو ریپ کیا جا رہا ہے اس کی شکل زرینہ سے یا شاید کرینہ سے ملتی جلتی ہے۔ بیک گراؤنڈ میں کسی گانے کی آواز آ رہی ہے: یہ میرا دل پیار کا دیوانہ...

"آڈیو تیز کرو!" ڈریگ پر افسر کی آواز آتی ہے۔ کنٹرول روم کا اسٹاف یہ آواز سنتے ہی آڈیو بڑھا دیتا ہے، مگر پروڈیوسر پھر بھی چلاتا ہے: "آڈیو تیز کرو!" آواز تیز ہوتی ہے: دیوانہ دیوانہ، پیار کا پروانہ... آتا ہے مجھ کو پیار میں جل جانا... ریپ کرنے والا شخص زرینہ کرینہ کے بال گردن سے ہٹا کر اس کی گردن میں اپنا منہ گھسا دیتا ہے۔ زرینہ کرینہ کے چہرے پر ویسی ہی درد انگیز مسکراہٹ موجود ہے جیسی کرینہ کپور کے چہرے پر اس وقت آئی تھی جب فلم ڈان کے اس گانے کے آخر میں شاہ رخ خان کرینہ کپور کو اپنی جانب کھینچتا ہے اور اس کی گردن کی تنی ہوئی ناڑ کا بوسہ لے لیتا ہے۔ جاوید زرینہ یا کرینہ کے جسم کو چھونے کی لذت خود اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے اندر یہ زوردار خواہش ابھرتی ہوئی محسوس کرتا ہے کہ ریپسٹ اب زرینہ یا کرینہ کو دھکے لگانا شروع کر دے۔ ریپسٹ اس کی خواہش تسلیم کرتا ہے اور دھکے لگانا شروع کر دیتا ہے۔ پہلا دھکا ہی اس کی نیند کو لگتا ہے اور دو تین دھکوں میں اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھتا ہے اور اپنی رگوں کو تنا ہوا محسوس کرتا ہے۔

20

جاوید اقبال کی والدہ سلطانہ بیگم اس سے دور رہتی تھیں، لیکن انھیں یہ علم ضرور تھا کہ ان کے بیٹے کی لڑکیوں سے دلچسپی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ جاوید اقبال نے اپنے کارناموں کی ابتدا اسکول ہی کے زمانے سے کر دی تھی۔ ان دنوں وہ اپنے شوہر اقبال محمد خاں سے علیحدہ ہو کر کراچی میں اپنی امی کے

ہاں رہ رہی تھیں۔ اقبال صاحب سے ان کی علیحدگی کا سبب بھی یہی تھا کہ انھوں نے انھیں اور ایک عورت کو اپنے ہی گھر میں ایسے عالم میں دیکھ لیا تھا کہ دونوں کی بانہیں ایک دوسرے کے گلے میں تھیں۔ اب جب ان کے اپنے فرزند نے پہلا گل کھلایا تو انھیں غصہ آنے کے بجائے تفاخر کا سا احساس ہوا۔ انھوں نے خود سے بحث بھی کی کہ انھیں اس بات پر اپنے بیٹے کو ڈانٹنا چاہیے اور انھوں نے اسے ڈانٹا بھی، لیکن ان کا دل اپنے فرزند کے اس کارنامے پر اچھل اچھل کر داد دے رہا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ جاوید کی کلاس ٹیچر نے انھیں فون کر کے بلایا تھا اور پھر یہ بتایا تھا کہ جاوید میاں بریک ٹائم میں اپنی کلاس کے اندر موجود تھے اور ایک لڑکی کو کس کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ سلطانہ بیگم نے اس پر اس ٹیچر سے احتجاج بھی کیا کہ میرے بیٹے نے کوئی زبردستی تھوڑا ہی کی ہوگی۔ اس نے جو کچھ بھی کیا ہوگا وہ اس لڑکی کے تعاون سے ہی ممکن ہوا ہوگا۔ اس پر ٹیچر نے اسے بتایا کہ لڑکی کو بھی وارننگ دی گئی ہے لیکن اس کے والدین کو اس لیے نہیں بتایا گیا کیونکہ وہ لڑکی ہے۔ سلطانہ بیگم سے اپنی مسکراہٹ قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا، لیکن انھوں نے اپنے بیٹے کو سمجھانے کی ہامی بھر لی تھی۔

گھر آ کر انھوں نے اپنے بیٹے کو سمجھایا اور اس نے سر جھکا کر، لیکن مسکرا مسکرا کر، ان کی بات بھی مان لی۔

بعد کے برسوں میں انھیں یہ یقین آ گیا کہ ان کا بیٹا کسی ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ وہ بڑی آسانی کے ساتھ ایک لڑکی کو کی گئی لمبی سی کال ختم کر کے دوسرا نمبر ڈائل کر لیتا تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جاوید شادی کے بعد اپنی بیوی کا وفادار بھی ہو اور دوسری جگہوں پر بھی منہ مارتا پھرے؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتی تھیں۔ جاوید کافی ذمہ دار لڑکا تھا اور امتحانوں میں اوسط سے زیادہ ہی نمبر لیا کرتا تھا۔ اسے کوئی کام کہا جاتا تو پوری ذمہ داری سے کرتا اور سلطانہ جس کام سے منع کرتیں، حتی المقدور کوشش کرتا کہ اس سے گریز کرے۔ لیکن لڑکیوں میں دلچسپی ختم یا کم کر دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہ ایسی بات تھی جس سے سلطانہ بیگم نے بھی سمجھوتہ کر لیا تھا۔ شاید جاوید اقبال نے اپنے والد اقبال محمد خاں کی طبیعت پائی تھی۔ وہ بھی تو بہت عاشق مزاج تھے۔ لیکن دونوں کے بارے میں سلطانہ بیگم کے رویوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ انھوں نے اقبال محمد خاں کی بے وفائی کا ثبوت ملتے ہی ان سے قطع تعلق کر لیا تھا، لیکن بیٹے کی زندگی کی رومانی رنگا رنگی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ اقبال محمد خاں نے تعلق ٹوٹنے

کے بعد ایک مرتبہ ان سے کہا تھا: ''سلطانہ، میں چاہے کسی کے ساتھ بھی گھومتا پھروں، لیکن محبت میں نے صرف تمھی سے کی ہے۔'' شاید وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ کیا معلوم۔ اگر میں انھیں ایسا حق دے دیتی تو کیا وہ بھی مجھے ایسا ہی حق دے دیتے؟ وہ سوچتیں اور انھیں اکرام صاحب کا خیال آ جاتا جنھوں نے اقبال صاحب سے علیحدگی کے بعد ان کا بہت خیال رکھا تھا اور جن سے وہ کبھی کبھار ملتی بھی رہی تھیں۔ اس تعلق میں دست درازی کے لمحات بھی آئے تھے لیکن دونوں نے ان لمحات کو ان کی انتہا تک پہنچانے سے گریز کیا تھا۔ سلطانہ نے ایسے مواقع پر ان کے ہاتھ کو نرمی سے پرے ہٹا دیا تھا یا خود سمٹ کر ایک طرف ہو گئی تھیں، اور اکرام صاحب نے بھی ایسے میں ویسی ہٹ دھرمی دکھانے کی کوشش نہیں کی تھی جیسے شادی سے پہلے اقبال محمد خاں دکھایا کرتے تھے۔ اکرام صاحب کے ساتھ ایسی صورت حال کے راستے میں اگر معمولی معمولی سی رکاوٹیں اور مزاحمتیں کھڑی نہ کی جاتیں تو کیسا منظر ہوتا؟ سلطانہ نے اس کے بارے میں سوچا ضرور تھا مگر وہ اس کی ضرورت کی بہت زیادہ قائل نہیں ہو سکی تھیں۔ شاید اکرام صاحب کو ان کے قائل ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے تھا، جیسا کہ اقبال محمد خاں بھی نہیں کرتے تھے۔ تاہم سلطانہ بیگم خود سے بات کرتے ہوئے بھی اس تعلق کو کسی اُس قسم کا 'چکر' قرار دینے سے بالکل انکاری تھیں جیسا اقبال محمد خاں اپنی 'سہیلیوں' کے ساتھ چلایا کرتے تھے۔ ''اور پھر وہ تو علیحدگی کے بعد کی بات ہے نا...'' وہ خود کو سمجھایا کرتی تھیں۔

21

جس رات جاوید اقبال صادق بھائی کو ان کے گھر لایا تھا، زرینہ انھیں دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ صادق بھائی کی دائیں ٹانگ بالکل حرکت نہیں کر رہی تھی لیکن انھوں نے بتایا تھا کہ انھیں کسی جگہ کوئی بڑی چوٹ نہیں لگی تھی۔ گھبراہٹ میں زرینہ کا دوپٹہ بھی گر گیا تھا اور اسے اس کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ صادق بھائی بستر پر لٹائے جا چکے تو انھوں نے آنکھیں موند لیں۔ زرینہ ان کی داہنی ٹانگ کے بالائی حصے کو دبانے لگی۔ جاوید سامنے کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ لیکن زرینہ جلد ہی دودھ گرم کرنے چلی گئی۔ وہ واپس آئی تو اس نے سر پر دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ دودھ کے ساتھ اس نے صادق بھائی کو نیند کی گولی بھی دی اور کچھ ہی دیر میں صادق بھائی اپنا منھ کھولے نیند کی آغوش میں تھے۔ جاوید کو احساس ہوا کہ

اب اسے چلنا چاہیے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ''اچھا میں چلتا ہوں'' کہہ کر دروازے کی جانب بڑھا۔ زرینہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر جاوید نے زرینہ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے ہوئے تھے۔

''اگر آج انھیں کچھ ہو جاتا تو؟''

''ارے نہیں، انھیں زیادہ چوٹ ووٹ نہیں لگی۔ شاید دھماکے کے زور سے وہ اُڑ کر دور جا گرے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔''

زرینہ کے آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا اور اس نے اپنا سر جاوید کے کندھے سے ٹکا دیا۔ جاوید کے لیے یہ سب غیر متوقع تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر اسے دلاسا دیا۔ زرینہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، لیکن وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کے حلق سے آواز نہ نکلے۔

''ارے آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں،'' جاوید نے کہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا جی چاہا کہ اسے بھینچ کر گلے سے لگا لے۔ مگر اس دوران زرینہ اس سے کچھ دور ہٹ گئی تھی اور اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ جاوید نے سوچا کہ اس نے اسے گلے لگانے کا موقع مس کر دیا ہے۔ وہ اگلی صبح آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

22

اگلی صبح وہ اس کے گھر پہنچا تو دروازہ زرینہ ہی نے کھولا۔ صادق بھائی تو گھر پر نہیں ہیں۔ وہ صبح ہی نکلے ہیں اسپتال کے لیے، زرینہ نے اسے بتایا اور اسے اندر آنے دینے کے لیے ایک طرف کو ہو گئی۔

''کیوں؟ اسپتال جانے کی ضرورت کیوں پڑ گئی انھیں؟''

''چوٹ تو لگی ہے انھیں، مگر ایسی جگہ کہ بتا نہیں سکتے،'' زرینہ ہنستے ہوئے بولی۔

''کیوں؟ کہاں؟ کہاں لگی ہے چوٹ؟'' جاوید نے انجان بن کر پوچھا۔

''پیچھے سے پورے چھل گئے ہیں،'' زرینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا ہے کہ ٹیٹنس کا ٹیکا لگوا کر آئیں اور وہ بھی وہیں۔'' زرینہ کے ہونٹوں پر ہنسی دیکھ کر جاوید بھی مسکرانے لگا۔

''تم بیٹھو، میں تمھارے لیے چائے بناتی ہوں،'' زرینہ نے کہا اور جاوید بھی اس کے پیچھے پچن

میں چلا آیا۔

وہ چائے بناتی رہی اور جاوید اسے دیکھتا رہا۔

"مجھے پتا ہے کہ تم مجھے کھڑکی میں سے دیکھتے ہو،" زرینہ نے، جس کا منہ چولھے کی جانب تھا، اچانک کہا تو جاوید ایسے بھونچکا رہ گیا جیسے کسی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

"نہیں جی... وہ تو بس کھڑکی کھلی رہتی ہے تو۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں کون سا مائنڈ کرتی ہوں۔"

جاوید کی جان میں جان آئی تو اسے شوخی سوجھی۔

"اور مائنڈ کیوں نہیں کرتیں آپ؟"

"مجھے پتا ہے تم اچھی فیملی سے ہو،" زرینہ اس کی طرف چہرہ موڑ کر بولی۔ "لیکن ایسا کیا ہے جو تم اتنے عرصے سے دیکھے ہی جا رہے ہو؟" زرینہ نے اپنا چہرہ ایک بار پھر چولھے کی جانب موڑنے کے بعد کہا۔

"آپ اچھی لگتی ہیں مجھے۔ اور آپ ہیں بھی بہت اچھی،" جاوید ایک ایک لفظ رک رک کر ادا کرتے ہوئے بولا۔

"کہاں سے اچھی ہوں اب؟ ابھی تو تم نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔"

"نہیں آپ ہر لحاظ سے اچھی ہیں۔ خوبصورت ہیں، سمارٹ ہیں،" جاوید اس کے سراپا کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"چلو تمھیں اچھی لگتی ہوں تو دیکھ لیا کرو۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ بھی ہے؟"

"فائدہ؟" جاوید کے منہ سے یکایک نکلا۔

"فرینڈ شپ کرنا چاہتے ہو؟" زرینہ نے کہا اور جب دیکھا کہ کچھ لمحوں تک جاوید نے کوئی جواب نہیں دیا تو اپنا رخ اس کی طرف پھیر کر یہی سوال اپنی آنکھوں سے پوچھا۔ جاوید سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دے کہ زرینہ نے یکایک اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

"چلو آج سے ہم تم فرینڈ۔ ٹھیک ہے؟" وہ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی اور اس کے نرم ہاتھ کی ملائمت جاوید کے وجود میں سرایت کر گئی۔

"لیکن میرے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات مت سوچنا۔ میں ایسی ویسی عورت نہیں،" اس نے کہا اور پھر اپنی بات پر خود ہی ہنسنے لگی۔ چائے تیار ہو گئی تھی۔ وہ ٹرے میں دو کپ رکھ کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ جاوید بھی اس کے ساتھ تھا۔

"ایسی ویسی بات کوئی نہیں ہو گی بھابھی۔ آپ کانفیڈنٹ رہیں،" وہ بولا اور اس کی گردن کے پاس گلے سے نکلتے ہوئے اسٹریپ پر نظریں جما دیں۔ اس کی سرسوں کے رنگ کی قمیض میں سے گلابی بریزیئر نظر آ رہی تھی۔

چائے پر زرینہ اس کے پیشے سے متعلق باتیں پوچھتی رہی۔ جاوید جواب دیتا رہا۔ چائے ختم ہو گئی تو وہ جانے کے لیے اٹھا۔ دروازے پر زرینہ نے ایک بار پھر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"آپ پکا بتائیں کہ آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا؟" جاوید نے مصافحے کا دورانیہ بڑھانے کے لیے اس سے پوچھا۔

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں،" اس نے بھی خوب سوچ کر جواب دیا۔

جاوید نے "تھینک یو سو مچ" کہتے ہوئے اپنی بانہیں اس کے کاندھوں پر پھیلا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"کیا کر رہے ہو؟ وہ آتے ہی ہوں گے۔"

"بس شیک ہینڈ، ہگ وغیرہ تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ مگر اس سے زیادہ نہیں۔"

اس پر جاوید نے اسے ایک بار پھر گلے سے لگا لیا اور اس کا ہاتھ اس کی کمر پر بریزیئر کو محسوس کرنے لگا۔ زرینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر لگا رکھے تھے اور وہ معمولی سی مزاحمت کر رہی تھی تا کہ ان کے درمیان ایک آدھ انچ کا فاصلہ برقرار رہے۔ یکایک جاوید کے دماغ میں ایک زوردار بگولا سا اٹھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے سامنے سے دبوچ لیا۔ پھر دائیں ہاتھ سے اس کے سر کو چوٹی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کر لیا۔ وہ اسے چہرے پر بوسہ دینا چاہتا تھا لیکن اس نے زرینہ کی آنکھوں میں دیکھا جو یک دم غصے سے بھر گئی تھیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور زرینہ نے اس کے سینے کو دونوں ہاتھوں سے دھکا دے کر اسے پرے کر دیا۔

''سوری۔ آئی ایم رئیلی سوری۔''

''ابھی جاؤ۔ بعد میں بات ہوگی۔'' زرینہ نے دروازہ کھول کر اس کی کمر کو ذرا سا دبایا اور اس نے خود کو دروازے سے باہر پایا۔ زرینہ کے چہرے پر اس کی آخری نظر پڑی تو وہ سرخ ہو چکا تھا اور اس پر سے مسکراہٹ غائب تھی۔

23

اس رات صادق بھائی نے ایک اور خواب دیکھا۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ وہ زرینہ کے ساتھ ایک کمرے میں ہیں۔ وہ دونوں اپنے کپڑے اتار دیتے ہیں اور صادق بھائی دھکم پیل شروع کر دیتے ہیں۔ اچانک وہ اپنی پشت پر ٹھنڈی ہوا کی ایک لہر محسوس کرتے ہیں۔ وہ گردن گھما کر دیکھتے ہیں تو ان کی پیٹھ کے پچھلی جانب کی دیوار غائب ہوتی ہے۔ انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دھکم پیل میں انھیں کوئی پیچھے سے دیکھ رہا ہے۔ وہ زرینہ کی ٹانگیں موڑتے ہیں اور خود اس سمت آجاتے ہیں جہاں ان کی پشت پر دیوار موجود ہے اور وہ سامنے غائب شدہ دیوار سے کسی غیر کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن دھکم پیل شروع کرتے ہی غائب شدہ دیوار پھر سے ظاہر ہو جاتی ہے اور اب انھیں پھر اپنی پشت پر ٹھنڈی ہوا کی لہر محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنی گردن گھما کر دیکھتے ہیں تو ان کی پیٹھ کے پچھلی جانب کی دیوار غائب ہوتی ہے۔ کنویں میں موجودگی کے دوران ہی ان کی علامت مرجھانا شروع کر دیتی ہے اور زرینہ ان کی جانب دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی ناراضی ہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کی کسی غلطی پر اسے مسکراتے ہوئے جعلی سے انداز میں جھڑک رہی ہو۔ اس کے بعد ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

24

جاوید کے پاس زرینہ کا موبائل نمبر موجود تھا، اس نے زرینہ کو انگریزی کے پانچ حرفوں پر مشتمل ایس ایم ایس کیا: ''سوری''۔ زرینہ کا کوئی جواب نہ آیا۔ دن بھر وہ جاب کے سلسلے میں مصروف رہا۔ رات کو سونے سے پہلے اسے خیال آتا رہا کہ کہیں اس نے اتنی تیز روی سے معاملہ چوپٹ تو نہیں کر دیا۔ اگلے روز صبح آنکھ کھلتے ہی اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ سامنے کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ وہ

تا دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا لیکن زرینہ کسی کام ہی کے سلسلے میں کھڑکی کے سامنے سے تیزی سے گزرتی اور تیزی سے واپس چلی جاتی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کے سامنے آئی اور اپنے بستر پر پڑی چادر کی سلوٹیں درست کرنے لگی۔ اس نے اپنی قمیض پر دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی اور جاوید کے لیے اس بات کا اشارہ کہ سب کچھ اچھا نہیں ہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر موبائل پر اسے ایس ایم ایس کیا: ''سوری''۔ اس نے موبائل اس کے سامنے اٹھایا۔ میسج پڑھا، جاوید کی طرف دیکھا اور وہاں سے ہٹ گئی۔ جاوید دن بھر اپنے دفتر میں بھی پریشان رہا۔

رات اس نے ایک اور پلان بنایا اور صبح ہی صبح صادق بھائی کے گھر سے نکلنے سے پہلے ہی ان کے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ زرینہ نے کھولا اور اس کے چہرے پر گمبھیرتا کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے جھٹ صادق بھائی کو آواز دی۔ صادق بھائی کی چوٹ کا احوال پوچھنے کے بعد جاوید نے ان سے کہا کہ وہ بابا عالم شاہ بخاری کے مزار کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے، کیونکہ وہ اس مزار پر بھی ایک رپورٹ بنانا چاہتا ہے۔ صادق بھائی اسے گھر کے اندر لے گئے۔ زرینہ بھی آگئی اور اس نے بڑی خوش دلی سے اسے سلام کیا۔ جاوید یہی چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صادق بھائی کے سامنے وہ اس کے ساتھ رکھائی سے پیش نہیں آئے گی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے بنانے چلی گئی اور جاوید مزار کے بارے میں معلومات لیتا رہا۔ وہ چائے بنا کر لائی اور کپ اس کے ہاتھوں میں تھمایا تو جاوید نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ زرینہ کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی اور جاوید جان گیا کہ اس کی ناراضی میں پہلی دراڑ پڑ گئی ہے۔ وہ صادق بھائی کے ساتھ ہی ان کے گھر سے باہر نکلا اور ان سے رخصت ہو کر جھٹ اپنے فلیٹ پر پہنچا اور زرینہ کو ایک بار پھر ایس ایم ایس کیا: ''سوری''۔ اس مرتبہ اس کا جواب آیا: ''اوکے''۔ جاوید نے جھٹ اس کا نمبر ملا لیا۔

''سوری... وہ مجھ سے انجانے میں وہ سب کچھ ہو گیا۔ آئی پرومس بائے گاڈ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''اور کچھ؟''

''بس آپ ناراض نہ ہوں۔ سوری میں نے آپ کو ہرٹ کیا۔''

''تم اچھی فیملی کے ہو۔ تمھیں تو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔''

''بس اکیلا رہتا ہوں نا، اس لیے کبھی کبھی ڈسٹرب ہو جاتا ہوں۔''

''اکیلا رہتا ہوں، اس لیے ڈسٹرب ہو جاتا ہوں!'' زرینہ نے پیار سے ڈانٹتے ہوئے اس کے الفاظ کی نقل کی۔

''بلیو می۔ میں ایسا بالکل نہیں ہوں جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔''

''ہممممم۔ تم نماز وماز پڑھتے ہو؟''

''نہیں۔ بس جمعے کی پڑھ لیتا ہوں،'' جاوید نے جواب میں جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے کہا۔

''نماز پڑھا کرو نماز۔ وہ ایسے خیالات سے دور رکھتی ہے۔''

''اچھا۔ جیسے آپ کہیں گی ویسے ہی کروں گا،'' جاوید مسکراتے ہوئے بولا۔

''ویسے تم اکیلے رہتے ہو نا، اسی لیے کچھ بگڑ گئے ہو،'' اس بار وہ شوخی سے بولی۔

''سوری بھی تو کر لیتا ہوں نا۔''

''اچھا، اب یہ موبائل وو بائل پر کال مت کرنا۔ جب مجھے بات کرنا ہو گی میں خود بات کر لوں گی۔''

''ٹھیک ہے جی۔''

25

تین چار روز بعد ایک روز وہ کھڑکی میں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اس نے موبائل اٹھایا اور کال ملائی۔ بیل خود اسی کے موبائل پر بجی۔ زرینہ نے اسے کہا کہ مجھے کوئی چیز منگوانی ہے، تم جلدی سے میرے ہاں آ جاؤ۔ جاوید نے جلدی سے پاجامہ اتار کر پینٹ شرٹ پہنی اور اس کے دروازے پر جا پہنچا۔ دروازہ کھلا، وہ سامنے آئی اور اسے جھٹ اندر کر لیا۔ جاوید نے جھٹ مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ زرینہ نے اس سے ہاتھ ملایا اور دونوں اندر چلے گئے۔ اس کی خوشبو کو اپنے اس قدر قریب پا کر جاوید نہال ہو رہا تھا۔ زرینہ نے اسے پیسے پکڑائے، پھر اس کے سامنے کاغذ پر کچھ چیزوں کے نام لکھنے لگی جو اسے منگوانی تھیں۔ اس دوران جاوید اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کے بھرے بھرے گالوں کے درمیان مسکراہٹ ایسے تیرتی تھی جیسے رات بادلوں کے درمیان چاندنی تیرتی ہے۔

اس نے پرچی اسے پکڑائی اور ایک بار پھر اس سے ہاتھ ملایا۔

''آپ نے کہا تھا کہ میں...'' وہ ملتجی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اچھا بھئی کر لو۔'' اس نے اپنی کہنیاں اپنے سینے کے آگے رکھ لیں اور جاوید نے اسے خود سے چمٹا لیا اور اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ زرینہ نے اپنی کہنی نیچے کر کے نکالی اور اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اسے کہا، ''چلو شاباش، اب جاؤ۔'' لیکن اس دوران اس کے ہاتھ کی پشت اسے ایک ایسی جگہ جا کر لگی تھی کہ جاوید کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ شاید زرینہ اس کے شوق کا اندازہ لگانا چاہ رہی تھی۔

جاوید تا دیر اس معانقے اور زرینہ کے ہاتھ کے لمس کے اثر میں رہا۔ خریداری کے بعد وہ واپس آیا تو زرینہ نے دروازے سے ہی شاپنگ بیگز پکڑے اور اسے باہر ہی سے چلتا کر دیا۔

26

صادق بھائی اپنے آخری خواب کے باعث کئی روز سے پریشان تھے۔ اس رات انھوں نے اپنا خواب زرینہ کو بتایا۔ زرینہ نے ان کا خواب بہت دلچسپی سے سنا، لیکن صادق بھائی کی آخری بات سن کر وہ چونک گئی۔

''مجھے لگتا ہے کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔''

''کون؟ کون دیکھ رہا ہے ہمیں؟''

کوئی دیکھ رہا ہے۔ تمھیں بھی اور مجھے بھی۔ جب ہم کرتے ہیں تب بھی ہمیں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اب بھی دیکھ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے،'' صادق بھائی نے کہا اور اپنے خواب کے ساتھ ساتھ اپنا خوف بھی زرینہ کے سپرد کر دیا۔ زرینہ نے اگلے دن جاوید کو کسی بھی قسم کی ملاقات سے سختی سے منع کر دیا۔

27

مشعال سے اس کا رومانس اس کے ایک مشہور ون لائنر سے شروع ہوا تھا۔ وہ اس کے چینل میں رپورٹر تھی اور دوسرے اور دوسری رپورٹرز سے الگ یوں کہ جینز پر ایک کُرتی پہنتی تھی۔ کبھی کبھی شرٹ بھی پہنتی تھی جس کے ایک سے دوسرے بٹن کے درمیان جھانکا بھی جا سکتا تھا۔ وہ اپنے نام کے انگریزی اسپیلنگ Mischaulle لکھتی تھی جس سے لگتا تھا کہ وہ اپنے مشرقی نام کو بھی فرنگی رنگ میں رنگنا چاہتی ہے۔

جاوید نے اپنے شوق کا اظہار اس کی جانب مسکرا کر دیکھنے سے کیا تھا اور اسے اس کا جواب بھی مسکراہٹ سے ملا تھا۔ اس کے بعد دونوں میں آتے جاتے ہیلو ہائے ہوتی رہی۔ اس کے بعد دونوں نے دو تین مرتبہ کینٹین میں اکٹھے چائے پی جس کے دوران دونوں کی مشترکہ دلچسپیاں زیرِ غور آئیں۔ اسے ویسٹرن میوزک کا شوق تھا اور جاوید کو فلموں کا۔ لیکن ان کے تعلق کو ایک نیا موڑ جاوید کے اس مشہور ون لائنر سے ملا تھا، جس کا تذکرہ کچھ دیر پہلے کیا گیا ہے۔

اس روز وہ جینز کی پینٹ اور ایک شرٹ میں ملبوس تھی جس کے دامن کو اس نے جینز سے باہر نکال کر اس کی گٹھان لگائی ہوئی تھی۔ وہ دونوں کینٹین میں تھے اور مشعال کوک لینے کے لیے کینٹین کے فریج کو کھول رہی تھی کہ جاوید اس کے قریب ہوا اور اس کے کان کے قریب جا کر ایک ون لائنر پھینک کر چلتا ہوا آگے بڑھ گیا:

"I wonder if your bum is as cute as it looks."

حیرت اور پھر حیا سے مشعال کے گال تمتما اٹھے اور وہ جاوید کے پیچھے دوڑی اور اس کی کمر پر دو تین مکے رسید کیے۔ جاوید نے اپنا دفاع کرنے کی جعلی سی کوشش کی لیکن اب وہ بھی ہنس رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا تیر نشانے پر لگا ہے اور اب اسے مزید دو تین ہفتوں تک آمنے سامنے اور ایس ایم ایس پر واٹس اپ، ہائے ڈوڈ اور لانگ ٹائم نو سی کا کورس کرنا ہے۔ پھر بھی وہ جانتا تھا کہ ان لڑکیوں سے دوستی بہت زیادہ آگے تک نہیں جا سکتی اور وہ کسی نہ کسی مرحلے پر کمٹمنٹ ضرور مانگتی ہیں۔ اس نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اس سلسلے میں اردو میڈیم والی لڑکیوں کو گھیرنا آسان ہوتا ہے اور وہ زرینہ کو بھی انھی میں سے ایک سمجھا تھا۔ زرینہ نے اس سے تعاون بھی بہت کیا تھا لیکن آخری مرحلے پر ایک اڑچن سی آ گئی تھی۔ وہ مرحلہ طے نہ کر پانے کے سبب زرینہ کے لیے جاوید کا رومانی اور جبلی تناؤ بڑھتا جا رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر اس تناؤ کو کوئی راستہ نہ ملا تو وہ زرینہ میں جذباتی طور پر بھی انوالو ہو جائے گا۔ اس سب کے باوجود شادی کے لیے اسے مشعال ہی بہتر لگتی تھی اور وہ اس بات پر مطمئن تھا کہ اس سے منگنی کے بعد ہی آخری مرحلہ طے کیا جائے۔ مشعال ایک ایسی دعوت تھی جس کی طرف بڑھنے کے لیے ایک آہستہ روی کی ضرورت تھی اور یہ آہستہ روی زرینہ سے خوب اچھی طرح پیٹ بھر کر ڈکار لینے کے بعد ہی ممکن ہو سکتی تھی۔

مشعال سے اپنے تعلق کو وہ محبت ماننے پر تیار تھا لیکن زرینہ کے لیے اس کا حیاتیاتی اشتعال

اب جذباتی اشتعال میں بدلتا جا رہا تھا۔ وہ اس زرینہ کو بخشنے پر بالکل تیار نہ تھا جو اسے سیکنڈری مراحل کی طرف بڑھنے نہیں دے رہی تھی اور اس کے لیے ایک نہایت بودی سی دلیل کا سہارا لے رہی تھی۔ زرینہ کا کہنا تھا کہ اگر وہ صادق بھائی سے بے وفائی کی مرتکب ہوئی تو وہ اسے جلا کر راکھ کر دیں گے، کیونکہ صادق بھائی دراصل انسان نہیں، ایک جن ہیں۔

28

زندگی تجربے سے ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہے۔ لیکن ہم تجربے سے جو بھی کچھ سیکھنا چاہتے ہیں، وہ بہت جلد سیکھنا چاہتے ہیں۔ سیکھنے کی یہ جلدی جنرلائزیشن اور پھر اوور جنرلائزیشن کو جنم دیتی ہے۔ جاوید اقبال نے یہ جو طے کر رکھا تھا کہ اردو میڈیم لڑکیوں کو گھیرنا اور پھر ان سے آخری مرحلے تک استفادہ کرنا نسبتاً آسان کام ہے تو یہ بھی اس کے ذہن کی ایک جنرلائزیشن ہی تھی اور جس کا سبب وہ دو ایک کامیابیاں تھیں جو اسے اردو میڈیم لڑکیوں میں حاصل ہوئیں۔ ورنہ اس کا یہ کلیہ بس ایک جنرلائزیشن تھی جو اتنی ہی صحیح ہو سکتی تھی جتنی کہ غلط۔ بلکہ اس نے یہ جو مخصوص لڑکیوں کی اپنے ذہن میں درجہ بندی کر کے انھیں 'اردو میڈیم' لڑکیوں کا نام دے ڈالا تھا، تو یہ بھی ایک جنرلائزیشن ہی تو تھی۔

اپنے تجربات سے کلیے تشکیل دینے سے انسان کو اپنی زندگی سمجھنے میں مدد ملتی ہے، چاہے اس کی تفہیم کسی غلط فہمی پر ہی مبنی کیوں نہ ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی اور شخص نے ایسی ہی جنرلائزیشن 'انگلش میڈیم' لڑکیوں کے بارے میں کر رکھی ہو۔ سو باقی لوگوں کے لیے یہ قطعی ضروری نہیں کہ وہ لڑکیوں کے بارے میں جاوید اقبال کے اس کلیے کو سنجیدگی سے لیں۔ لیکن جاوید اقبال کی شخصیت اور خصوصاً زرینہ سے اس کے معاملے کو سمجھنے کے لیے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اس نے دوسری جنس کے حوالے سے اپنے ذہن میں کون سا کلیہ طے کر رکھا تھا۔

29

وہ دسمبر کا ایک دن تھا جب صادق بھائی نے مجھے بتایا کہ انھوں نے بیل سوار جوان کو پھر اپنے خواب میں دیکھا ہے کہ وہ ہاتھ میں تلوار اٹھائے لوگوں کو ناحق قتل کرتا پھرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھوں

نے اسے ایک مرتبہ پھر ایک مزار میں داخل ہوتے اور پھر وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ مزار کہاں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مزار دیکھ کر انھیں یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ مزار انھوں نے کہیں نہ کہیں دیکھ رکھا تھا، لیکن خواب سے بیدار ہونے کے بعد انھوں نے غور کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ وہ کراچی کا کوئی مزار نہیں تھا۔ میں نے ان کی دلجوئی کی اور ان سے کہا کہ وہ ایک فہرست بنا لیں کہ وہ اب تک پاکستان میں کن کن مزارات پر جا چکے ہیں۔ اس پر انھوں نے خوش ہو کر ہامی بھر لی۔ اگلے ہی روز وہ ایک لمبی سی فہرست بنا کر لے آئے جس میں کراچی، لسبیلہ، حیدر آباد، خیر پور، سکھر، بہاولپور، ملتان، پاک پتن، لاہور، جہلم، کھڑی شریف، راولپنڈی اور اسلام آباد وغیرہ کے کم و بیش پچاس مزارات کے نام تھے۔ ان میں سے کچھ کے نمبر شمار کے گرد انھوں نے دائرہ لگا رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ مزار ایک معروف سڑک کے کنارے تھا۔ ایک آدھ روز مزید غور و فکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ مزار راولپنڈی کی کمیٹی چوک کے قریب حضرت شاہ جہاں محمد بادشاہ کا مزار تھا۔

بزرگ کا نام سن کر میں چونکا۔ یہ نام تو کسی بزرگ سے زیادہ کسی بادشاہ کا نام لگتا تھا۔ بہر حال صادق بھائی نے مجھے بتایا کہ وہ اب اس بیل سوار جوان کی تلاش میں راولپنڈی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے یہ تو ضرور پوچھا کہ اگر بیل سوار جوان انھیں مل بھی گیا تو وہ اسے قتل و غارت گری سے کیسے روک پائیں گے، لیکن انھوں نے سنی ان سنی کر دی۔ میں نے انھیں راولپنڈی میں مقیم اپنے بھائی آفتاب کا موبائل نمبر دیا اور ان سے بات بھی کرا دی۔ آفتاب بھائی نوکری سے استعفے کے بعد پنڈی میں دو کمروں کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہ رہے تھے، لیکن انھوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ صادق بھائی کا میزبان بننے کی پیشکش کر دی۔

30

اب اس کے پاس موقع تھا کہ وہ زرینہ کے سلسلے میں باقی ماندہ منزلیں طے کر لیتا۔ بائیس دسمبر کو صادق بھائی گئے تو رات کو زرینہ نے موبائل پر دیر تک بات کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ صادق بھائی کا فون آتا ہی ہوگا اس لیے انھیں لائن فری ملنی چاہیے۔ اگلے روز دوپہر کو جب گلی میں سناٹا تھا، وہ گھر سے نکلا اور ادھر اُدھر احتیاط سے دیکھتا اپنے سامنے والے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر زرینہ کے

دروازے پر دستک دے بیٹھا۔ زرینہ نے دروازہ کھولا تو وہ اسے دھکا دیتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ زرینہ اس پر ناراض ہوئی اور اسے کہا کہ وہ فوراً وہاں سے چلا جائے۔ جاوید نے اس سے گلے ملنے کی شرط پر اس کی بات منظور کی۔ اس مرتبہ زرینہ کی بانہیں درمیان میں نہیں تھیں اور اس نے اپنے بازو اس کے کندھے کے گرد کر دیے تھے۔ اس کا اپنا سر زرینہ کی گردن کے پیچھے تھا۔ اس نے وہاں اپنے ہونٹ رکھے اور فوراً ہی پوچھ لیا کہ صادق بھائی کب آ رہے ہیں۔ زرینہ نے بھی معاملے کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور اسے کوئی مناسب سا جواب دے دیا اور پھر اس کے کندھوں پر موجود اپنے ہاتھوں سے ہی اسے خود سے ذرا سا ہٹا لیا۔ جاوید نے بھی مزید کوشش مناسب نہ سمجھی اور وہاں سے چلا آیا۔ اس رات وہ موبائل پر دیر تک زرینہ سے باتیں کرتا رہا اور اسے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ بس اسے اندر تک دیکھنا چاہتا ہے اور بس۔ زرینہ انکار کرتی رہی لیکن آخر مان گئی اور یہ شرط لگا دی کہ جاوید صرف دیکھے گا اور کچھ نہیں کرے گا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق جاوید نے فوراً ہامی بھر لی۔ زرینہ نے اسے کہا کہ وہ موقع دیکھ کر خود اس کے فلیٹ میں آئے گی۔ وہ اس فلیٹ میں صرف ایک دفعہ پہلے آئی تھی جب جاوید کی امی کراچی آئی ہوئی تھیں۔

اگلے روز صبح نو بجے کے قریب اس نے اپنے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے جاوید کو اشارہ کیا اور پھر کھڑکیاں بند کر دیں۔ جاوید نے اپنے فلیٹ کے بیرونی کمرے کے دروازے کی چٹخنی کھولی اور اسے بھیڑ کر انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد قدموں کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی اور اس کے دروازے کے پاس آ کر رک گئی۔ پھر دروازہ آہستہ سے کھلا اور جاوید نے زرینہ کو جلدی سے اندر کر کے کنڈی لگا لی۔ جاوید نے وہیں زرینہ کو خود سے چمٹا لیا اور اندر اپنے سونے کے کمرے میں لے گیا۔

"ذرا صبر تو کرو جاوید۔ یہ تم نے تصویریں کیوں لگا رکھی ہیں اتنی ساری؟ اور وہ بھی سب کرینہ کی؟" زرینہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی۔

"ابھی بتاتے ہیں... سب بتاتے ہیں..." جاوید نے جواب دینا مناسب نہ سمجھتے ہوئے کہا اور اس کی قمیض اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ زرینہ اس کی مزاحمت کرنے لگی۔ اس نے زرینہ کو بستر پر گرا دیا اور اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کی بریزیئر میں ڈال دیا اور دوسرے سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر غصے اور خواہش کی ملی جلی سرخی پھیل

گئی۔ زرینہ کی مزاحمت زیادہ ہوئی تو جاوید نے اپنے دائیں ہاتھ سے اس کا منہ زور سے پیچھے کیا۔ اسے قمیض اتارنے میں دقت محسوس ہوئی تو وہ شلوار کی طرف متوجہ ہوا اور اسے نیچے کی طرف کھینچنے لگا۔ زرینہ کی آنکھوں میں خوف جھانکنے لگا۔

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم وہ نہیں کرو گے!" زرینہ ڈرتے ہوئے بولی۔

"اور تم نے بھی وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے اپنا آپ دکھاؤ گی۔ سارے کا سارا۔"

"بس وہیں سے ہی دیکھ لو نا۔"

"دیکھا تو ہوا ہے کافی سارا۔ باقی میں کیا فرق پڑتا ہے؟"، جاوید نے غصے سے اپنے دانت بھینچتے ہوئے محسوس کیے۔

زرینہ نے اپنے اندر ایک عجیب سی لہر اچھلتی ہوئی محسوس کی اور اس نے مزاحمت ترک کر دی۔ جاوید "کیا فرق پڑتا ہے؟ ہیں؟ کیا فرق پڑتا ہے؟!" کہتے ہوئے اس کی قمیض اتارنے لگا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر دیے اور مزید مزاحمت نہیں کی۔ جاوید نے زرینہ کو دوبارہ سے بستر پر پھینکا اور اس کے سارے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"دیکھو بس کرو۔ کوئی آ جائے گا۔ دیکھو تم نے دیکھ تو لیا ہے۔ اب مجھے جانے دو۔" وقفے وقفے سے زرینہ کی آواز خاموشی کو توڑتی رہی۔ لیکن جاوید کے لمس سے وہ اپنے اندر بھی ایک بے قراری محسوس کر رہی تھی۔ پھر اس کی بے قراری بڑھ گئی اور اس نے جاوید کو زور سے پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ جاوید اپنے پورے جسم کے وزن اور زور کے ساتھ اس کے جسم پر امڈا ہوا تھا اور اسے پیچھے ہٹانے میں اسے کامیابی نہ ہوئی تو غصے کی ایک تیز لہر زرینہ کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے جاوید کے چہرے کو زور سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا، "ہٹ پیچھے..... بہت ہو گیا۔ ہٹ پیچھے... میں کہتی ہوں ہٹ۔ منحوس!" اس نے ہاتھوں کے بعد اپنی ٹانگوں کے زور سے بھی اسے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔

جاوید نے غصے میں اس کے بالوں کی چوٹی پکڑ لی اور اس کی ٹانگیں اوپر کرنے لگا۔ زرینہ نے اسے لات ماری مگر وہ دوبارہ اس پر چڑھ آیا۔ زرینہ نے غصے سے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور پھر والہانہ انداز میں اسے چومنے لگی۔ ان کے منہ ایک دوسرے سے مل گئے۔ جاوید نے ایک ہاتھ سے اس کی بائیں ٹانگ اوپر کی اور پھر اس کا چہرہ چھوڑ کر اس کی گود میں جگہ بنانے لگا۔ جگہ بنتے ہی

زرینہ کی مزاحمت ماند پڑ گئی اور اس نے اپنے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس کا سر بستر کے ایک کنارے سے نیچے کو ڈھلکا ہوا تھا اور اس کی گردن لمبی ہو کر بستر کے کنارے پر لٹکی ہوئی تھی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر چھت پر کسی چیز کو گھور رہی تھی۔

"کتے زور سے مار..." پہلے کچھ دھکوں کے بعد اسے زرینہ کی آواز آئی جس نے منہ بھینچا ہوا تھا اور اسی بھینچے ہوئے منہ سے اس کی آواز نکلی تھی۔

جب وہ بہہ چکا تو زرینہ کی غصے سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے ایک موٹا سا آنسو پھسل کر اس کے رخسار سے ہوتا ہوا اس کی گردن سے لپٹ گیا۔ اس نے ایک آدھ بار شکایتی نظروں سے جاوید کی طرف دیکھا اور اس کے اور بھی آنسو امڈ آئے۔ اب اسے کپڑے پھر سے پہننے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ جاوید فرج سے ٹھنڈا پانی نکال کر لایا اور اسے پلانے کی کوشش کی۔ مگر وہ روتی رہی۔ جاوید نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا اور پھر اس کا منہ چومنے لگا۔

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم وہ نہیں کرو گے۔"

"میرا تو یہی ارادہ تھا لیکن تم نے قمیض اتارنے میں اتنی مزاحمت کی کہ میں فل ٹائم گرم ہو گیا۔"

"قمیض اتارنے سے مجھے شرم آ رہی تھی۔" کچھ یاد آنے پر زرینہ پہلی مرتبہ مسکرائی۔

"کیوں؟"

"میرا ایک ٹھیک ہے اور دوسرا لٹکا ہوا ہے۔ اس ڈس بیلنس پر مجھے شرم آتی ہے،" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کچھ حیا سے، کچھ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اس میں ایسی پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"میں ہمیشہ سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ کئی سے بھی پوچھا مگر تشفی نہیں ہوئی۔ بتاؤ نا، تم مردوں کو یہ ڈس بیلنس کیسا لگتا ہے؟"

"اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ بیلنس ہو یا ڈس بیلنس۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یار، میں ساری عمر اس بارے میں پریشان رہی اور تم کہتے ہو کہ فرق ہی نہیں پڑتا!" یہ انکشاف کرتے ہوئے اس کے گالوں پر حیا کی لالی سی پھیل گئی۔

"فرق پڑتا ہے یہاں سے،" جاوید نے اپنا ہاتھ اس کے کولھوں کے نیچے لے جاتے ہوئے

کہا۔"اب پوچھو نا کہ میں نے کرینہ کی اتنی زیادہ تصویریں یہاں کیوں لگائی ہوئی ہیں؟"

"کیوں لگائی ہوئی ہیں؟"

"اچھی لگتی ہے۔ اور تم سے ملتی بھی بہت ہے۔"

"ہاں! مجھے بھی کئی لوگوں نے کہا ہے،" زرینہ نے شوخی سے کہا۔

"اور میں تمھیں زرینہ کرینہ کہتا ہوں۔"

جاوید نے اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا اور اپنے اندر ایک وحشی لہر کو پھر سے ابھرتے ہوئے محسوس کیا۔

زرینہ چلی گئی تو جاوید نے خود کو بہت پرسکون محسوس کیا۔ اب مشعال کی طرف بڑھنے کی پلاننگ زیادہ بہتر طریقے سے اور سکون کے ساتھ کی جاسکتی ہے، جاوید نے سوچا۔

دفتر سے واپسی پر جاوید نے مشعال کو ایس ایم ایس کیا۔ دونوں کافی دیر ایس ایم ایس کا تبادلہ کرتے رہے۔

31

Hi. Whats up?
Fine. Tum sunao
Bus leta tha. Socha tum se baat kr loon.
Kya kar rahi ho?
Bas abhi mehman aye huay thay.
Mamu, mumani aur cousins
Cousins main kon kon hai
Aik bhai hai aur do us ki sisters
Kyon? Tum kyon poch rahay ho?
Jealous : hahaha
Han bhai nazar rakhna parti hai tum per
Kya pata kab koi cousin tumhen offer maar day
Lol. Aray woh chota hai mujh se
To phir aisa kartay hain ke
Us ke hath main tumhen khat bheja karun ga
Lol

Hahahahahahahaha
Aray khat wat ka zamana hua purana
Now you can say whatever you want
Kuch bhi keh dun
Hmm. Bas badtameezi na ho
Otherwisse its fine.
Brb
Aray kahan chalay gaye
Yar aik phone aa gaya tha
Kis ka tha :
Ammi ka tha. Tumhen salam keh rahi theen
Ammi ko mera pata hai?
Han. Zikr to kiya tha tumhara
To phir kya boleen.
Unhon ne tumhen TV per dekha hai.
She likes you
Oh really? :
Acha tum kuch kehnay walay thay
Yes she likes you
But not more than me
You mean you like me?
Bas yehi baat batani thi?
Nahi. Aur bhi baten hain
Maslan?
Phir bataun ga na. Kisi din
Bethtay hain chaye waye per
Nahi abhi batao
Actually
Dekho yeh baat kisi aur ko na batana
Pehlay promise karo
Aray we are friends yar
Kisi aur ko nahi bataun gi
Promise. God promise
Actually I think that
You are a very good girl
I think you can be my lifelong frnd
Bolo na. chup kyon ho gaye?

I am listening
Actually
I want to marry you
Hahahahahhahahahahahah
Hahahahahhahahahh
Are you serious??
Acha main tumhen call karta hun
Nahi don't call.
Mama jaag jayen gi
Why are you laughing?
Tum ne baat hi itnay mazay ki ki hai
No. I am serious
Plz reply.
Kya tumhen waqai hansi aa rahi hai?
I am serious
Plz reply. What do you think abt it?
Plz isay non serious na lena
I am damn serious
:
Smile nahi. Give me a reply
Itni jaldi kya hai Javed?
But tum angry to nahi ho na?
Not at all
Do you think we can be lifelong friends?
Tum achay larkay ho
You are from a good family
Aur I also like you
But aisi batay to baray hi kartay hain na?
Aray baray bhi baat kar layn gay.
Pehlay tum to batao
Tum to ok ho na?
Sab baten abhi se bata doon?
Haan abhi batao
Mujhe be cheni ho rahi hai
Acha baba. I am ok
Hurrrahhhhhhhhhh
Can I call you now

Ulllоооо. Abhi mama soi hu hain
Kal baat kartay hain
Kal tum bhool to nahi jao gi :ıa?
Kya?
That you have agreed?
Ok baba. Ok
Now go to sleep
To kya nahi bhoolo gi?
Acha baba
Yehi ke I have agreed.
Bas? Ab khush?
Bilkul khush.
Ok bbye
Tc
Take care Misha

32

مشعال سے موبائل پر چیٹنگ کے دوران اسے جو فون آیا وہ زرینہ کا تھا۔ جاوید کو اس کے فون پر اتنا غصہ آیا تھا کہ اس کا جی چاہا کہ اس کا سر پھاڑ دے۔ مشعال سے آج پہلی مرتبہ کھل کر بات کرنے کا موقع ملا تھا اور زرینہ کباب میں ہڈی بن کر ٹپک پڑی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر زرینہ کا فون ریسیو نہ کیا تو وہ پھر فون کرے گی۔ اس نے ہیلو بولا تو زرینہ کی تشویش بھری آواز سنائی دی۔

''جاوید! تمھیں اتنی دیر سے ایس ایم ایس کر رہی تھی۔ جواب کیوں نہیں دے رہے تم؟''

جاوید کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ اس کا جواب سوچ چکا تھا۔

''سر میں بہت درد ہو رہی تھی۔ سلیپنگ پِل لے کر سویا تھا۔ ابھی بھی نیند آ رہی ہے۔'' اس نے بہانہ بنایا۔

''میں دبا دوں ں ں؟؟'' زرینہ نے پیار سے کہا اور جاوید کا جی چاہا کہ فون وہیں بند کر دے۔

''بس سو جاؤں تو صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا،'' وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا

''اچھا سو جاؤ۔ کل بات ہوگی۔ ہیو سویٹ ڈریمز،'' زرینہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جاوید سمجھتا تھا کہ زرینہ کے ساتھ شاد باد منزل مراد کے بعد اسے ہی زرینہ کو ایس ایم ایس اور فون کرنا ہوگا اور زرینہ اسے شروع شروع میں کچھ ہچکچاتی ہوئی ملے گی۔ اب اس نے زرینہ کی جانب سے خود اشتیاق دیکھا تو اس کو دھچکا سا لگا۔ اسے زرینہ کچھ بری بری سی لگی۔ اور آخر میں اس نے جس انداز میں اسے 'میں دبا دوں' کہا تھا وہ تو اسے بہت ہی واہیات لگا تھا۔

33

اگلے روز جاوید مشعال کو ڈیٹ پر لے جانے کی دعوت دینے کے لیے کوئی اچھا سا جملہ سوچ رہا تھا کہ اسے مشعال کا ایس ایم ایس ملا کہ منزل چینل نے اس کا آڈیشن او کے کر دیا ہے اور وہ اب خود اینکر بننے والی ہے۔ یہ ایس ایم ایس پڑھتے ہی جاوید کے دل پر دھکا سا لگا۔ وہ مشعال کی کامیابی کا متمنی بھی تھا اور اس کے ساتھ شادی کرنے کے فیصلے کی وجہ بھی یہی تھی مگر اسے اینکر کے روپ میں سوچ کر اس کی چھٹی حس نے اسے کچھ اچھے سگنل نہیں دیے تھے۔ مشعال اس روز آفس بھی نہیں آئی اور ای میل کے ذریعے ہی اپنا استعفیٰ ارسال کر دیا۔ جاوید نے رات کو اسے فون کیا تو وہ بہت جوبیلنٹ تھی۔ ''جاوید، مائی ڈریم آف لائف ہیز کم ٹرو۔ جاوید، میں تمھیں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنی خوش ہوں۔'' مشعال نے اگلے ہی روز جوائننگ دی اور شام چھ بجے کی خبروں میں وہ منزل ٹی وی پر نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہلکی گلابی ٹی شرٹ پر گہرے گلابی رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ دفتر میں سب لوگ حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا۔ جاوید خاموشی سے یہ سب دیکھ رہا تھا اور دفتر کی جوبیلیشن میں خود کو شریک نہیں پا رہا تھا۔ اس نے خود سے پوچھا بھی کہ آر یو جیلس؟ اور جواب میں خود کو یہ بتا کر اطمینان دلایا کہ اسے مشعال کا آؤٹ فٹ کچھ مناسب محسوس نہیں ہو رہا تھا جس کی ٹی شرٹ میں سے اس کے بریزیئر کا ابھار ایک سمت سے نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ رات مشعال سے بات ہوگی تو اس کی نشاندہی کر دے گا۔ مگر دوسرے روز مشعال پہلے روز سے بھی زیادہ جوش میں ملی۔ اسے پورے ملک سے مبارکباد کے فون اور ایس ایم ایس آ رہے تھے اور محلے بھر کی امائیں اپنے نوجوان بیٹوں بیٹیوں کو سخت سست کہہ کر مشعال کی مثالیں دے رہی تھیں جس سے مشعال کے ماما پاپا کا سر فخر سے اونچا ہو گیا تھا۔ اس سے اگلی رات جاوید کو مشعال کا موبائل بزی ملا۔ وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا سو رہا۔ اگلے

روز مشعال نے اسے بتایا کہ سینیٹر وسعت اللہ کا کل شام ہیپر لیا تھا۔ اس کی لائن اسٹوڈیو میں دی گئی تو اس نے اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیے اور کہا کہ کسی بھی قسم کا کوئی کام ہو تو بندہ حاضر ہے۔ وہ بلیٹن کے بعد باہر آئی تو سینیٹر کے نمبر پر 'تھینک یو' لکھ کر اپنا نام لکھ بھیجا۔ سینیٹر نے اسے فوراً کال بیک کیا۔ جس وقت جاوید مشعال کو فون کرتا تھا، اس وقت سینیٹر کی کال آئی اور مشعال کے بقول 'وہ جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا'۔ حقیقت یہ تھی کہ مشعال کے بھائی کے پری میڈیکل میں ایڈمشن کا مسئلہ تھا اور مشعال نے بات چیت کے دوران اس کا ذکر چھیڑا تھا۔ مشعال سینیٹر کا ذکر بڑے طنزیہ انداز میں کرتی رہی تھی۔ کہتی تھی کہ وہ مجھے امپریس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹیکسس کی رانچز میں اپنی چھٹیوں کا ذکر چھیڑتا، کبھی وائٹ ہاؤس کے لان میں بش کی بیٹی سے گپ شپ کا قصہ سناتا۔ ''میں بھی بس جی جی کرتی رہی۔ اپنا کام جو نکلوانا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ٹیکسس میں اس کے ایک دوست کی رانچ اتنی بڑی ہے کہ ان میں وہ دونوں چار پانچ گھنٹے تک گھوڑا دوڑاتے ہوئے لے جاتے ہیں۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ مجھے رائیڈنگ آتی ہے۔ ہاہاہا۔ کہنے لگا کسی دن ساتھ کریں گے رائیڈنگ۔ ہاہاہا!''

''ہاں ہاں، کرو اس کے ساتھ رائیڈنگ! رائیڈنگ کا مطلب بھی پتا ہے تم کو؟'' جاوید نے جلے کٹے لہجے میں اس سے کہا۔

''رائیڈنگ مینز ہارس رائیڈنگ! سمپل! اس میں ایسی کون سی بات ہے،'' وہ بولی۔

''مجھے تو یہ سینیٹر کچھ ٹھیک آدمی نہیں لگ رہا۔ تم اسے اوائیڈ نہیں کر سکتیں؟''

جاوید کی اس بات پر دوسری جانب کچھ خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد جاوید نے خود ہی ہیلو کہا تو مشعال بولی:

''دیکھو تم پڑھے لکھے ہو۔ ایک اچھی فیملی سے ہو۔ میں ایک پروفیشنل ورکنگ وومن ہوں۔ تمھیں ذرا براڈ مائنڈڈ ہونا چاہیے۔''

''نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے مشعال۔ میں صرف تمھیں بتا رہا تھا کہ یو ہیو ٹو ریمین آن گارڈ،'' جاوید نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تمھارا کیا خیال ہے، میں کوئی بچی ہوں؟ کیا میں اتنی اِم میچور ہوں؟ کیا میں کوئی تھرڈ کلاس ماسی ہوں جو امپریس ہو جاؤں گی؟'' فون پر اس کی آواز میں اس کے لائیو بیپر جیسا طنطنہ تھا۔

''نہیں، میچور تو تم ہو۔ اسی لیے تو میں تم سے امپریسڈ ہوں،'' جاوید نے معاملہ سنبھالتے ہوئے کہا۔

''بٹ آئی ایم ناٹ امپریسڈ!''

''وِدی؟''

''تو! بٹ وِد آل دیٹ ُریمین آن گارڈ' ٹائپ آف کریپ...''

جاوید نے اس کا موڈ اچھا کرنے میں کچھ کامیابی کے بعد فون بند کیا تو اس کے فون پر زرینہ کی تین مس کالز آئی ہوئی تھیں۔ اس نے اسے کال بیک کیا۔

''جی فرمایئے زرینہ دی کرینہ...''

''تمھیں ایک بات بتانی تھی۔''

''جی بتایئے،'' جاوید نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ مشعال سے چک چک کے بعد اس کا جی کوئی رومینٹک بات سننے کا چاہ رہا تھا۔

''وہ۔ مجھے لگتا ہے گُگی کو پتا چل گیا ہے۔''

''کیا پتا چل گیا ہے؟''

''تمھارے بارے میں۔ اور ہمارے بارے میں۔''

''کیا پتا چل گیا ہے؟''

''وہ مجھے فون پر کہہ رہے تھے کہ انھوں نے ایک خواب دیکھا ہے جس میں کوئی آدمی میرے ساتھ سیکس کر رہا ہے۔''

''ہاہاہا!''

''اور... اور... اس آدمی کی شکل جاوید سے ملتی ہے۔''

''ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ صرف ایک خواب ہی ہو؟''

''نہیں۔ صادق جن ہے۔ مجھے پہلے ہی شک تھا۔ اب تو یقین ہو گیا ہے...'' زرینہ کی آواز میں خوف تھا اور جاوید دیکھ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ہیں۔

''ارے کچھ نہیں ہوگا۔''

''میرا خیال ہے ہمیں اب نہیں ملنا چاہیے۔ میرا مطلب ہے، ویسے نہیں ملنا چاہیے۔''

''او کے۔ ایز یو وِش...'' جاوید کو اس کی بات میں اس سے جان چھڑانے کا موقع نظر آیا اور اس نے اس کا تازہ موقف تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

34

چھ سات روز بعد جاوید نے موقع پا کر اس کے گھر اپنی امی کو بھیجنے کی بات کی تو مشعال نے کہا کہ وہ ایک اور فریم آف مائنڈ میں ہے اس لیے کچھ سوچ کر بتائے گی۔ سوچ کر اس نے یہ ایس ایم ایس کیا کہ اس معاملے میں دو ماہ رک جایا جائے تو بہتر ہوگا۔ اگلے روز وہ دفتر میں کنکھیوں سے مشعال کا بلیٹن دیکھ رہا تھا۔ مشعال کی شرٹ میں سے اس کا بریزیئر آج بھی نمایاں تھا۔ جاوید کو یاد آیا کہ اسے مشعال سے یہ کہنا تھا کہ اس کی شرٹ سے بریزیئر دکھتا ہے۔ مگر مشعال نے اسے براڈ مائنڈڈ نہ ہونے کا جو طعنہ دیا تھا اس کے بعد وہ اس سے یہ بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مشعال بہت خوبصورت لگ رہی تھی اور بہت خوش بھی۔ وہ اپنی کرسی پر آگے کو ہو کر اور کمر کو سیدھا تان کر بیٹھی تھی اور اس کی گردن، جسے وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے ایک طرف کو جھکا کر اسے دیکھتی جاتی تھی، سیدھی اور بہت لمبی نظر آ رہی تھی۔ وہ اس گردن کو تاننے والی ناڑ کو دیکھنے اور یہ سوچنے لگا کہ اگلی دفعہ مشعال سے ملے گا تو اس ناڑ کی شفافیت کی تعریف کرے گا اور کہے گا: ''کین آئی ٹچ یو دیئر؟'' اور مشعال حیا سے اسے اپنی چھوٹی سی ہتھیلی سے مارنے کو لپکے گی۔ وہ بنتی ہے۔ بڑی کانفیڈینٹ اور میچور بنتی ہے۔ لیکن جب میں اس سے کوئی خاص بات کہتا ہوں تو کیسے شرما بھی جاتی ہے۔ شی ہیزنٹ لوسٹ ہر فیمی نِنِٹی۔ دیٹس وٹ آئی لائک اباؤٹ ہر۔ اچھی ہے اچھی ہے... چلے گی چلے گی...

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اپنے پیچھے دو لڑکوں کی بات چیت سنائی دی۔ ایک لڑکا کہہ رہا تھا کہ وہ ایک سینیٹر سے سیٹ ہو چکی ہے اور اس نے اسے دفتر میں پھول بھی بھجوائے تھے۔

جاوید کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسے زرینہ پر غصہ بھی تھا مگر وہ زرینہ کو فون کر کے اپنے شک کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس سے بات بگڑ سکتی تھی۔ اسے مشعال کے جسم کے حصے یاد آنے لگے جنھیں وہ بہت پیار کر سکتا تھا۔ اس نے اب تک مشعال کو چھونے کی زیادہ کوشش نہیں کی تھی۔ اس پر اس نے خود کو سخت سست کہا اور طے کیا کہ اب موقع نکلا تو اس کام میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔ غصے اور

خواہش کی شدت میں اسے زرینہ کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر مشعال کا معاملہ تاخیر کا شکار ہے تو زرینہ سے بات چیت ختم نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے زرینہ کا نمبر ملایا۔ حال احوال کے بعد زرینہ بولی کہ وہ آج پیر محمد شاہ بخاری کے مزار پر گئی تھی۔ اس نے وہاں دھاگا باندھا ہے اور سچے دل سے توبہ کرلی ہے۔

جاوید کہنا تو اسے یہ چاہتا تھا کہ وہ بھاڑ میں جائے مگر لہو کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے مشعال کی کال آئی۔

''ہیلو،'' اس نے اداسی سے کہا۔

''کیوں؟ آج فون کرنا یاد نہیں رہا کیا؟''

''نہیں۔ آج تو تم بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ تمھیں بہت مس کررہا تھا۔''

''مس کہاں کررہے تھے؟ جب سے میں اینکر بنی ہوں، سب مجھے وِش کررہے ہیں۔ دور دور سے فون کررہے ہیں۔ کارڈز اور پھول بھجوا رہے ہیں... اور تم؟ وائے یو آر ناٹ ایز جوبی لنٹ ایز آئی ایم؟''

''ہوں۔ اور پھول کون کون بھجوا رہا ہے؟''

''سب۔ بہت سے لوگ۔ اِن فیکٹ کئی لوگ...''

''مثلاً سینیٹر صاحب؟''

''ہاں! ازاٹ آ بگ ڈیل؟ وہ میرے انکل کی عمر کے ہیں فار گاڈز سیک!''

'''کا' یا 'کے'؟''

مشعال کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی:

''جاوید، آئی ہیٹ اِٹ جب تم ایسی چھٹی سوچ کا مظاہرہ کرتے ہو۔''

''لیکن مشعال، میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں؟''

''بٹ آئی نو کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔''

''تمھیں یہی تو نہیں پتا مشعال...''

''جاوید، دیکھو ایک بات سنو۔ مائنڈ مت کرنا۔ دیکھو ہم اب ایک نئی سچویشن میں ہیں۔ ہمیں جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ آئی تھنک ہمیں ایک دوسرے کو تھوڑا ٹائم دینا چاہیے۔ ہم روز بات کریں گے تو روز لڑیں گے۔ وائے ناٹ گیو اِٹ آ بریک؟''

''آ بریک؟ یو مین بات چیت بند کردیں؟''

''جاوید، تمھیں مجھے اب ایک اور بیک گراؤنڈ میں سمجھنے کی کوشش کرنی ہے۔ میں نیوز کرتی ہوں۔ میرا ایم ہے کہ مجھے ایک پروگرام بھی مل جائے۔ آئی تھنک آئی ول بی ایبل ٹو میک سم چینج اراؤنڈ اَس۔ یو نو، ہمارے محلے میں کب سے پانی کا مسئلہ چل رہا تھا۔ آئی جسٹ میڈ آ فون کال اور اب وہاں ایک نئی پائپ لائن ڈل رہی ہے۔ یو سی۔ آئی کین ٹرائی ٹو میک سم ڈفرنس۔''

''یار مشعال، یہ معمولی تبدیلیاں ہیں۔ اس سے کوئی لارجر تبدیلی نہیں آنے والی۔ ایک پرسنل لائف بھی ہوتی ہے۔ اس پر بھی تو فوکس کرنا چاہیے۔''

''بٹ اس لائف میں ایک تھرل ہے۔ اس میں فیڈ بیک ملتا ہے جس سے تھرل اور بڑھتی ہے اور کام کا جذبہ بھی۔ تم بھی ایک رپورٹر ہو۔ یو کین آلسو ٹرائی ٹو برنگ سم چینج۔''

''یار بٹ وائے می؟ ہم نے کوئی ٹھیکا تھوڑی لے رکھا ہے چیزوں کو ٹھیک کرنے کا؟''

''بٹ گیو می سم ٹائم۔ لٹ می سی کہ میں اسے کہاں تک انجوائے کرسکتی ہوں۔ تم پڑھے لکھے ہو۔ چیزوں کو انڈرسٹینڈ کرتے ہو۔''

''آئی نو۔ آئی نو۔ آئی ڈونٹ نیڈ دس ایپری سیئیشن،'' جاوید اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''دیکھو۔ آئی ایم ورکڈ اپ اینڈ آئی نو یو آر ورکڈ اپ ایز ویل۔ تو لٹس گیو اَس آ بریک۔''

''بٹ مشعال!''

''اٹ ول بی گڈ فور بوتھ آف اَس۔ مجھے اگلے روز کی تیاری کرنا ہوتی ہے۔ بٹ آئی فائنڈ مائی سیلف ڈیوٹی باؤنڈ کہ تم سے بات کروں۔''

''ڈیوٹی سمجھ کر کیوں بات کرتی ہو مشعال؟ آئی وانٹ یو ٹو بی ریلیکسڈ۔ جسٹ اپنے کام پر دھیان دو۔ اٹ ول بی او کے وِدمی۔ جب ٹائم ملے، یا ویک اینڈ پر بات کرلیا کرو،'' جاوید نے کہا مگر دل ہی دل میں اس کی خواہش تھی کہ مشعال اس کی بات رد کردے۔ یہ سب کہتے ہوئے اس کے لہجے میں اداسی تھی اور اسے توقع تھی کہ مشعال اس کا وہ مطلب نہیں لے گی جو اس کے لفظوں سے نکلتا تھا۔

''اوہ تھینکس جاوید۔ آئی نیو تم اتنے انڈرسٹینڈنگ ہو۔ اینڈ آر یلسٹ ایز ویل۔''

مشعال نے اسے جو اعزازات دیے تھے انھیں وہ مسترد نہیں کرسکتا تھا۔ بات چیت ختم ہوئی تو

اس نے موبائل پر ٹائم دیکھا۔ بارہ بجنے والے تھے۔ وہ فلیٹ سے نکلا، گاڑی میں بیٹھا اور خالی سڑک پر گاڑی چلاتا رہا۔ ''آئی شڈ ہیو ٹرائیڈ ٹو ہیو سیکس ود یو فرسٹ...'' اس نے خود کو یہ فقرہ اپنے ذہن میں بار بار دہراتے ہوئے پایا۔ اس نے خیالوں میں مشعال کے کپڑے اتارنے کی کوشش کی مگر اسے مشعال سے فون پر ہونے والی باتیں یاد آ رہی تھیں اور وہ مشعال کی شرٹ کے نیچے سے ابھرے ہوئے بریزیئر کے علاوہ کسی چیز پر فوکس نہیں کر پا رہا تھا اور اس یاد سے اس کا غصہ اور بڑھ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ڈیفنس کی ایک کھلی سڑک پر تھا جو بالآخر سی ویو پر ختم ہوئی۔ آگے سمندر تھا۔ سمندر میں لائٹس دور تک روشنی پھینک رہی تھیں۔ سڑک پر ہر تھوڑے فاصلے کے بعد پولیس موبائلیں کھڑی تھیں۔ مگر اسے اطمینان تھا کہ اس کی گاڑی پر پریس کلب کا اسٹکر لگا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی میکڈونلڈز کے سامنے پارک کی اور ریستوران کی جانب چلا۔ ریستوران کے پیچھے اس نے اپنے جاگرز اتارے اور انھیں ہاتھ میں لے کر ساحل کی ریت پر چلنے لگا۔ اس نے یہ بات یقینی بنائی کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ ایک مرتبہ وہ سمندر کے قریب پہنچ گیا تو اس نے ریستوران کی روشنیوں سے مخالف سمت کو چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ساحل سے آنے والی روشنیاں سب سے کم تھیں وہاں وہ رک گیا اور سمندر کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنے گلے میں کڑواہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے مشعال کا نام لیا تو اس کی آواز رندھی ہوئی نکلی۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ سمندر کی لہروں کے شور میں وہ یہاں اس کا نام بلند آواز سے لے سکتا ہے۔ سمندر سے آنے والی ہوا سے اس کی شرٹ پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر شرٹ اتار دی اور پھر بنیان بھی۔ اسے جینز میں اپنا باقی ماندہ جسم اکڑا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے بیلٹ اتاری اور پھر جینز کے بٹن کھول کر اسے نیچے سرکا دیا۔ اب جینز اس کے پیروں پر بیچارگی سے پڑی تھی۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور ہر طرف تنے ہوئے سیاہ آسمان کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنا سر سیدھا کیا اور دور تک پھیلے سمندر کو دیکھنے لگا۔ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے آسمان پر بہت سے ستارے تھے اور چاند کی روشنی میں سمندر بہت دور تک نظر آ رہا تھا اور اس کے کنارے پر روشن اور تابناک لہریں ابھر رہی تھیں جو اس کے قدموں سے کچھ دور آ کر دم توڑ دیتی تھیں۔ بہت بڑے آسمان اور بہت بڑے سمندر کے سامنے اسے اپنا وجود بہت چھوٹا، بہت کمزور اور بہت تنہا محسوس ہوا۔ اس کا ہاتھ اپنے پہلو کی طرف بڑھا اور وہ مشعال کو پکارتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

باب دوم

اول تو یوں کہ فن بنیادی حقیقت کا عکس ہے...

ژاں بودریاغ

آفتاب اقبال

1

اس کہانی کا دوسرا درویش اپنی کہانی سنانے کے لیے تیار ہے۔ ہم اس کی کہانی کہاں سے سننا شروع کریں؟ اس کمرے سے جس کی الماریوں میں کتابیں ترتیب سے لگی اور جس کے بستر پر بے ترتیبی سے بکھری پڑی ہیں؟ کیا ہم ان کی شخصیت کے تعارف کے لیے ان کتابوں کے نام ہی نہ گنوا دیں جن کی جانب وہ بار بار رجوع کرتے ہیں؟ مگر ان میں سے بہت سی کتابیں اور ڈائریاں ان کے والد کی ہیں۔ ان تمام کتابوں اور ڈائریوں کا تعلق ان کے سوالوں سے ہے۔ کچھ سوالوں کے ساتھ وہ بڑے ہوئے تھے، کچھ سوال ان کے والد اپنے پیچھے چھوڑ گئے جن کے جواب وہ ان کی چھوڑی ہوئی ڈائریوں اور کتابوں میں ڈھونڈتے رہتے اور ان میں لکھی ہوئی بے ترتیب تحریروں اور حاشیوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر کوئی مطلب نکالنے کی کوشش کرتے۔ یہ کہانی ہے آفتاب اقبال ولد اقبال محمد خاں کی جو ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ان کے والد اقبال محمد خاں منڈی بہاء الدین کے تحصیلدار تھے۔ ایک روز ان کی لاش رسول نہر کے کنارے ان کی جیپ میں پائی گئی۔ ان کے جسم پر کسی تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ اتنی صبح شہر سے اتنی دور نہر پر کیا کرنے آئے تھے اور ان کا ڈرائیور ان کے ساتھ کیوں موجود نہیں تھا۔ اگر انھیں سیر ہی کرنی تھی تو دریائے جہلم کا کنارہ موجود تھا، وہ اس طرف نسبتاً بیابان راستے پر کیوں آ نکلے تھے؟

اقبال محمد خاں کی ڈائریوں میں اور بھی بہت رطب و یابس تھا۔ وہ آثارِ قدیمہ میں بھی دلچسپی رکھتے

تھے اور اس شہر کی کھوج میں تھے جو سکندر اعظم نے دریائے جہلم کے کنارے پر آباد کیا تھا۔ وہ اپنی دریافتوں کا احوال اپنی زندگی کے احوال کے ساتھ ہی اپنی ڈائری پر لکھا کرتے تھے، اس لیے یہ سمجھنے میں دقت ہوتی تھی کہ کون سا بیان ان کی ذات سے متعلق ہے اور کون سا ان کی تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی سے متعلق۔ آفتاب اقبال نے اپنے فارغ اوقات کا کافی حصہ انھی سوالوں کی گتھی سلجھانے کی کوشش میں صرف کیا تھا۔

آفتاب اقبال کو جوانی میں محبت نہ ہو سکی۔ وہ اپنے بچپن سے ساتھ چلے آ رہے سوالات کے ساتھ ساتھ اپنے والد سے متعلق سوالات کی گٹھڑی اٹھائے زندگی کی تیز دھوپ میں چلتے رہے، یہاں تک کہ ان کی کنپٹیاں سفید ہو گئیں۔ اس مرحلے پر انھیں اپنی زندگی میں ایک اور سوال کا سامنا کرنا پڑا۔

لیکن شاید اس سوال کا ذکر کرنے سے پہلے ہمیں ان کی یونیورسٹی کے اسٹاف روم تک جانا چاہیے جہاں ان کی میز پر بھی ایک آدھ کتاب رکھی ہوئی ملتی ہے۔ یا شاید ہمیں یونیورسٹی کے لان سے شروع کرنا چاہیے جہاں ان کو آتا یا جاتا دیکھ کر لڑکے کبھی کبھار اور لڑکیاں اکثر انھیں روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور ان سے نصابی معاملات پر کوئی سوال پوچھ کر ان کی شکل دیکھنے لگتی ہیں۔ یہ لوئر مڈل کلاس گھرانے کی لڑکیاں ہیں جو اپنے ارمان اپنے دل ہی میں لیے اور بس کبھی کبھار ایک دوسری سے رومانی امور پر چُہلیں کر کے رہ جائیں گی۔ ڈگری لینے کے بعد انھیں شادی کرنی ہے اور چولھا چوکی سنبھالنی ہے، اور ان میں سے جو ذرا کم رُو ہیں انھیں چولھے کے ساتھ ساتھ اپنا ناکارہ یا نیم ناکارہ شوہر بھی سنبھالنا ہے اور اس کے اور اپنے بچوں کی خاطر چھوٹی موٹی نوکری بھی کرنی ہے۔ لیکن ان میں سے کچھ دلیر بھی ہوں گی جو اپنے میل کلاس فیلوز کے ساتھ شوخیاں کرتی ہیں، کبھی کبھار انھیں یونیورسٹی کے باہر بھی مل لیتی ہیں اور ان کے ساتھ گھر بسانے کے خواب بھی دیکھتی ہیں اور پھر ان کی شکلوں پر برستی ہوئی نیم حماقت اور نیم اِم میچورٹی کو دیکھ کر یہ خیال ترک بھی کر دیتی ہیں۔ یہاں آفتاب اقبال اپنی ذہانت اور اس سے زیادہ اپنے لباس کی تراش خراش اور انداز و اطوار کے سبب کافی مقبول ہیں، لیکن وہ لڑکیوں سے فلرٹ کرنے والے استاد نہیں۔ یہیں اس کیمپس میں ان سے محبت کی کونپلیں کھل رہی ہیں، کچھ بہت چھوٹی اور کچھ ذرا بڑی، لیکن ان سب کو کسی اور کے کالر میں سجنا ہے۔ کیا لڑکیاں ہمیشہ اپنے محدودات کے اندر ہی رہ کر محبت کرتی ہیں؟ کیا ان میں سے کوئی لڑکی دلیر نہیں نکل سکتی؟ کہانیوں میں تو بہت کچھ ہوتا ہے، شاید حقیقت میں بھی ہوتا ہو۔ دیکھنے میں کیا حرج ہے۔

2

آفتاب اقبال جس محبت کی کہانی میں ملوث ہوئے اس کی بنیاد ایک اتفاق پر پڑی جسے حسنِ اتفاق بھی کہا جا سکتا ہے اور سوے اتفاق بھی۔ اس کے بعد اس محبت کے ہر ہر اہم مرحلے پر انھیں کسی نہ کسی اتفاق کی کارفرمائی دکھائی دی۔ ان اتفاقات کی تعداد تو کم تھی لیکن یہ بہت اہم مواقع پر وقوع پذیر ہوئے تھے اور ان کی کہانی کی تشکیل میں اُن چند اتفاقات نے اتنا اہم کردار ادا کیا تھا کہ انھوں نے اپنی بعد کی زندگی کے کچھ برس زندگی میں اتفاقات کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش پر لگا دیے تھے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ بعض اتفاقات ایسے تھے جنھوں نے انھیں مسئلۂ تقدیر سے متعلق فلسفی سپائی نوزا کے خیالات کی جانب رجوع کرنے پر مجبور کر دیا تھا، مگر اردو میں لکھی جانے والی یہ تحریر شاید اس پر اسپس کی تفصیل کا بوجھ برداشت نہ کر پائے، اور ویسے بھی میں 'آفتاب اقبال کی فکری نشوونما' کے موضوع پر کوئی مقالہ تو لکھ نہیں رہا۔

اس محبت کی کہانی کی ابتدا ایک اتفاق سے ہوئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک لڑکی سے ایک فقرہ سرزد ہوا اور آفتاب اقبال نے خود کو اس کے ذریعے ایک نئے اور عجیب سے جال میں پھنستا ہوا محسوس کیا۔ لیکن اس جال میں پھنستے ہوئے ان کی سرخوشی بھی عجیب تھی۔ انھیں احساس تھا کہ وہ ایک جال یا ایک سچویشن میں گرفتار ہوتے چلے جا رہے ہیں، لیکن انھوں نے اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنا مناسب نہ سمجھا، یا انھیں اس میں ایسا سرور محسوس ہوا جیسے وہ کسی نرم گدیلے بستر میں دھنستے چلے جا رہے ہوں۔ وہ جو اپنی تقدیر خود تحریر کرنے پر یقین رکھتے تھے، انھوں نے یکایک یہ پایا کہ وہ خود کو واقعات کے دھارے میں بہتے چلے جانے دے رہے ہیں، جیسے انھوں نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا ہو اور تقدیر ہی ان کی کہانی تحریر کر رہی ہو۔ ویسے ہی جیسے سپائی نوزا نے کہا تھا کہ تقدیر آپ کی کہانی خود تحریر کرتی ہے، اور جس سے آفتاب اقبال نے سختی سے اختلاف کیا تھا اور طے کیا تھا کہ وہ کم از کم اپنی زندگی میں اسے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔

لیکن ظاہر ہے کہ ہم 'آفتاب اقبال کی فکری نشوونما' کے موضوع پر کوئی مقالہ تو پڑھ نہیں رہے۔ ذکر ہو رہا تھا اس پہلے اتفاق کا، بلکہ، مجھے تصحیح کرنے دیجیے کہ، اس پہلے فقرے کا جس سے آفتاب اقبال کی محبت کی کہانی کا آغاز ہوا۔ اس فقرے کا مفہوم جاننے کے لیے اس پس منظر کو جاننا بھی اہم ہے جس میں یہ فقرہ ادا کیا گیا۔ جہاں تک اس فقرے کے محل وقوع کا تعلق ہے تو یہ اس کلاس روم میں ادا کیا

گیا جس میں آفتاب اقبال ایک لیکچر دینے گئے تھے۔ تو آیئے اسی کلاس روم میں چلتے ہیں۔

3
میمیسس

"آج ہم افلاطون اور ارسطو کے ایک ایسے تصور کے بارے میں پڑھیں گے جس پر ڈھائی ہزار سال گزر جانے کے باوجود بحث جاری ہے اور جو ادب، فلسفہ، سماجیات اور دیگر کئی علوم میں کئی بڑے بڑے مباحث کی بنیاد ہے۔" آفتاب اقبال نے کلاس کے بالکل درمیان میں ڈیسک کے پیچھے کھڑے ہو کر حاضرین کی آنکھوں میں ڈرامائی انداز میں جھانکا جو حسبِ معمول یہ سوچ رہی تھیں کہ آگے وہ کیا کہنے والے ہیں، یا پھر وہ اس اونگھ کو بھگانے کی کوشش میں کچھ زیادہ ہی کاوش کے ساتھ کھلی ہوئی تھیں جو صبح کے وقت آنکھوں میں امڈی پڑتی تھی۔ آفتاب اقبال مڑے اور بورڈ پر چاک سے انگریزی میں لکھا: Mimesis

"حقیقت کیا ہے؟ آپ کے اردگرد پھیلی ہوئی یہ ساری دنیا، اس کے سب انسان، سب چیزیں، یہ سب حقیقت میں شامل ہیں۔ ہم جو کچھ سوچتے ہیں وہ اسی حقیقت کے بارے میں سوچتے ہیں۔ یہ تو ہو گئی دیکھی ہوئی حقیقت۔ ایک حقیقت اور بھی ہے۔ اس دنیا سے ماورا کی حقیقت۔ نہ دیکھی ہوئی حقیقت۔ تحریر کوئی بھی ہو، ادبی ہو، سماجی ہو، سیاسی ہو، فلسفیانہ ہو، سائنسی ہو، انھی دو قسم کی حقیقتوں کے بارے میں ہوتی ہے۔"

"مذہبی تحریر بھی؟" کلاس میں برقع اوڑھے ایک لڑکی نے اچک کر سوال پوچھ لیا۔

"فی الحال آپ ذرا یہ کانسیپٹ سمجھ لیں۔ اتنی جلدی نہ کریں۔ آپ کے تمام سوالوں کا جواب میں بعد میں دے دوں گا،" آفتاب انتہائی سنجیدگی سے بولے۔

"تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب حقیقت کی تحریر میں منتقلی کا مرحلہ آیا تو یونانی فلسفیوں کے نزدیک یہ سوال پیدا ہو گیا کہ ہم تحریر میں جو حقیقت دکھاتے ہیں کیا وہ بھی ویسی ہی حقیقت ہوتی ہے جیسی حقیقت ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں؟ تو کسی بھی تحریر میں حقیقت کی نمائندگی یا ریپریزنٹیشن کو میمیسس کہتے ہیں۔ آ گئی سمجھ؟"

"واہ جی۔ اس میں تو کوئی مشکل ہی نہیں۔ بالکل سمجھ آ گئی،" اگلی قطار میں بیٹھا ایک لڑکا بولا۔

"ڈھائی ہزار سال سے اس پر بحث کیوں ہو رہی ہے؟ سمپل سا تو معاملہ ہے۔ ایک تو حقیقت ہے۔ اور تحریر میں اس حقیقت کی ریپریزنٹیشن ہوتی ہے۔ اسے میمیسس کہتے ہیں۔ سمپل!" ایک اور لڑکا بولا۔

"ایک حقیقت نہیں۔ دو حقیقتیں۔ ایک نیچے والی حقیقت، دوسری اوپر والی حقیقت،" برقعے والی لڑکی اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے پہلے اوپر اور پھر نیچے اشارہ کرتے ہوئے شوخی سے بولی۔

"لیکن مسئلہ تو یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ حقیقت کو تخلیق میں پیش کرنے کو تو میمیسس کہتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت کس طرح پیش کی جائے؟ یہ ہے اصل سوال،" آفتاب اقبال ایک بار پھر کلاس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔ برقعے والی لڑکی اب اپنی ٹھوڑی کے نیچے مکّا رکھے انھیں ایسے دیکھ رہی تھی کہ وہ بتا سکتے تھے کہ نقاب کے پیچھے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ چکی ہے۔

"افلاطون نے اپنے مکالمات میں سقراط کے الفاظ میں یہ کہا ہے کہ ایک تو آئیڈیا ہوتا ہے خدا کا، اس کے بعد کوئی بھی صناع مثلاً بڑھئی، معمار، قالین باف وغیرہ آتے ہیں جو اس آئیڈیا کی نقل تیار کرتے ہیں۔ فنکار اس نقل کی نقل تیار کرتا ہے اور اس طرح حقیقت سے یا سچائی سے دو درجے دور ہوتا ہے۔"

"یعنی یہ جتنے شاعر ادیب ہوتے ہیں، وہ سچائی سے دو درجے دور ہوتے ہیں،" ایک لڑکے نے سوال اٹھایا۔

"اللہ میاں نے بھی یہی فرمایا ہے۔ اور شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو گمراہ ہوں۔" برقعے والی لڑکی اس بار بھی چپ نہ رہ سکی۔

"آپ کی بات کو مزید بھی آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور قرآن کے اس فرمان پر افلاطون کے آئیڈیا کی روشنی میں بھی بات کی جا سکتی ہے، مگر کوئی مذہبی عالم اس بات کو شاید پسند نہیں کرے گا،" آفتاب نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ بیک بنچز میں سے کسی نے کوئی فقرہ چست کیا تھا جس پر وہاں سے ہنسی کی دبی دبی آواز بلند ہوئی۔ آفتاب نے اس جانب نگاہ اٹھائی تو وہ لڑکے بھی اٹینشن ہو کر بیٹھ گئے۔

"لیکن ارسطو نے یہ بتایا کہ میمیسس حقیقت کی صرف اِمی ٹیشن یا نقالی نہیں ہے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ آرٹ میں حقیقت کی نقالی بھی ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حقیقت کو ایک توازن بھی دینے کی کوشش ہوتی ہے، جس سے حقیقت ایک چھوٹی لیکن متوازن شکل میں ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اسی کو

آرٹ یا اچھا آرٹ کہتے ہیں۔"

"لیکن کیا حقیقت از خود متوازن نہیں ہوتی؟" چین بلند کیے ہوئے ایک لڑکے نے اپنا چین بلند کیے کیے ہی سوال کیا۔

"ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ اصل میں حقیقت اتنی وسیع و عریض ہے کہ اسے مکمل طور پر بیان کرنا یا قلم بند کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے آرٹسٹ ایک سانچا، ایک فارم، ایک بھانڈ اور یافت کرتا ہے جس میں اس حقیقت کے ایک چھوٹے سے توازن کو پیش کر سکے۔ ایک ایسا توازن جو اس نے خود دریافت کیا ہوتا ہے۔ یوں وہ از خود ایک حقیقت کو تشکیل دیتا ہے، چاہے یہ حقیقت کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ اس کی ایک مثال میں آپ کو دوں۔ آپ کسی خوبصورت جگہ کی سیر کر رہے ہیں، آپ کے ہاتھ میں ایک کیمرا ہے، آپ کو کوئی منظر بہت خوبصورت لگتا ہے، آپ اس کی تصویر لینا چاہتے ہیں۔ آپ کیمرا اٹھاتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں۔" آفتاب اپنی آنکھوں سے کیمرا لگانے کی نقل کرتے ہیں۔

"نہیں، یہاں سے یہ پہاڑ بیک گراونڈ میں پورا نہیں آ رہا۔ اس درخت کو تو ضرور ہی لے لینا چاہیے۔ اور وہاں وہ جو ایک گڈریا اپنے دنبوں کے ساتھ جا رہا ہے، اسے بھی آنا چاہیے۔ پہاڑ بہت بڑا ہے، کٹتا ہے تو کٹ جائے۔ نہیں نہیں، یہ نہیں! ہاں ہاں، یہ ٹھیک ہے! آپ طے کرتے ہیں کہ تصویر میں کیا کیا چیز ہونی چاہیے۔ اور کلک! آپ تصویر کھینچ لیتے ہیں۔" آفتاب اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا کیمرا آنکھوں سے نیچے اتار لیتے ہیں۔

"تو یوں۔ آپ نے ریالٹی کا ایک پورشن چنا اور اس کی تصویر اتار لی۔ رائٹر بھی یہی کرتا ہے۔ وہ حقیقت کو ایک فریم میں فٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تخلیق اصل میں حقیقت کو کسی نہ کسی فریم میں فٹ کرنے کا نام ہے۔"

"لیکن سر، علامہ اقبال نے تو کہا ہے کہ:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی"

برقع پوش لڑکی نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے شعر سنا دیا۔ اس مرتبہ آفتاب اقبال رکے اور کچھ دیر اس کی آنکھوں کا جائزہ لیتے رہے۔ پہلے تو وہ آنکھیں اپنی کامیابی پر مسرور نظر آئیں، جیسے کسی بچے

کی آنکھیں ہوں جس کا نام ابھی ابھی کسی انعام کے لیے پکارا گیا ہو، پھر وہ یکا یک جھک گئیں، پھر انھیں اور ان میں ایک جھینپ، ایک جھجک سی پیدا ہو گئی جیسے بھرے مجمعے میں کسی نے ان کا نام پکار لیا ہو۔

"سر!"، ایک اور آواز آئی تو آفتاب اچانک ہڑبڑا گئے۔ "اس شعر کا مطلب بھی ان سے ہی پوچھیں،" ایک اور لڑکے نے کہا اور کلاس میں پھر دبی دبی ہنسی سنائی دی۔

"جی انھوں نے بڑا موقعے کا شعر سنایا۔ تخلیق کار واقعی اپنے اندر کے آئینے میں حقیقت کو ری شیپ کر رہا ہوتا ہے۔ اس آئینے کو ہی 'دل کا آئینہ' کہا جاتا ہے۔ ہر آئینے پر حقیقت ایک مختلف ہی عکس ڈال رہی ہوتی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ تحریر میں اترنے والا عکس ویسا ہی مختلف ہو۔ مصنف پر دوسرے مصنفین کی کھینچی ہوئی تصویروں کا بھی تو اثر ہوتا ہے۔ پرانے مصنفین نے حقیقت کو جیسے ری آرگنائز اور ری شیپ کیا ہے، اس کا بھی تو اثر ہوتا ہے۔ آئیڈیا بھی ایک تخلیق ہوتا ہے۔ اب انھوں نے..." وہ لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے، "انھوں نے میرے لیکچر کو ایک شاعر کے شعر کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی۔ ایک آئیڈیا میں آپ کو سمجھا رہا تھا، دوسرا آئیڈیا اقبال نے پیش کیا۔ انھوں نے ان دونوں آئیڈیاز کو ملا دیا۔ انھوں نے ریالٹی کو دیکھنے کے دو طریقوں کو مدغم کر دیا۔ مصنف یہی تو کرتا ہے۔ ریالٹی کو دیکھنے کے بہت سے طریقے اس کے سامنے موجود ہوتے ہیں، اس ریالٹی کی تفہیم کے لیے مختلف سانچے اور فارمز دوسروں نے بنا رکھی ہوتی ہیں۔ مصنف ان طریقوں اور سانچوں کو آپس میں گڈمڈ کر کے ایک نیا طریقہ، ایک نیا سانچا بنانے کی کوشش کرتا ہے،" آفتاب نے ایک لمبی سانس کھینچی تو ایک اور لڑکے کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔

"لیکن سر، ہم تو فلسفہ پڑھ رہے ہیں۔ ہم لٹریچر تو نہیں پڑھ رہے۔ مصنف ریالٹی کو کیسے سمجھتا ہے، کیسے تحریر کرتا ہے، یہ تو لٹریچر کا مسئلہ ہے نا سر؟" اس نے سوال پوچھ کر برقعے والی لڑکی کی طرف دیکھا جیسے اس سے داد کا طالب ہو، لیکن وہ سر ہی کو دیکھے جا رہی تھی۔

"اپنے اندر ریالٹی کو شیپ اپ کرنا صرف مصنف کا ہی مسئلہ نہیں۔ میرا بھی ہے۔ آپ کا بھی ہے۔ ہم ہر لحہ ریالٹی کے مدمقابل ہیں اور ہر لحہ ہمارے اپنے خیالات اور جذبات کی بھی وہ کیا کہتے ہیں 'تقلیب' ہو رہی ہے۔ ہم ہر لحہ اپنی ریالٹی کی انڈرسٹینڈنگ کی تقلیب کر رہے ہیں۔ پھر اس تقلیب پر مطمئن نہیں ہوتے اور اگلے ہی لمحے اس کی نئی تقلیب ہو رہی ہوتی ہے۔"

Scanned with CamScanner

''تقلیب؟ وہ کیا ہوتی ہے سر؟'' بیک بنچ سے ایک لڑکے نے پوچھا۔

''تقلیب۔ منقلب کرنا۔ تبدیل کرنا۔ ری شیپنگ۔ ری ماڈلنگ۔ ری ڈیزائننگ۔ ری آرگنائزیشن۔'' آفتاب ہر لفظ بتانے کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ کو ایسے چلاتے جیسے حوض میں سے پانی نکال رہے ہوں۔ لڑکے اور لڑکیاں چند لمحوں کے لیے مبہوت ہو کر ان کے ہاتھوں کو دیکھتے رہے۔

''لیکن حقیقت کی نمائندگی یا ریپری زنٹیشن ایک بہت لیئرڈ کانسیپٹ ہے۔ یعنی اس کی بہت سی تہیں اور بہت سے آسپیکٹس ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ایک واقعے کو دیکھ رہے ہوں اور آپ کو اسے بیان کرنے کو کہا جائے تو سب کا بیان الگ الگ ہوگا۔ کسی کو کوئی چیز اہم لگے گی اور کسی کو کوئی اور چیز۔ ریالٹی کی نمائندگی میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ یہ نمائندگی، یہ ریپری زنٹیشن کون کر رہا ہے۔''

''لیکن ریالٹی تو ریالٹی ہوتی ہے۔ اسے جو بھی بیان کرے!'' ایک لڑکے نے سوال اٹھایا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ایک قاتل کو جب پولیس پکڑ لیتی ہے تو وہ عام طور پر قتل کا انکار کر دیتا ہے۔ یعنی قتل اس نے کیا ہے، یہ ایک ریالٹی ہے، مگر وہ اس سے انکار کر رہا ہے اور چاہ یہ رہا ہے کہ اس کے قاتل نہ ہونے کو ہی ریالٹی تسلیم کر لیا جائے۔ یا پھر ایک اور مثال لیں۔ ایک آدمی کسی کو قتل کر دیتا ہے۔ یہ ایک ریالٹی ہے۔ مقتول کا بھائی پولیس کو بیان دیتا ہے کہ قاتل نے اس کے بھائی کو بے گناہ مارا۔ یہ ریالٹی کی ایک نمائندگی ہے۔ مگر قاتل کہتا ہے کہ مقتول نے کچھ کیا تھا، مثلاً جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر واقعات ہوتے ہیں کہ وہ یہ الزام لگاتا ہے کہ مقتول نے اس کی بہن کو تنگ کیا تھا۔ یہ اس ریالٹی کی ایک دوسری نمائندگی ہے۔ یا پھر آپ کوئی خودنوشت سوانح عمری پڑھتے ہیں تو اس میں مصنف نے ریالٹی کو اپنے نقطۂ نظر سے بیان کیا ہوا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آدمی نے زندگی میں کئی ایسے کام کیے ہوئے ہوتے ہیں جو وہ نہیں چاہتا کہ کبھی دنیا کے سامنے آئیں، اس لیے جب وہ سوانح عمری لکھتا ہے تو وہ صرف ایک آتھورائزڈ ریالٹی ہوتی ہے، یا ریالٹی کی بس ایک نمائندگی یا ریپری زنٹیشن ہوتی ہے اور بس۔

''یہ بات تو سوانح عمری کی ہو گئی۔ لیکن ہم زبانی کلامی بھی کو کو اپنی زندگی کا کوئی قصہ سنائیں تو صرف وہی باتیں سنائیں گے جو ہم سنانا چاہتے ہوں گے۔ بہت سی باتیں ہم اسکپ کر جائیں گے تاکہ دوسرے ہمارے بارے میں ویسا سوچیں جیسا ہم چاہتے ہیں کہ وہ سوچیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر سامع بھی ریالٹی کو اپنے طور پر ری شیپ کر رہا ہوتا ہے۔ تو میرا مطلب یہ ہے کہ ہم سب کسی نہ کسی سطح پر

مصنف ہی کا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم ریالٹی کو ایڈٹ کرتے ہیں، اسے ری شیپ کرتے ہیں اور یوں ایک ایڈیٹڈ ریالٹی کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔''

''تو کیا پوری ریالٹی کو پیش کرنا ممکن ہے؟'' ایک اور لڑکے نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے کہ نہیں۔ ریالٹی کی ہر نمائندگی ایڈیٹڈ ہی ہوتی ہے۔ کچھ نہ کچھ یا بہت کچھ بیان سے باہر ہی رہ جاتا ہے۔ یعنی ایک سطح پر فیکٹ اور فکشن دونوں میں کچھ زیادہ فرق ہے نہیں۔ کیونکہ فیکٹ بیان کرنے والا بھی بہت کچھ ایڈٹ کر ہی دیتا ہے۔''

''سر، یہ بہت انٹرسٹنگ بات آپ نے بتائی کہ ہم سب کسی نہ کسی درجے پر مصنفین ہی ہیں!'' برقعے والی لڑکی بولی۔

آفتاب نے اس پر ایک نظر ڈال کر لڑکوں کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر بولے، ''کیا خیال ہے آپ کا؟''

لڑکے جواب میں مسکرا دیے۔ ایک بولا، ''سر! کیا فیضان بھی مصنف ہے؟''

فیضان جو کسی سوچ میں مگن کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا، یکا یک ہڑبڑا گیا جسے دیکھ کر سب کھلکھلا کر ہنس دیے۔

''بتایئے، کیا آپ بھی مصنف ہیں؟'' آفتاب نے فیضان سے پوچھا تو وہ اپنے اردگرد ایسے دیکھنے لگا جیسے اسے کسی لفظ کی تلاش ہو۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا، بلکہ اسے سمجھ ہی نہ آئی کہ اس سے یہ سوال کس کونٹیکسٹ میں پوچھا جا رہا ہے۔

''اصل میں فیضان صاحب کھڑکی کے پار ایک اور ریالٹی کو دیکھ رہے تھے،'' آگے کی کرسیوں پر بیٹھے ایک لڑکے نے چوٹ کی اور کلاس میں قہقہے گونجنے لگے۔ کچھ لڑکوں نے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دو دو تین تین مرتبہ قہقہے لگا لیے۔ آفتاب انھیں مسکرا کر دیکھتے رہے۔

برقعے والی لڑکی کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں اور وہ ہاتھ سے ایسے چپو چلا رہی تھی جیسے کسی کو ہٹانے کی کوشش کر رہی ہو، حالانکہ وہ ان قہقہوں کے رکنے کا بے قراری سے انتظار کر رہی تھی تاکہ خود کوئی بات کر سکے۔

''اگر فیضان اپنی ریالٹی پر کتاب لکھ دے تو اس کی کتاب بین ہو جائے،'' برقعے والی لڑکی نے

اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا اور فقرے کے اختتام پر منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ لڑکوں نے فیضان کو دیکھ کر 'اووووو۔ اووووو۔ اوئے ہوئے ے ے ے ے' کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ لڑکی سے خود اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا اور اس کی چمکدار آنکھوں میں ہنس ہنس کر آنسو آ گئے تھے۔ اس کی ہنسی ایک جھرنے کی سی آواز سے شروع ہوئی تھی لیکن اب یہ ہنسی ایک بے آواز ہنسی تھی جس میں پسلیاں ہلتی رہتی ہیں اور منہ بغیر کوئی آواز نکالے کھلا رہ جاتا ہے۔ کلاس میں شور ہو رہا تھا اور لڑکوں کا رخ فیضان کی جانب تھا جس پر ہر لڑکا جملے بازی کی مشق کر رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس دوران خود بھی ہنسے جا رہی تھی۔ آفتاب اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر چند ثانیوں کے بعد دھیرے دھیرے اس لڑکی کو دیکھتے اور پھر اپنی آنکھیں کہیں اور لے جاتے۔ طالب علم آج مزید پڑھائی کے موڈ میں نہیں تھے۔ آفتاب نے اپنی کتاب ہاتھ میں اٹھائی اور ایک آخری نظر اس لڑکی کی جانب دیکھا۔

ان کی زندگی، ان کی تقدیر نے ایک فیصلہ کن موڑ پر چند لمحوں کے لیے انتظار کیا اور پھر آفتاب اقبال نے (کیا آفتاب اقبال نے؟) طے کیا کہ انھیں اس دلچسپ لڑکی کو کلاس روم سے باہر بلا کر تھوڑا سا لیکچر دینا چاہیے تاکہ آئندہ ان کی کلاس میں ڈیکورم برقرار رہے۔ یا شاید انھیں اس لڑکی کی اپنی آنکھوں سے جرٔت پسند آئی تھی اور وہ مزید کچھ لمحے اس جرٔت کا تجربہ کر کے ایک بار کچھ طے یا نا طے کرنا چاہ رہے تھے۔ بہر حال، انھوں نے لڑکی کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے حجاب پر وہاں ہاتھ رکھے جہاں اس کا منہ تھا، باہر آئی۔ آفتاب نے اس کی سرزنش کی، اپنی آنکھوں سے اس کی آنکھوں کی جرٔت کا مشاہدہ کیا، لڑکی کی سوری قبول کی اور پھر، ہر چند نہ چاہتے ہوئے، اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر اسٹاف روم کی طرف روانہ ہو گئے۔

برقعے میں جو لڑکی تھی، اس کا نام تھا اِم سلمیٰ۔

4

آفتاب اقبال اور سلمیٰ کی نیم رومانی داستان محبت

سلمیٰ کو میں ہزار مرتبہ منع کر چکا تھا کہ میں اس کا ٹیچر ہوں اور وہ میری شاگرد، ہمارے درمیان کسی اور تعلق کی کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو کہانیاں بنیں گی، مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔ لیکن اس نے

ملاقات کے لیے مجھے ایک ایسا طریقہ بتایا کہ میں اس کی ذہانت پر مسحور ہو کر رہ گیا اور اس ذہانت کی داد دینے کے لیے مجھے یہی بہتر لگا کہ اسی طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس سے مل لوں۔

اُن دنوں میری عمر بیالیس برس تھی اور ہنوز کنوارا ہونے کے باعث مجھے ایک ایلی جیبل بیچلر کی ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ میری جوانی اپنی مطلقہ ماں اور دو چھوٹی بہنوں کی ذمہ داری اٹھاتے گئی اور اس دوران میں نے شادی سے صاف انکار کر رکھا تھا۔ میری بہنیں اپنی شادیوں کے بعد میرے لیے روز نت نئی دلہنیں تلاش کر کے لاتیں لیکن میں اپنے ریسرچ تھیسس میں ایسا غرق تھا کہ مجھے شادی وادی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ لیکن میں یہ سطریں خود کو یہ سمجھانے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ میں نے سلمیٰ سے وہ ملاقات کی ہی کیوں تھی جس کا اثر میری بے داغ لیکن سپاٹ زندگی کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دینے والا تھا۔ اس لیے اپنے موضوع کی طرف واپس چلتے ہیں۔

اپنی زندگی میں مجھے جن طلبا و طالبات کو پڑھانے کا موقع ملا تھا، ان میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ زیادہ تر طلبا تاریخ کا مضمون اس لیے لیتے کیونکہ انھیں کسی اور مضمون میں داخلہ نہیں ملا ہوتا تھا۔ پھر کچھ ذہین طلبا ہوتے مگر ان کے ذہن اس کھوج سے خالی ہوتے جس نے مجھے بہت سے سوالوں کا اسیر کر لیا تھا۔ سلمیٰ مختلف تھی۔ میں صرف اس کی آنکھوں سے متعارف تھا، جو کبھی خوشی سے چمکتیں اور کبھی کسی خیال کی روشنی سے۔ کبھی وہ آنکھیں اداسی سے لٹک سی جاتیں اور کبھی گہری سوچ میں ڈوب کر ان کے کناروں پر دراڑیں سی پڑ جاتیں۔ میں صرف اس کی آنکھوں سے متعارف تھا، یا پھر اس کے ہاتھوں سے جن کی سفیدی میں خون کی مہین شریانیں بھی صاف دکھائی دیتیں، اور اس کی نرم، پتلی اور لمبوتری انگلیوں سے جن کے پورے بے انتہا سرخ تھے۔ میں صرف اس کی آنکھوں اور ہاتھوں سے متعارف تھا۔

سلمیٰ سر سے پیر تک پردہ کیا کرتی تھی۔

میں شروع میں اسے ایک عام سی جماعتی لڑکی سمجھا تھا، لیکن اس کے برقعوں کا تنوع اور نفاست، اس کی ڈیزائنر سینڈلیں اور دیدہ زیب موزے اس کے خوش ذوق، زندہ دل اور صاحبِ حیثیت ہونے کی غمازی کرتے تھے۔ اس کے برقعے کئی طرح کے تھے۔ پاکستانی سیاہ برقع، ایک بڑی سی بیلٹ کی مدد سے کمر کی باریکی اور کولھوں کی چوڑائی نمایاں کرنے والا کوٹ نما عبایا، بازوؤں کی حرکت کی گنجائش رکھنے والا عبایا جسے پہن کر اگر بازو پھیلا دیے جائیں تو عورت کسی سپر مین جیسی لگتی ہے، اور پھر عربی عبایا

جس کا مہین کپڑا جسم کے نشیب و فراز پر جھولتا ہوا گزرتا اور جو ایک بڑی سی قمیض سے مشابہ لگتا تھا۔ سیاہ، سفید، گلابی، سرخ، یہ برقعے اس کے پاس کئی رنگوں میں تھے اور پھر ان پر کاڑھے ہوئے ڈیزائن اور گل بوٹے۔ ہر برقعے میں ایک خصوصیت مشترک تھی اور وہ یہ کہ سلمیٰ چہرے پر پورا حجاب لیتی تھی۔

پہلے سمسٹر سے ہی سلمیٰ نے باقی کلاس فیلوز کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے ڈیزائنر برقعوں کے سبب اپنی کلاس کی امیرزادیوں سے کسی طور کم پرکشش نہ لگتی لیکن اس کی ذہانت، اعتماد اور وقار کے سبب لڑکے اسے دیگر لڑکیوں کی نسبت زیادہ احترام دیتے تھے۔ میرے لبرل خیالات پر وہ مجھ سے بحث تو کرتی لیکن اس دوران اس کی آنکھوں میں ایک عجیب مسکراہٹ سی پھیلی رہتی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے حملے سہنے میں مجھے بھی لطف آتا۔ گوگل سرچ انجن اور لائبریری میں پورے عزم سے مغز ماری کے نتیجے میں اس نے جلد ہی میرے خیالات کے جواب میں خود مغرب کے حوالے پیش کرنا شروع کر دیے۔ "سر، ہیوم نے تو انسانی تجربے کو رد کر دیا ہے، سر، برکلے نے تو حواس سے حاصل شدہ علم پر یقین کرنے سے انکار کر دیا ہے، سر، دریدا تو کہتا ہے کہ منطق ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔" ایسے میں میں بس مسکرا دیتا کیونکہ اپنی ہونہار شاگرد کے لیے مجھے خوشی تھی کہ وہ اب کتابوں اور علم کے ایک لامحدود ذخیرے سے متعارف ہو چکی ہے۔

جب وہ پیدا ہوئی تو اس کے والد سعودی عرب میں تھے۔ انھوں نے اس کا نام ام سلمیٰ رکھا تھا۔ وہ تیل کی ایک کمپنی میں کام کرتے تھے لیکن انھیں مطالعے کا بہت شوق تھا۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس رہتے لیکن چہرے پر یہ بڑی داڑھی، اور مونچھ صفاچٹ۔ سلمیٰ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے یونیورسٹی میں داخلے کے وقت طے کیا تھا کہ وہ برقع لیا کرے گی۔ بس اس کے بعد اسے برقعے کے بغیر یہاں آنا مناسب ہی نہیں لگا۔ ورنہ وہ گھر میں صرف دوپٹہ لیتی ہے اور اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کے وقت بھی برقع نہیں پہنتی۔

"کاش ہم بھی آپ کے رشتہ دار ہوتے،" میں نے پہلی مرتبہ اس کے ساتھ شوخی کی تھی۔ جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی اور اس کے ہونٹ اس کے حجاب سے چپک کر رہ گئے تھے۔ وہ کافی دیر اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کرتی رہی جو پانی کے کسی چشمے کی طرح رہ رہ کر اس کے ہونٹوں سے ابل پڑتی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے اچھو لگ گیا اور وہ زور زور سے کھانسنے لگی۔ میں نے پاس پڑے جگ سے اسے پانی نکال

کر دیا۔ اس نے گلاس کو حجاب کے نیچے کر کے اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا اور ان آنکھوں سے میری جانب دیکھنے لگی جن میں اب پانی تیر رہا تھا۔ اچانک اس کے ہونٹوں سے ہنسی کا ایک فوارہ سا چھوٹا اور اس کے منہ میں بھرا ہوا پانی چھلک کر میری میز پر بکھر گیا۔ اس نے ڈر سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور اس کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ جب اس نے دیکھا کہ میرے چہرے پر غصے کے کوئی آثار نہیں تو "سوری سر، سوری سر" کہتی ہوئی ٹشو پیپرز سے میری میز صاف کرنے لگی۔

5

"کاش ہم بھی آپ کے رشتہ دار ہوتے،" میں نے اس روز اور اس کے بعد بھی کئی مرتبہ اس فقرے پر لاتعداد مرتبہ غور کیا ہے۔ بظاہر اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس پر کوئی لڑکی اس قدر ہنس سکے۔ اب جبکہ میری زندگی سلمیٰ ہی کی وجہ سے مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہے تو میں یہ سوچتا ہوں کہ شاید یہ فقرہ کہتے ہوئے میں نے اس کی ایک ایسی خواہش کو چھو لیا تھا جو اس کے سینے میں کسی خودرو پودے کی طرح اگنا شروع ہو گئی تھی اور جس کا ذکر وہ کسی اور سے تو کیا، خود اپنے آپ سے بھی مشکل ہی سے کرتی ہوگی۔

میں بھی کیسا کھوجی ہوں۔ میں تو اس کھوج میں نکلا تھا کہ یہ طے کر سکوں کہ میں نے اس سے یونیورسٹی کے باہر ملاقات ہی کیوں کی، اور اب کسی اور کھوج کی طرف نکل پڑا ہوں۔ ملاقات میں نے اس سے اس لیے کی تھی کیونکہ اس ملاقات کے لیے اس نے مجھے جو طریقہ بتایا تھا وہ بہت انوکھا اور ذہانت سے پُر تھا اور میں اس پر عملدرآمد کر کے اسے اس کی ذہانت کی داد دینا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایسے انوکھے طریقے پر صرف زبانی داد کافی نہیں بلکہ داد کا حق تبھی ادا ہوگا جب اس طریقے پر عملدرآمد بھی کر دیا جائے۔

6

راوی کا بیان

اس سے پہلے کہ آفتاب اقبال، ڈیٹ مارنے کے لیے سلمیٰ کے بتائے ہوئے انوکھے طریقے کی بابت کچھ اظہار خیال کریں، یہ بہتر ہوگا کہ ہم دونوں کے پس منظر سے کچھ واقفیت حاصل کر لیں۔ میں

جانتا ہوں کہ آپ آفتاب اقبال کے بارے میں مجھ سے کچھ حیرت انگیز انکشافات سننا چاہتے ہیں۔ لیکن آفتاب اقبال کے بارے میں میرے پاس بتانے کے لیے کوئی بڑی سی رنگین کہانی نہیں۔ ان کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو خواتین سے بھی ذہنی کشتیاں ہی کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی سچائی اور دیانتداری کی تو میں بھی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ جس فکری کھوج میں وہ اپنے لڑکپن میں مبتلا ہو گئے تھے اس نے جوانی کے تمام عرصے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ لیکن ظاہر ہے، جب ان پر جوانی آئی تھی تو انھوں نے اسے آزمانے کے لیے اپنے جسم پر وہ تجربات بھی کیے تھے جن کے بارے میں ان کے اس وقت کے دوست انھیں بتاتے تھے، لیکن یہ قصہ بہت پرانا ہو چکا۔ آفتاب اقبال نے اپنی جس عمر کی کہانی سنائی ہے اس میں تو ان کی جنسی فعالیت کی حد بس یہ رہ گئی تھی کہ وہ کسی صبح اپنے نائٹ سوٹ پر لگے ہوئے نشانات سے یہ اندازہ لگاتے تھے کہ وہ بدستور جوان ہیں۔ لیکن سلمیٰ کے بارے میں انھوں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے، وہ معاملہ کچھ ایسا سادہ بھی نہیں۔

برقعے میں ملبوس سلمیٰ انھیں بہت چیلنجنگ لگتی تھی۔ ذہنی معمے حل کرتے رہنے والا ذہن برقعے کے معمے کو کہاں آسانی سے چھوڑ سکتا تھا۔ سو انھیں خوب معلوم تھا کہ وہ اچھے قد کاٹھ اور سرخ و سفید رنگت کی مالک ہے اور اس کے حسن کے بارے میں کسی بھی حد تک خوش گمانی کی جا سکتی ہے۔ اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا برقع کوئی پیراکی کا لباس لگتا۔ حقائق اور اس کے پس پردہ اصل حقائق کی جستجو کرنے والے ذہن سے یہ توقع کی ہی جا سکتی تھی کہ وہ ایک چست برقعے کے پیچھے کے حقائق جاننے کا آرزو مند ہوتا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ان کی والدہ امۃ الکریم برقع اوڑھتی تھیں۔ جانے نفسیات کے ماہرین اس امر کی تفتیش میں کہاں کہاں کے قلابے ملائیں، لیکن یہ بات تو ایک حقیقت ہے کہ پردے کے نظریاتی طور پر مخالف ہونے کے باوجود وہ پردے کی جانب کھنچتے بھی تھے۔

ام سلمیٰ سے متعلق ان کی اپنی تحریر اہم ہے لیکن اس تحریر میں اصل حقیقت کا ایک گوشہ سامنے آنے سے رہ گیا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ وہ بھی آپ کے سامنے لے آیا جائے۔

7

طلبا اور خاص طور پر لڑکیوں کے لیے آفتاب اقبال کی شخصیت بہت کشش رکھتی تھی۔ فلسفے کے غائب دماغ پروفیسروں سے متعلق جو لطیفے مشہور تھے ان میں سے کچھ ان پر بھی صادق آتے تھے اور وہ کھوئے کھوئے بھی رہتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے لباس اور ذاتی صفائی ستھرائی کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ نکلتے ہوئے قد پر استری شدہ پینٹ، شرٹ اور مختلف رنگوں کے کوٹ اور نہایت نفیس نائیاں انھیں دوسرے پروفیسروں سے ممتاز کرتی تھیں۔ اور پھر وہ کنوارے بھی تو تھے۔ ایک شاندار اِلی جیبل بیچلر۔

ان کا پڑھانے اور سمجھانے کا انداز بھی بہت خوب تھا۔ وہ فلسفے کے مسئلے کو اپنے طلبا کے سامنے ایسے پیش کرتے کہ وہ انھیں خود اپنا ہی مسئلہ محسوس ہوتا۔ پہلے وہ انھیں سے پوچھتے کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے، اور پھر سب کی رائے لینے کے بعد یہ بتاتے کہ کون کون سے فلسفی نے اس مسئلے کے بارے میں کس کس رائے کا اظہار کر رکھا ہے۔ کوئی ذہین طالب علم اگر کسی فلسفیانہ مسئلے کا عمدہ حل ڈھونڈ تا تو اسے داد دیتے ہوئے کہتے کہ یہ حل تو فلاں فلسفی نے نکالا تھا۔

سلمیٰ کو یاد تھا کہ اقبال کے فلسفے کے بارے میں سیکڑوں مضامین اور درجنوں کتابوں میں مغز ماری کرنے کے بعد بھی وہ کنفیوز تھی کہ اقبال کا فلسفہ تھا کیا۔ لیکن آفتاب اقبال نے ایک دن اسے بالکل پانی کر دیا تھا۔ اس روز وہ کلاس میں آئے اور بلیک بورڈ پر جیومیٹری کی ایک شکل بنا دی۔
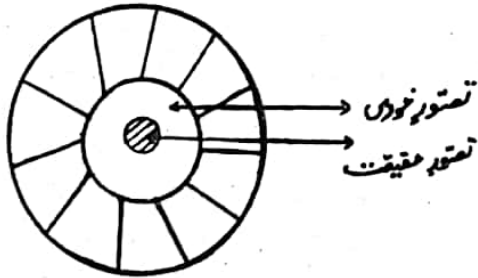
اس شکل میں ایک مرکزی دائرہ تھا، ایک ثانوی دائرہ تھا اور ایک دائرہ ایسا جس نے یہ دونوں دائرے اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ سب سے اندر کا دائرہ اقبال کا تصورِ حقیقت ہے۔ یعنی یہ کہ یہ کائنات کس نے بنائی اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ دوسرا دائرہ ان کا تصورِ خودی ہے۔ ان کے باقی تمام تصورات لکیروں کی صورت بالآخر اسی تصورِ خودی سے جا ملتے ہیں۔ اور یہ تصورِ خودی ان کے تصورِ حقیقت کی جانب مرکوز ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اقبال کے تصورِ حقیقت اور تصورِ خودی کی بھی تھوڑی تھوڑی وضاحت کر دی۔ سلمٰی اور باقی سارے طلبا اس پر بہت مسرور اور مطمئن تھے۔ انھیں مطمئن دیکھ کر آفتاب اقبال نے کہا، "ضروری نہیں کہ اس ماڈل پر میں خود بھی یقین رکھوں۔" اور کلاس کو حیران، پریشان چھوڑ کر چلتے بنے۔

8

میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی چمک دیکھ چکا تھا، لیکن میرا یہ خیال تھا کہ معاملہ بس یہیں تک رہے گا اور وہ دوسری لڑکیوں کی طرح ایک روز امتحانات سے فارغ ہو کر زندگی کے جھمیلوں میں گم ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ چھٹیوں پر جانے سے پہلے اس نے مجھ سے میرا موبائل نمبر مانگا اور میں نے اپنا اصول توڑتے ہوئے اسے نمبر دے دیا۔ گھر جا کر مجھے عجیب سی بے قراری رہی اور مجھے یہ جان کر خود پر غصہ آیا کہ میں اس کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس روز اس کا فون نہیں آیا، نہ اگلے روز، نہ اس کے اگلے روز۔ کلاس میں میں نے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ میں اس کے فون کا منتظر ہوں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ جب دوسرے لڑکے لڑکیاں کچھ پوچھنے کے لیے میرے گرد جمگھٹا لگائے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ میرے بہت قریب آ جاتی اور اس کے بازو یا کمر مجھ سے چھو سی جاتی۔ نہ جانے مجھے کون سی جھنجھلاہٹ تھی کہ میں نے اس سے کہا:

"جی، آپ کو بھی کچھ پوچھنا ہے؟"

وہ ایک دم گھبرا سی گئی اور "نہیں سر، کچھ خاص نہیں" کہتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔

مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اسے امبیرس کر دیا ہے۔ جب بھیڑ چھٹی تو میں نے اس سے کہا:

"بتائیے بھئی، کچھ آپ کو بھی پوچھنا ہے یا نہیں؟"

"سر، کوئی ایک کتاب بتائیے جو میں ان چھٹیوں میں پڑھ سکوں۔" اتنے وقت میں ایک سوال سوچنے کی مہلت تو اسے مل ہی گئی تھی۔

"ژولیا کرستیوا کو تو تم پڑھو گی نہیں۔ ایسا کرو، بشریٰ رحمان کا کوئی ناول پڑھ لو۔"

"سر، آپ مجھے ایسا ہی نالائق سمجھتے ہیں؟" اس کے معصوم سوال پر میں ہنس دیا تھا۔

"تم ایسا کرو کہ فیمی نزم پر کوئی اچھی سی کتاب سرچ کرو۔ اور پھر دیکھو کہ فیمی نزم والیاں خواتین کو جو حقوق دلانے کی بات کرتی ہیں، ان میں کون کون سے حقوق ایسے ہیں جو اسلام نے پہلے ہی عورت کو دے رکھے ہیں۔" یہ کہہ کر میں چلنے کے لیے مڑا تو اس کی آواز آئی:

"اچھا سر، پھر فون پر بات ہوگی۔"

چھٹیاں شروع ہونے کے تین چار روز بعد بھی اس کا فون نہیں آیا۔ میں یہ بات بھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کے فون کا منتظر تھا۔ ایک روز بارہ بجے کا گھنٹہ بجتے ہی اس کا ایس ایم ایس موصول ہوا:

"سر، دِس از سلمٰی۔ کین آئی کال یو رائٹ ناؤ؟"

"یس۔" میں نے انگریزی کے تین حرفوں پر مشتمل جواب بھیجا۔ کچھ سیکنڈ بعد میرے موبائل کی گھنٹی بج رہی تھی۔

"ہیلو سر، میں ہوں، میں... سلمٰی... آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا ناں سر؟"

"نہیں۔ فرمائیے۔"

"وہ مجھے ابو کی لائبریری سے اسلام پر تو بہت سی بکس مل گئی ہیں لیکن فیمی نزم پر بکس نہیں مل رہیں۔" یہ سنتے ہوئے میں مسکرایا۔ میں گوگل سرچ انجن سے اس کی کامیاب محبت کو جانتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ ہر موضوع پر ہر بری بھلی کتاب کا نام معلوم کرنے اور پھر اسے مقامی لائبریریوں میں ڈھونڈنے کی ماہر تھی، سو اس کا فون بات کرنے کا بہانہ ہی تھا۔ میں شاید خود بھی یہ چاہتا تھا، سو ہم باتیں کرتے چلے گئے۔ برقعے میں ملبوس اپنے جسم سے دور وہ صرف ایک آواز تھی۔ سریلی، کھنکتی ہوئی آواز، جو رات کے اس وقت ایک الگ جسم محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بیچ میں تین چار مرتبہ پوچھا بھی کہ کیا مجھے نیند تو نہیں آ رہی، لیکن میں چونکہ رات دیر تک پڑھنے کا عادی تھا اس لیے میں نے کہا کہ نہیں

آ رہی۔ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ مجھے اپنی ایک خاتون شاگرد سے رات کے اس ٹائم اتنی لمبی بات چیت نہیں کرنی چاہیے، لیکن میں نے اس احساس کو دبا دیا۔

ہماری گفتگو فیمی نزم اور اسلام کے کچھ دیر بعد اس موضوع پر ہونے لگی کہ میں گھر میں کیا کرتا ہوں، میرے مشغلے کیا ہیں اور مجھے کیا کیا پسند ہے۔ اس نے مجھے اپنی پسند، اپنی عادتوں اور اپنے مشغلوں کے بارے میں بھی بتایا۔ اور میں اس کی کھنکتی ہوئی سریلی آواز کے سحر میں جکڑا کتنی ہی دیر تک اس کی باتیں سنتا رہا۔ ان باتوں میں میرا حصہ زیادہ تر ہوں ہاں پر مشتمل تھا۔ رات کو جب تین بج گئے تو اس نے کہا:

"سر، ایک بات کروں، آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے نا؟"

"نہیں،" میں نے رات کے ڈھیلے پن سے بوجھل ہو کر کہا۔

"سر، مجھے لگتا ہے... میں آپ کو لائک کرنے لگی ہوں۔"

9

راوی کا بیان

آفتاب اقبال فلسفے کے ایک دیانتدار طالب علم تو ہو سکتے ہیں لیکن فکشن میں انسانی روداد کو دیانتداری سے بیان کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ سلمٰی میں آفتاب اقبال کی دلچسپی چھٹیاں شروع ہونے کے بعد ایک رات فون پر ہونے والی بات چیت سے پہلے ہی اس حد سے بڑھ چکی تھی جس حد تک ایک استاد کو اپنی کسی ذہین شاگرد سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس کے دیگر اسباب کے علاوہ ایک سبب ایک خواب تھا جو انھی دنوں آفتاب اقبال نے دیکھا اور وہ جس کے معنی کھوجنے کی کئی روز تک کوشش کرتے رہے۔

آفتاب اقبال نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے یونیورسٹی کے کمرے میں سلمٰی کے ساتھ بیٹھے ہیں کہ اتنے میں ایک موٹا سا شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے اور سلمٰی اس سے بغل گیر ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر آفتاب اقبال اپنے جسم میں حسد کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس کرتے ہیں۔ اس آدمی کے چہرے پر داڑھی ہے اور وہ ایک لمبی سی قمیض پہنے ہوئے ہے جو اس کے گھٹنوں سے بھی نیچے تک آتی ہے اور جس میں اس کی توند بے حد نمایاں ہے۔ اس آدمی کا چہرہ حد درجہ مہیب ہے لیکن سلمٰی اس پر صدقے واری ہو

رہی ہوتی ہے۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے آفتاب اقبال کے کمرے کی میز تک پہنچتی ہے جو اب نجانے کیوں بستر میں تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ آفتاب اقبال دیکھتے ہیں کہ سلمٰی نے اپنے عبایا کے نیچے اور اس مہیب شخص نے لمبی سی قمیض کے نیچے کچھ بھی نہیں پہن رکھا۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے منہ سے منہ ملا کر محبت کرنے لگتے ہیں۔ دکھ اور غصے سے آفتاب اقبال کا کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس مہیب شخص کی گردن دبوچ لیں لیکن انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ہاتھوں اور بازوؤں میں جان نہیں رہی۔ وہ بستر کے ارد گرد گھومتے ہیں تاکہ سلمٰی کی آنکھوں میں جھانک کر اسے کچھ شرم دلا سکیں۔ سلمٰی ان کی جانب دیکھتی بھی ہے مگر اسے ان کی حالت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ آفتاب اقبال کا جی چاہتا ہے کہ ابھی زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ زمین تو نہیں پھٹتی، البتہ ان کے کرب کی شدت سے خواب کا پردہ شق ہو جاتا ہے اور وہ خود کو اپنے بستر پر ایسے جاگا ہوا پاتے ہیں کہ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی ہوتی ہیں۔

اس خواب پر غور و خوض کرتے ہوئے آفتاب اقبال نے دو نکتوں پر خاص طور پر بہت غور کیا۔ ایک یہ کہ انھیں سلمٰی کے کسی غیر سے ملنے پر اس قدر حسد کیوں محسوس ہوا، اور دوسرے یہ کہ انھیں یہ خیال کیسے آیا کہ سلمٰی جیسی نفیس لڑکی، مہیب چہرے اور بھاری توند والے ایک شخص سے مخلوط ہو سکتی ہے۔ کیا سلمٰی کے والد صاحب اس کی شادی کسی توندیل مولوی سے کرنے کی تیاری کر رہے ہیں؟ آفتاب اقبال کے ذہن میں خیال آیا، لیکن وہ یہ سوال اپنی ہونہار شاگرد سے کرنے کی منطق تلاش نہ کر سکے۔

10

آفتاب اقبال کی والدہ امۃ الکریم تمام عمر اس قاعدے کی پابند رہیں کہ جب بھی گھر سے باہر قدم نکالتیں، برقع اوڑھ کر جاتیں۔ ان کے شوہر اقبال محمد خاں نے بہت کوشش کر دیکھی لیکن انھوں نے برقع ترک نہ کیا۔ وہ خود اقبال محمد خاں کی دور پار کی کزن تھیں اور ان سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اقبال محمد خاں ان کے حسن ہی سے متاثر ہوئے تھے اور پنجاب پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد بڑے اعتماد سے ان کے ہاں رشتہ بھجوایا تھا۔ انھیں ان کے گھر والوں کی یہ شرط عجیب لگی تھی کہ "نکاح ہمارا مولوی پڑھے گا،" لیکن وہ فرقہ بندی سے ایسے بلند تھے کہ کسی کرسچن خاتون کے ساتھ چرچ میں

شادی پر بھی تیار ہو جاتے، سو انھوں نے اس میں کوئی قباحت نہ سمجھی۔ لیکن شادی کے بعد انھیں امۃ الکریم حد سے زیادہ مذہبی لگیں۔ ان کے دوستوں کے ہاں بے پردہ جانے سے تو امۃ الکریم نے صاف انکار کر دیا۔ آفتاب اقبال کی اولین یادوں میں سے ایک یاد یہ تھی کہ وہ اپنی برقع پوش والدہ کی انگلی تھامے ہوئے خواتین کی ایک قطار میں کھڑے ہیں۔ اردگرد لوگ نعرے لگا رہے ہیں اور سب لوگ بہت خوش ہیں۔ رینگ رینگ کر چلتی ہوئی قطار میں ان کی والدہ بہت دیر بعد ایک ڈبے کے قریب پہنچتی ہیں اور آفتاب اقبال کاغذ کا ایک ٹکڑا اپنی والدہ کے ہاتھ سے لے کر اس ڈبے کے سوراخ میں ڈالتے ہیں۔ یہ 1970 کا واقعہ تھا جب پاکستان میں پہلے عام انتخابات ہوئے تھے۔ ان کے والد اور والدہ دونوں نے پیپلز پارٹی کو ووٹ دیا تھا۔ اقبال محمد خاں کی ڈائریوں سے معلوم ہوتا تھا کہ لاہور میں اپنی جوانی کے ایام میں وہ لیفٹ کی جانب میلان رکھتے تھے۔ بعد میں انھوں نے جو پیشہ منتخب کیا اس میں ان کا زیادہ تر تعلق جاگیرداروں سے ہی رہا اور انھوں نے جاگیرداروں کو دوست بھی بنایا لیکن جوانی کے زمانے کے رومینٹی سزم کی وجہ سے وہ بھٹو کو پسند کرنے لگے تھے۔ جبکہ آفتاب کی والدہ جماعتِ اسلامی کی جانب سے 'شوکتِ اسلام' جلوس کے بعد سے پیپلز پارٹی کی طرف مائل ہو گئی تھیں اور سمجھتی تھیں کہ ان کی برادری کا تحفظ ایک نیشنلسٹ بھٹو ہی کر سکتا ہے۔ آفتاب اقبال کو وہ دن اس لیے بھی یاد تھا کیونکہ بعد میں ان کی والدہ نے پھر کبھی کسی کو ووٹ نہیں ڈالا تھا۔

11

سلمٰی نے جب اس رات تین بجے کے قریب مجھ سے یہ کہا کہ "سر، مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کو لائک کرنے لگی ہوں،" تو مجھے اپنے دل میں مسرت کی ایک لہر سی پھوٹتی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس کی سرزنش کی تھی اور کہا تھا کہ رات بہت ہو چکی ہے، اب فون بند کر کے سو جاؤ۔

اگلے روز صبح اٹھا تو موبائل پر اس کا ایس ایم ایس موجود تھا:

"سر، آئی ایم ویری سوری۔ آئی ہوپ یو وونٹ مائنڈ۔ بٹ آئی بیگ یور پارڈن فور اینی تھنگ دیٹ یو مائٹ ناٹ ہیو لائکڈ۔"

میرے ذہن میں رات کی بات چیت چلنا شروع ہوئی اور میں نے خود کو بہت مسرور محسوس کیا۔ میں کچھ دیر اپنا موبائل ہاتھ میں پکڑ کر اس کا ایس ایم ایس دیکھتا رہا اور پھر اسے دو لفظوں کا جواب دیا:

"اٹس او کے۔"

شاید مجھے یہ جواب نہیں دینا چاہیے تھا۔ شاید میرے اس دو لفظوں کے جواب نے اس کے لیے کوئی دروازہ سا کھول دیا۔ بہرحال، اُس رات اس کا فون پھر آیا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ کل کی رات پر معذرت سے بات شروع کرے گی اور میں اس پر سختی سے واضح کر دوں گا کہ اس سے بات چیت کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ وہ اپنے ذہن میں کسی اور خیال کو جگہ دے۔ مگر اس نے کل ہی کے موضوع سے بات شروع کی جو بعد میں میری اور اس کی دلچسپیوں، اس کے خاندان کے چھوٹے چھوٹے دلچسپ قصوں اور اس کی کلاس فیلوز کے میرے متعلق خیالات کی جانب مڑ گئی۔ اس کے جسم سے ٹوٹی ہوئی اس کی آواز رات کے سمندر پر کسی دلفریب ہوا کی طرح تیرتی محسوس ہوتی اور مجھے لگا کہ ان چھوٹے چھوٹے قصوں سے زیادہ مزے دار اور کوئی بات نہیں جو میں رات کے اس وقت سننا چاہتا تھا۔

رات کی یہ فون کال روز کا معمول بن گیا اور پھر ایک دن اس نے کہا کہ سر، میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں نے اسے بتایا بھی کہ فون پر ہماری اتنی زیادہ بات ہو تو جاتی ہے، پھر ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن اس کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ آخر ایک دن اس نے مجھے ملاقات کا ایک ایسا انوکھا طریقہ بتایا کہ مجھے ملاقات کرتے ہی بنی۔

ہوا یوں کہ میں نے اسے کہا تھا کہ مجھے اس شہر میں بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ اگر کسی نے مجھے تمھارے ساتھ دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟ دوسرے یہ کہ تمھاری فیملی بھی بہت کنزرویٹو ہے۔ اگر کسی نے تمھاری شکایت لگا دی تو تمھارے لیے بھی گڑبڑ ہو جائے گی۔ ان خدشات کو اس نے بھی حقیقی قرار دیا تھا اور اس روز موبائل پر ہماری اتنی ہی بات ہوئی تھی۔ مگر اگلے روز اس نے مجھے ایس ایم ایس کر کے کہا کہ اس نے ملاقات کا ایک طریقہ ڈھونڈ لیا ہے، جو وہ مجھے رات کو بتائے گی۔ میں بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگا تھا۔

رات کو اس نے مجھے فون کیا تو اس کا موڈ عام دنوں سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ ایوب پارک میں ملیں گے۔ میرے پہچان لیے جانے کے خطرے کا حل اس نے یہ نکالا کہ میں ملاقات

کے روز جینز اور شرٹ پہن کر آؤں اور میری آنکھوں پر سیاہ چشمہ ہو۔ اس کے علاوہ اس نے مجھے اپنی شیو بڑھانے کا بھی مشورہ دیا۔ ہمیں ایک ہفتے بعد ملنا تھا اور اس دوران مجھے شیو بالکل نہیں کرنا تھی۔

''اور اپنا بندوبست کیسے کروگی؟''، میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''آپ سب نے مجھے ہمیشہ برقعے میں دیکھا ہے نا؟''

''ہاں... کیوں؟''

''میرے پہچان لیے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں آپ سے برقعے کے بغیر ملوں گی،''اس نے جواب دیا تھا۔

12

آفتاب اقبال سلمٰی سے تعلق کو صرف موبائل فون تک ہی رکھنا چاہتے تھے۔ بالمشافہ ملاقات سے وہ دو وجوہات سے احتراز کر رہے تھے۔ ایک تو بدنامی کا ڈر، اور دوسرے یہ کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ سلمٰی سے دوبدو ملاقات کرنے سے کوئی بات باقاعدہ طور پر طے کیے بغیر بھی ایک ایسی بات طے ہو جائے گی جسے وہ طے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سلمٰی ان میں اپنی دلچسپی کا اظہار کر چکی تھی اور انھیں لگتا تھا کہ ملاقات کی صورت میں یہ طے ہو جائے گا کہ وہ ان کی گرل فرینڈ ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کی شادی کی عمر نکل چکی ہے اور اگر انھیں کبھی شادی کرنا بھی ہوئی تو اپنی بہنوں سے کہہ کر ارینج میرج کر لیں گے۔ چالیس بیالیس سال کی عمر میں تیئیس چوبیس سال کی لڑکی کے ساتھ ڈیٹنگ کرنا انھیں اخلاقی طور پر کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

لیکن دوسری طرف سلمٰی کا حسن ایک پوشیدہ لیکن پرومیسنگ قسم کی دعوت کی صورت میں ان کے سامنے تھا۔ برقعے میں سے اس کی آنکھیں بہت خوبصورت لگتی تھیں۔ لیکن سلمٰی سے ملنے سے احتراز کرنے کی سب سے نمایاں وجہ ان کا وہ راز تھا جسے انھوں نے یونیورسٹی میں محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اگر کسی کو وہ راز معلوم ہو جاتا تو وہ خود کو اس کی تردید کرتے ہوئے پاتے۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ مسلمانوں کی کسی بھی فقہ پر عملدرآمد چھوڑ چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سلمٰی کو بھی جیسے ہی ان کے راز کا علم ہوگا، وہ انھیں کسی اور نظر سے دیکھنے لگے گی۔ انھیں معلوم تھا کہ کسی نہ کسی مرحلے پر انھیں سلمٰی کو

اس بارے میں بتانا ہی ہوگا، اور انھوں نے طے کر رکھا تھا کہ وہ اس بات کو پوشیدہ نہیں رکھیں گے۔ مگر ان کے خیال میں ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا تھا کہ اس بارے میں بات کی جاتی۔ ان کے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ شاید وہ مرحلہ آئے ہی نہیں تو خواہ مخواہ ایک بے کار سی بات سلمٰی کو بتانے سے کیا حاصل ہوگا۔

اب جب سلمٰی نے ان سے بے پردہ ملنے کی بات کی تو ان کے اندر کا کھوجی ذہن بیدار ہو گیا۔ سلمٰی کا یہ کہنا ان کے لیے انتہائی دعوت انگیز ثابت ہوا تھا کہ وہ ملاقات کے روز برقعے میں نہیں ہو گی۔ ایک دراز قد لڑکی، جس کے جسمانی خطوط کا وہ برقعے سے صرف اندازہ ہی کر سکتے تھے، ان سے بے پردہ ملاقات کرنے والی تھی۔ اس کی لانبی لانبی انگلیاں اور انتہائی گلابی ہتھیلیاں، اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، اس کے پیر اور ان کے اچھی طرح ترشے ہوئے ناخن اور ان ناخنوں کی سفیدی میں امڈتا ہوا گلابی خون انھیں رہ رہ کر یاد آتا اور وہ سوچتے کہ نہ جانے سلمٰی کا چہرہ اور باقی جسم کیسا ہوگا۔ اس کے چہرے پر حجاب پڑا ہوتا تو اس کے گال پھولے پھولے سے لگتے۔ اور ناک جیسی بھی تھی، حجاب میں سے ستواں دکھائی دیتی۔ جانے وہ اندر سے کیسی ہوگی۔ جانے وہ کیسا لباس پہنے ہوگی۔ جانے وہ اس لباس میں کتنی خوبصورت لگ رہی ہوگی۔ انھوں نے اپنے اندر یہی سب کچھ کھوجنے کی ایک طاقتور اور حیرت انگیز خواہش امڈتے ہوئے محسوس کی اور انھوں نے یہ جانا کہ کھوج کی اس خواہش میں انھیں جتنا لطف آ رہا ہے اتنا کسی فکری کھوج میں کبھی نہیں آیا تھا۔ اگلے روز ایک ایس ایم ایس کے ذریعے انھوں نے سلمٰی سے ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی۔

13

میں آج تک خود کو شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں کر سکا اور سلمٰی سے پہلے کسی لڑکی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا بھی نہیں پڑا۔ امی اور بہنوں کے کہنے پر میں نے شادی کے معاملے پر جب بھی غور کیا، اس سے دور بھاگنے کی ایک ایسی وجہ معلوم ہوئی جو میں انھیں نہیں بتا سکتا تھا۔ میرے والد اقبال محمد خاں نے دو شادیاں کی تھیں۔ جن دنوں وہ دوسری شادی کے چکر میں تھے، گھر میں عجیب سا ماحول تھا، جیسے ہم سب کسی بڑی آفت کا انتظار کر رہے ہوں۔ ابو ہم سے خوشی خوشی بات کرنے کی کوشش کرتے لیکن ہم سب سہمے ہوئے رہتے۔ بلکہ میں تو غصے میں بھی رہتا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر کوئی

بات کرنے کی کوشش کرتے تو بازو چھڑا کر بھاگ جاتا۔ بچوں کے لیے باپ کا کردار مثالی ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ ان کا باپ خواتین میں دلچسپی لیتا ہے اور ان کے سروں پر ایک اور امی تھوپنے کے چکر میں ہے۔ ہور ابو کی دوستیاں تو اور بھی عورتوں سے تھیں۔ پتا نہیں کیسا شوق تھا ان کا۔ جی ہی نہیں بھرتا تھا ان کا عورتوں سے۔ اور عورتیں بھی ایسی احمق تھیں کہ سر جھکا کر ان کی باتوں میں آجاتی تھیں۔

ابو سے علیحدگی کے بعد امی ہمیں ان کے خلاف باتیں نہیں کرنے دیتی تھیں۔ خود آہستہ آہستہ سلگتی رہتیں۔ انھوں نے ابو کا جب بھی ذکر کیا، ان کی تعریف ہی کی۔ کہتی تھیں وہ بہت دیانتدار تھے۔ ”امی! جو آدمی اپنی بیوی سے بددیانتی کرے وہ کہاں کا دیانتدار ہوا؟“ میں پوچھتا تھا اور امی مجھے جھڑک دیتی تھیں۔

”کچھ لوگوں میں رومینٹک سٹریک ہوتی ہے۔ جیسے کسی کو بچپن سے کوئی بیماری نہیں ہوتی؟ ویسے ہی،“ انھوں نے ایک روز بتایا تھا۔

امی نے جانے کیسے اتنی بڑی ناانصافی برداشت کر لی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے ابو سے خرچہ وصول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ خود ایک اسکول میں پڑھانے لگیں۔ باقی وقت میں بھی انھوں نے دکانوں سے کپڑوں کی سلائی کا کام پکڑ لیا تھا۔ مجھے یہ سب دیکھ کر غیرت آتی تھی، اس لیے میں نے ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی تھی۔ میرا اپنا خرچہ ان ٹیوشنز سے ہی نکل آتا تھا۔

ابو ایسے کیوں تھے؟ انھیں کیا ملتا تھا اس سے؟ کیا کمی تھی ان کی زندگی میں جو وہ اتنی عورتوں کے پیچھے بھاگتے تھے؟ میں ان سوالوں پر ہمدردانہ غور ان کی وفات کے بعد ہی شروع کر سکا۔ ان کے بھائی نے ان کی جائیداد اپنے نام کرانے کی کوشش کی تھی۔ میں جب مقدمہ جیت گیا تو میں نے ان کی جائیداد میں سے ایک پائی نہیں لی۔ انھوں نے چار پانچ سو کتابیں اکٹھی کر رکھی تھیں، بس وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے امی کا فقرہ کئی مرتبہ میرے کانوں میں گونجا ہے:

”کچھ لوگوں میں رومینٹک سٹریک ہوتی ہے۔ جیسے کسی کو بچپن سے کوئی بیماری نہیں ہوتی؟ ویسے ہی۔“

ان کی وفات کا دن مجھے یاد ہے۔ صبح صبح مجھے فون آیا تھا کہ ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ چچا نے مجھے منڈی بہاء الدین بلوایا تھا۔ میں فون سنتے ہی سمجھ گیا تھا کہ معاملہ آگے کا لگتا ہے، ورنہ مجھے منڈی نہ بلوایا جاتا۔ امی کو میری باتوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ فون چچا کا ہے۔ وہ میرے سامنے کھڑی لرز رہی

تھیں۔ پھر وہ صوفے پر ڈھے گئیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ جب میں فون رکھ کر ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے میرا گریبان پکڑ لیا اور پوچھنے لگیں کہ بتاؤ تمھارے ابو کو کیا ہوا ہے۔ وہ رو رو کر ضد کرنے لگیں کہ میں انھیں ابھی اور اسی وقت منڈی لے چلوں۔ تمام راستے وہ روتی ہوئی گئی تھیں۔ ہونٹوں پر 'یا حفیظ یا سلام' کا ورد تھا، جس کا لہجہ کبھی التجا کا ہوتا، کبھی شکوے کا اور کبھی وہ لفظ ان کی ہچکیوں میں گھٹتے رہ جاتے۔

14

ابو کے پرانے خدمتگار یار محمد سے میری ایک طویل نشست ہوئی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ ابو کا انتقال کیسے ہوا۔ اس نے بتایا تھا کہ ابو صبح سویرے جیپ میں مردہ حالت میں پائے گئے تھے۔ وہ جگہ رسول ہیڈ ورکس کے قریب تھی اور دیہاتیوں نے ہیڈ ورکس کے کسی افسر کو فوراً اطلاع دی تھی جو رہتا بھی قریب ہی تھا۔ اس افسر نے میرے ابو کو فوراً پہچان لیا تھا۔ یار محمد کے مطابق اس نے اسے بتایا تھا کہ ابو کے بال گیلے تھے اور جسم پر کائی اور مٹی لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے صرف انڈرویئر پہن رکھا تھا جس کے اوپر ایک چھوٹا سا تولیہ پڑا تھا۔ یار محمد کا خیال تھا کہ ابو رسول ہیڈ ورکس کی جھیل میں نہا کر نکلے ہوں گے۔ لیکن ان کے باقی کپڑے جیپ سے کچھ دور ایک ویران قطعے سے ملے تھے۔ یار محمد حیران تھا کہ ابو نہائے جھیل میں تھے تو ان کے کپڑے اتنی دور کیسے پائے گئے، جبکہ انھیں یا تو جیپ میں ہونا چاہیے تھا یا جھیل کے کنارے پر۔ اس نے اس جگہ کا بھی جائزہ لیا تھا۔ وہاں ان کے قدموں کے بہت سے نشان تھے اور بندوق بھی وہیں پڑی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ابو کافی دیر وہاں رہے تھے۔

ان کی تدفین کے بعد جب مہمان کم ہوئے تو میں ان کے بیڈ روم میں گیا۔ یار محمد نے اس کے دروازے پر تالا لگا رکھا تھا۔ ان کے بستر کے پیچھے دو الماریاں تھیں اور ان کے درمیان ایک کیبنٹ بنی ہوئی تھی۔ بستر کے ساتھ چھوٹی سی ایک میز تھی جس کی دراز کھولی تو اس میں چابیوں کا گچھا تھا۔ میں نے چابیاں نکالیں اور کیبنٹ کا لاک کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک چابی لگ گئی۔ کیبنٹ کھلی تو اس میں طرح طرح کی شراب کی بوتلیں نظر آئیں۔ میں نے یار محمد کو دیکھا تو وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں نے میز پر پڑے گلاس کو سونگھا۔ ابو رات کو شوق فرماتے رہے تھے۔ مراد آباد کے تھے ناں، اور مراد آباد شاہ

جہاں کے بیٹے مراد بخش کے نام پر قائم ہوا تھا جو شراب کا بہت رسیا تھا اور جسے اورنگزیب نے شراب کے پیالے ہی میں زہر دیا۔

ان کا بیڈ آراستہ تھا اور ساتھ کی میز پر ان کی ڈائری رکھی تھی۔ میں نے ان کی ڈائری کھولی تو اس میں تفصیلی تحریریں بہت کم تھیں۔ کتابوں میں ان کی اور بھی ڈائریاں ملیں جن میں منڈی بہاء الدین کے آثارِ قدیمہ کے بارے میں ان کے نوٹس، ان کی ذاتی یادداشتیں، اشعار کا انتخاب اور ناقابلِ فہم قسم کا حساب کتاب، سب ایک ساتھ لکھا ہوا تھا۔ میز پر رکھی ان کی ڈائری میں آخری اینٹری پندرہ نومبر کی تھی، یعنی ان کی وفات سے صرف ایک دن پہلے کی۔ انگریزی کے اس فقرے کا context فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن لگتا یہی تھا کہ وفات سے پہلے اپنی آخری رات وہ اسی معاملے پر غور کرتے رہے تھے۔ وہاں لکھا تھا:

Why you had to do this Alamgir?

15

ابو کی کتابوں میں اورنگزیب عالمگیر پر الگ سے کوئی کتاب نہیں تھی۔ ان کی باقی کتابیں دیکھ کر بھی تاریخ سے ان کی بہت زیادہ دلچسپی کا کوئی ثبوت نہیں ملا، لیکن آثارِ قدیمہ سے انھیں دلچسپی ضرور تھی، جسے آپ قدیم تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تزکِ جہانگیری اور تزکِ بابری وہاں ضرور موجود تھیں۔ امی نے بتایا تھا کہ ان کا پسندیدہ مغل بادشاہ جہانگیر تھا جو ان کی طرح عاشقانہ مزاج رکھتا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شاید وہ اپنی وفات کی رات جہانگیر کے اس پوتے کے بارے میں سوچ رہے تھے جو بہت زیادہ مذہبی واقع ہوا تھا۔

"تمھیں ایسا کیوں کرنا پڑا، عالمگیر؟" اس فقرے سے لگتا ہے کہ وہ اورنگزیب کے کسی اقدام کی توجیہ تلاش کر رہے تھے۔ یہ اقدام کیا ہو سکتا تھا؟ اپنے باپ شاہجہاں کو قید کرنا؟ اپنے بھائیوں کا قتل؟ مراد بخش کا قتل؟ دارا شکوہ کا قتل؟ سرمد کا قتل؟ یا دکن پر اس کی چڑھائی؟ شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک کام نہ کیا جاتا تو ہماری تاریخ کا دھارا کسی اور سمت بہتا۔ یا شاید وہ اپنی رومینٹک طبیعت کے باعث سرمد کے قتل پر اداس تھے، جو شاعر تھا۔ یا اس بات پر کہ اورنگزیب نے

اپنی بیٹی زیب النسا کی شادی نہیں ہونے دی تھی جو 'مخفی' کے تخلص سے شاعری بھی کرتی تھی۔ شاید اورنگزیب کے دور کے پورے پچاس سال ان کی نظر میں تھے اور اس فقرے میں انھوں نے اس کے پورے دور کا محاکمہ کر کے یہ سوال اٹھایا تھا کہ "تمھیں ایسا کیوں کرنا پڑا، عالمگیر؟"

16

ابو کی ڈائریوں سے معلوم ہوا کہ وہ مونگ اور اس کے قرب و جوار کے دیہات اور یہاں کے لوگوں اور خاص طور پر عورتوں کے بارے میں تحقیقات کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ، یا ان میں سے کچھ، یونانیوں کی اولاد ہیں۔ ان کے ٹھہرے ہوئے نقوش انھیں اپنے دعوے کا ثبوت لگتے تھے۔ وقت کے ساتھ ان کا رنگ گندمی ہو گیا تھا لیکن ان کی جسمانی ساخت اور چہرے کے نقوش میں انھیں یونانیت دکھائی دیتی تھی۔

ابو کی ڈائریوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ منڈی بہاء الدین کے قرب و جوار میں 'نکائیا' کا وہ شہر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے جو سکندرِ اعظم نے راجا پورس پر فتح کے بعد دریائے جہلم کے کنارے آباد کیا تھا۔ نکائیا کے علاوہ دوسرا شہر اس نے اپنے محبوب گھوڑے بوسی فیلس یا بوسی فالیا کے نام پر آباد کیا تھا۔ ابو نے ہنگری کے ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ سر مارک بورل سٹائن کے حوالے سے درج کیا تھا کہ وہ شہر پھالیہ ہے جو اب منڈی بہاء الدین کی ایک تحصیل ہے۔ ایک اور جگہ ابو نے لکھا تھا کہ قصبہ 'ہیلاں' اصل میں ہیلن کے نام پر آباد کیا گیا تھا جو یونان میں ایک عام نام تھا اور شاید سکندر کی ایک ملکہ بھی اسی نام کی تھی۔

ابو کی ڈائری میں یونانی تاریخ دانوں آریان، جسٹن اور ڈایوڈورس کی ان کتابوں سے اقتباسات بھی موجود تھے جو ان کے کتب خانے میں بھی موجود تھیں۔ ایک جگہ پر انھوں نے لکھا ہے کہ دریائے جہلم کے کنارے 'مونگ' کا قصبہ ہی 'نکائیا' ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے نیچے انگریزی میں ایک اور فقرہ لکھا ہے، جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی:

I believe her ancestors were Nicaeans.

میرا خیال ہے کہ وہ کوئی مقامی عورت ہو سکتی تھی۔ ابو کا ایک وفادار ملازم 'یارو گوندل' تھا۔ اس سے اس کے بارے میں پوچھا جا سکتا تھا، مگر میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا۔ ایسا بھی ممکن تھا کہ وہ یارو گوندل کی کوئی

قریبی رشتہ دار نکلتی اور میرے کسی سوال پر یا رو کو ابو پر ایسا کوئی شک ہو جاتا کہ ابو اس کی کسی رشتہ دار خاتون میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اور وہ خاتون اگر اس کی بہت قریبی خاتون نکلتی تو مسئلہ بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ ان دیہاتی لوگوں کا پتا نہیں ہوتا کہ کس بات پر غصے میں آ جائیں اور مرنے مارنے پر تل جائیں۔ ابو کی جانب سے نکائیا کی تلاش کی طرح ان کی ڈائری کی اس 'ہز' کی تلاش بھی دلچسپ ہو سکتی تھی، لیکن ابو سے وابستہ خواتین نے میری اور میری امی کی زندگی میں پہلے ہی ایسی مشکلات پیدا کر رکھی تھیں کہ میں ان سے نفرت کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ نفرت ایک تجسس میں بدلتی رہی تھی۔

ابو کی ڈائریوں کے مطالعے کے بعد سکندرِ اعظم کے موجودہ پاکستانی علاقوں پر حملے کے بارے میں پڑھنے کی مجھ میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ ابو نے ڈائریوں میں سکندر کی پاکستانی علاقوں میں آمد کے کچھ نقشے پنسل سے بنائے ہوئے تھے۔ میں انھیں کوئی بڑی دریافت سمجھا تھا، لیکن بعد میں میں نے ہیرلڈ لیم کی سکندرِ اعظم پر کتاب پڑھی تو مجھے معلوم ہوا کہ سکندر کا رُوٹ تو یورپی مصنفین نے بڑی حد تک دریافت کر لیا ہے۔ وہ راجا پورس سے پہلے راجا امبھی سے ملا تھا جو اس کا دوست بن گیا تھا۔ پھر دریائے جہلم کے پار اس کی راجا پورس سے مشہور جنگ ہوئی۔ اس کے بعد وہ پنجاب میں آگے بڑھتا ہوا دریائے بیاس تک گیا۔ اس کی فوج ویسے ہی کئی برسوں کی لڑائیوں سے تنگ آ چکی تھی اس لیے اس نے آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ سکندر دنیا کا آخری کونا دریافت کرنا چاہتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ دریائے گنگا کے بعد وہ دنیا کے آخری کونے اور سورج کے طلوع ہونے کی سرزمین تک پہنچ جائے گا۔ فوجیوں کی بے صبری کے بعد وہ دریائے بیاس سے آگے تو نہ گیا، لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ من حرام زادہ تو حجتوں کے ڈھیر، سو اس کے مصداق وہ جس راستے سے آیا تھا اسی سے واپس نہ گیا بلکہ اس نے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ اس کے زمانے میں ارسطو تک کا خیال یہ تھا کہ دریائے نیل دریائے سندھ سے نکلتا ہے۔ دریائے سندھ ختم ہو گیا تو اس نے مکران کے ساحل پر سمندر کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں اس کی فوج کا بڑا حصہ بھوک، بیماری اور سیلاب کے باعث مر کھپ گیا۔ ابو کی ڈائریوں میں یہ تمام تفصیلات ٹکڑے ٹکڑے کر کے درج تھیں۔ وہ اگر یورپی مصنفین کے انکشافات میں اضافہ کرنا چاہتے تو انھیں تاریخ کے بجائے آرکیالوجی میں دلچسپی لینا چاہیے تھی۔ تاہم اس سلسلے میں وہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ضرور کہ مونگ قصبے کی کھدائی کرنی چاہیے،

مگر اس سمت وہ کوئی پیش رفت نہ کر سکے۔ باقی دنیا سے کٹے ہوئے بعض ایسے لوگوں کے بارے میں پتا چلا ہے جنھوں نے ارسطو اور دیگر یونانیوں کی دریافت کردہ باتیں کئی صدیاں گزرنے کے بعد اپنے طور پر دریافت کیں۔ ابو بھی اپنے اس خبط میں ایسے ہی ایک آدمی لگے جسے شاید یہ غلط فہمی ہو کہ وہ کسی اہم دریافت کے قریب ہے۔

عورتوں کے بارے میں انھیں خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنی ڈائریوں میں ان کے پورے نام نہیں لکھے تھے اس لیے انھیں دریافت کرنا کافی ناممکن قسم کا کام تھا، اور شاید بے کار بھی۔ کچھ نام ہندی میں بھی تھے اور میں حیران تھا کہ ان ناموں کی عورتیں انھیں منڈی بہاء الدین اور پنجاب کے دیگر دیہی علاقوں میں کہاں سے ملی ہوں گی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نام انھوں نے خود ان عورتوں کو دیے تھے اور انھیں وہ مخصوص نام دینے کا باعث ہندوؤں کی پرانی کتاب کوک شاستر تھی جس میں انھوں نے عورتوں کی مختلف قسموں کے نام پڑھے تھے۔ سو انھوں نے عورتوں کی جسمانی خصوصیات کے لحاظ سے کسی کو پدمنی اور کسی کو شانکھنی قرار دیا تھا۔

بہرحال، ابو کی ڈائریوں سے کوئی ایسی کتاب نہیں بنائی جا سکتی تھی جس میں کوئی ایسی تفاصیل ہوتیں جو دنیا کے لیے مفید ثابت ہو سکتیں۔ خواتین سے متعلق باتیں مفصل نہیں تھیں اور ان میں بہت کچھ ان کے انفرادی اسٹائل میں چھپا ہوا تھا۔ میں ایک مدت تک ان کے مطالعے کے بعد متعدد باتوں کی تہہ تک پہنچ تو گیا لیکن یہ ساری تفاصیل ایک بیٹے کے لیے خاصی شرمناک تھیں۔

17

ایوب پارک پہنچ کر آفتاب ہر لڑکی کو دیکھ کر سوچتے رہے کہ یہ سلمٰی تو نہیں۔ انھیں پارک میں اکیلے گھومنا عجیب لگ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرتے جیسے انھیں یہ شک ہو کہ وہ کہیں اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر نہ ہو گئی ہو۔ سیاہ سن گلاسز انھوں نے لگا تو لیے تھے لیکن انھیں بار بار اتار لیتے تھے۔ پھر یہ سوچ کر ناک پر دھر لیتے کہ کوئی پہچان ہی نہ لے۔ اچانک انھیں اپنے قریب ایک باریک سی نسوانی آواز سنائی دی۔

"ہائے!"

وہ گھبرا کر پلٹے اور گلاسز اتار کر دیکھا۔ وہ وہی تھی۔ ہرے رنگ کی قمیض پہنے ہوئے جس پر گہرے ہرے رنگ کے پھول کاڑھے ہوئے تھے۔ اس نے سر پر دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا جس سے چادر کی کمی پوری کرنے کی بھی کوشش کی جا رہی تھی۔ ایک کہنی میں اس نے پرس لٹکا رکھا تھا۔ اور ہاتھوں میں ایک شاپنگ بیگ تھا جس میں اس کا سیاہ برقع پڑا ہوا تھا۔ اس نے یہ برقع پارک کے واش روم میں اتار کر شاپنگ بیگ میں رکھ لیا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے اور پھر تیزی سے چلنے لگے، جیسے پارک میں کوئی چھپنے کی جگہ ڈھونڈ رہے ہوں۔

''سر، آپ پہچان تو گئے نا مجھے آسانی سے؟''

''ہاں ہاں، ایسی بھی کیا بات ہے۔'' لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ خود انھیں ''ہائے'' نہ کرتی تو وہ اسے پہچان نہ پاتے۔

کچھ دیر بعد وہ ایک بنچ پر ایک دوسرے سے دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ آفتاب نے اپنے دل میں یہ خواہش اندتی محسوس کی کہ وہ سلمٰی کے سامنے بیٹھ جائیں تا کہ وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکیں مگر انھیں اپنے وقار کا بھی خیال تھا۔ انھوں نے سوچا کہ جب سلمٰی ان سے بات کرے گی تو وہ اسے اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کر لیں گے۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر سلمٰی بولی:

''کل فون پر آپ کافی پریشان لگ رہے تھے۔''

''ہاں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ پرویز مشرف القاعدہ والوں کو پاکستان میں پناہ دے رہا ہے۔ اللہ کرے یہ بات غلط ہو، لیکن اگر صحیح ہوئی تو امریکہ القاعدہ والوں کی تلاش میں پاکستان میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔''

''آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ کچھ نہیں ہوگا ایسا۔ اور امریکہ آ بھی گیا تو کیا ہوگا؟ ہم نے چوڑیاں تو نہیں پہن رکھیں۔''

آفتاب نے نظریں سلمٰی کی بانہوں پر گئیں۔ بائیں کہنی پر قمیض کے بازو کے آگے اس نے ہرے ہی رنگ کا ایک بریسلیٹ پہن رکھا تھا۔ ''جی، آپ نے تو نہیں پہن رکھیں کم از کم۔''

''نہیں، وہ ہاف سلیوز کے ساتھ پہنتی ہوں۔''

آفتاب مسکرائے، پھر بولے، ''پھر بھی مسئلہ تو رہے گا نا۔ افغانستان نے کیا کر لیا امریکہ کے

مقابلے میں؟ بھئی یہ ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے ٹیکنالوجی کا۔ صرف مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی سے کام نہیں بنے گا۔''

''تو پھر کیسے بنے گا کام؟'' سلمٰی دلنوازی سے اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی کو بائیں ہتھیلی پر مارتے ہوئے بولی۔ اس نے یہ الفاظ ایسے لہجے میں ادا کیے تھے جیسے ان کا مطلب کچھ اور بھی بنتا ہو۔ آفتاب یہ سوچ کر شرم سے مسکرا دیے۔

''نہیں سلمٰی نہیں،'' آفتاب اقبال نے اپنی عینک کے پیچھے اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا، ''میں صدقِ دل سے یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہماری تاریخ نے ایک خاص سمت میں سفر شروع نہ کیا تو ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔''

''اسلام کی نشاۃ الثانیہ کی کوشش کرنے والے بھی تو بہت مخلص لوگ ہیں، وہ ہماری تباہی کے ذمہ دار کیسے ہو سکتے ہیں،'' سلمٰی اپنی کہنیوں کو بے بسی سے ہوا میں مارتے ہوئے بولی۔

''یہ نشاۃ الثانیہ کے خواب صرف دھوکا ہیں سلمٰی، صرف دھوکا۔ اسلامی دنیا ہو یا چین، جاپان ہو یا ہندوستان، اب مغربی تہذیب کو وہی تہذیب شکست دے گی جو ایسے نئے ذرائع پیداوار خود پیدا کر لے جو مغربی ذرائع پیداوار سے آگے کی چیز ہوں اور دوسرے یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اور فکر و خیال کی دنیا میں بھی وہ لوگ ایسے نئے آئیڈیاز لے کر آئیں جو مغربی فکر سے آگے کے ہوں۔ مسلمان ملک تو اس ریس میں کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ جاپان ٹیکنالوجی میں آگے ہے لیکن ہم اسے مشرق کی طرف مغرب ہی کی ایک توسیع قرار دے سکتے ہیں۔ رہے چینی، تو وہ تو کاپی کرنے کے ماسٹر ہیں، پھر ان کا نظام بھی جامد قسم کا ہے۔ ان کی جی ڈی پی گروتھ جتنی مرضی ہو جائے، وہ مغرب سے نیچے ہی رہیں گے۔''

''اقبال نے تو کہا تھا کہ گراں خواب چینی سنبھلنے لگے....''

''اقبال کی کیا بات ہے۔ اصل میں ان کے زمانے میں شپنگلر کی کتاب ڈکلائن آف دی ویسٹ کا بڑا شور تھا۔ پھر مختلف کونوں سے خدا مر گیا، مغرب مر گیا، یہ مر گیا، وہ مر گیا کا شور اٹھ رہا تھا۔ دو بڑی جنگوں کے درمیان کے عرصے میں واقعی یہ لگتا تھا کہ مغرب والے آپس میں ہی لڑ لڑ کر مر جائیں گے۔ اس کے بعد مغلوب دنیا نے مغرب ہی کی دی ہوئی آزادیوں اور انسانی حقوق کا مزہ تو چکھا لیکن خود مغرب پر غلبہ پانے کا خواب خواب ہی رہا، اور ابھی مزید کافی عرصے خواب ہی رہے گا۔''

آفتاب اقبال نے اپنی دانش بگھاری۔

''لیکن سر، انسان کو مساوات کا درس تو اسلام نے دیا تھا۔ عورتوں کو عزت تو اسلام نے ہی دی تھی؟''

''تو دیتے نا عورتوں کو عزت! تو پیدا کرتے نا مساوات! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو میثاق مدینہ میں مسیحیوں کو برابر کا شہری قرار دیا تھا نا۔ تو غیر مسلموں کو برابر کا شہری کیوں نہیں سمجھتے مسلمان؟ غلامی کا انسٹیٹیوشن ختم کرنے کے لیے بھی ابراہام لنکن کو آنا پڑا۔ عورتیں ہیں تو وہ بے چاری ذلیل ہو رہی ہیں۔ کسی غیرت مند بھائی سے اتنا نہیں ہوتا کہ والدین کے مرنے کے بعد جائیداد میں سے شریعت کے مطابق اپنی بہنوں کا حصہ ہی انھیں دے دے۔ سب بے شرمی سے سٹامپ پیپر لے کر اپنی بہنوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں کہ اپنا حصہ ہمارے نام کر دو۔ چودہ سو سال تک مسلمان اس بات پر کشت و خون کرتے رہے کہ کسی ایک بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کا کون سا بیٹا بادشاہ بنے گا۔ ارے بھئی، کوئی قانون ہی بنا دو کہ باپ کے بعد سب سے بڑا بیٹا بادشاہ بنے گا۔ ویسٹ بھی تو ہے جنھوں نے ٹرائیل اینڈ ایرر کے بعد منصفانہ الیکشن کا طریقہ سوچ لیا۔ یہ ایسی کون سی آئین سٹائین کی تھیوری تھی جو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی! اور بادشاہ؟ یہ کہاں سے آ گئے اسلام میں؟ اسلام میں تو سب برابر تھے، پھر ملوکیت کہاں سے آ گئی اسلام میں؟''

''یہ تو آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں، سر۔ مودودی صاحب بھی یہی کہتے ہیں،'' سلمیٰ جو ان کی تقریر کے دوران اپنی مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے مسلسل ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی، کچھ قائل ہوتے اور کچھ قائل نہ ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاہاہا!'' آفتاب اقبال نے قہقہہ لگایا۔ ''تو ہم تو ہم خیال نکلے! آپ خواہ مخواہ مجھے لبرل اور بے دین کہا کرتی تھیں،'' آفتاب اقبال نے سلمیٰ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''میری بھی یہی خواہش تھی کہ آپ میرے ہم خیال ہوں،'' سلمیٰ نے کہا۔

''انسان خواہش کرے تو دنیا کے کسی بھی شخص کو اپنا ہم خیال تصور کر سکتا ہے۔ جب بندر اور انسان میں ننانوے فی صد چیزیں کامن ہیں، تو انسان اور انسان میں تو اس سے زیادہ ہی ہوں گی نا۔''

''اس حساب سے تو آپ پہلے سے ہی میرے ہم خیال ہوئے۔''

''نہیں۔ جس روز آپ نے میرے اپنا ہم خیال ہونے کی خواہش کی، اسی روز ہم دونوں ہم خیال ہو گئے۔''

''ہم خیال... ویسے یہ کوئی اچھا لفظ تو ہے نہیں۔ آج کل پرویز مشرف کی حامی مسلم لیگ نے بھی اپنے نام کے ساتھ 'ہم خیال' لگایا ہوا ہے۔''

''گئی بھینس پانی میں...''

''ہاہاہا... واقعی! ہم کیا ایوب پارک میں اسی قسم کی باتیں کرنے آئے ہیں؟''

''تو پھر اور کس قسم کی باتیں کرنے آئے ہیں؟''

''کسی اور قسم کی۔ مثلاً آپ کو اور کس کس قسم کی باتیں آتی ہیں؟''

''مجھے تو آپ نے بلایا اور میں چلا آیا۔ آپ کوئی اور موضوع سجیسٹ کریں۔ شاید ہم اس پر بات کر سکیں۔''

''آپ کے گھر میں کوئی نہیں رہتا۔ پھر آپ ہر روز دھلے ہوئے اور خوب استری کیے ہوئے کپڑے کیسے پہن لیتے ہیں؟''

''یہ کام ڈرائی کلینرز کر دیتا ہے۔''

''اور یہ سینٹ؟ یہ کون سا یوز کرتے ہیں آپ؟''

''پوائزن۔''

''ہوں ں ں ں ں۔ اور آپ کی ایج کتنی ہے؟''

''فورٹی ٹو۔''

''تو آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

''فرصت ہی نہیں ملی۔''

''آج کل تو فرصت ہے نا؟ چھٹیاں بھی ہیں۔''

''تو کس سے کروں؟''

اس کے جواب میں سلمیٰ مسکرائی، پھر شرمائی، پھر بولی:

''میں تو بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔'' پھر کچھ دیر خاموش رہ کر کہا، ''گلاب آپ کو کون سے کلر کا پسند ہے؟'' اور آفتاب اقبال کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر گلاب کی کیاری کی جانب بڑھی اور گلاب کے ایک پودے پر کوئی ایسا پھول دیکھنے لگی جسے وہ توڑ سکے۔ آفتاب اقبال نے پہلی مرتبہ اس کے سراپا کو

دیکھا۔ وہ اچھے قد کاٹھ کی لڑکی تھی اور دھوپ میں ہری قمیض کے نیچے اس کی سفید شلوار سے اس کی ٹانگیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ سلمیٰ کو بھی احساس تھا کہ وہ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ سورج کی تپش اس کی کمر پر زیادہ ہو گئی ہے۔ لیکن اس تپش میں ایک موہ بھی تھا۔ کچھ دیر میں آفتاب اٹھے اور چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔ سلمیٰ گلاب کا ایک پھول توڑ چکی تھی۔ اس نے پھول کو ٹہنی سے پکڑ کر دینے کے بجائے اسے اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پھر وہ ہتھیلی آفتاب صاحب کے ہاتھ پر رکھ دی۔ آفتاب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ سلمیٰ کی ان سے نظریں چار ہوئیں اور اس کی ہتھیلی ان کے ہاتھ سے ٹکرا گئی۔ سلمیٰ کے بدن میں ایک برقی لہری دوڑ گئی اور گلاب اس کے ہاتھ سے نکل کر کیاری میں جا گرا۔ سلمیٰ گھبرا کر نیچے بیٹھ گئی اور پھول کو اٹھا کر اس پر سے مٹی جھاڑنے لگی۔ سلمیٰ نے اپنی قمیض کا چوڑا گریبان سامنے سے کافی اوپر کر رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ کمر کی سائیڈ سے نیچے ہو گیا تھا۔ اس گلے سے اس کے دونوں بازوؤں کے جوڑ نظر آ رہے تھے جنھیں پنجابی میں بکیں کہتے ہیں۔ پھول سے مٹی جھاڑتے ہوئے یہ بکیں ہل رہی تھیں اور سراسر شاعری محسوس ہو رہی تھیں۔ آفتاب صاحب نے سلمیٰ کے لیے اپنے سینے میں ایک لہری امڈتی ہوئی محسوس کی۔ ان کا جی چاہا کہ اپنے دونوں ہاتھ سلمیٰ کی بانہوں پر رکھ کر اسے اٹھا لیں۔ ان کی ہچکچاہٹ میں وہ وقت گزر گیا جب وہ اسے اٹھانے میں مدد دے سکتے تھے۔ سلمیٰ خود ہی اٹھی اور اس نے اپنی گردن کے عین پیچھے ان کی گرم گرم سانسوں کا لمس محسوس کیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ان کے سینے کے ساتھ ٹک جائے۔ لیکن وہ مڑی اور اپنی ساری ہمت جمع کر کے ان کے روبرو کھڑی ہو گئی۔

"یہ گلاب کا پھول میری طرف سے آپ کے لیے ہے۔ میری... ہماری دوستی کی نشانی۔" سلمیٰ کے لہجے میں کچھ کھردراہٹ سی پیدا ہو گئی تھی، جسے صاف کرنے کے لیے اس نے دو تین مرتبہ گلا بھی کھنکارا مگر یہ کھردراہٹ موجود رہی۔ لگتا تھا کہ اسے زکام ہونے لگا ہے یا اس کا گلا رندھا ہوا ہے۔

آفتاب اقبال کا جی چاہا کہ وہ اس پھول کو سلمیٰ کے بالوں میں لگا دیں۔ لیکن وہ ہچکچاتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔

"اوہ تھینک یو... تھینک یو... دیٹس ویری نائس آف یو۔"

اس کے بعد انھوں نے چلنے کے لیے سلمیٰ کو ہاتھ سے ایسے اشارہ کیا جیسے وہ اس کے سامنے راستہ کشادہ کر رہے ہوں۔ دونوں خاموش تھے اور اردگرد کیاریوں اور پھولوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس

دوران ایک دو مرتبہ ان کے ہاتھ اور کاندھے ایک دوسرے سے ٹکرائے، لیکن انھوں نے ایسے پوز کیا جیسے انھیں اس کی خبر نہ ہوئی ہو اور جیسے وہ کوئی معمول کی بات ہو۔ آفتاب صاحب اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ لوگ کنکھیوں سے انھیں دیکھ رہے ہیں۔ شاید یہ ان کا وہم تھا، لیکن وہ خود کو بہت امپریسڈ فیل کر رہے تھے۔ سلمیٰ ان کی قربت کو اپنی تمام تر حسیات میں اتار لینا چاہتی تھی۔ ایک بنچ نظر آیا تو وہ بولی:

"آیے سر، اس پر بیٹھتے ہیں۔" سلمیٰ نے بنچ کی ٹھنڈک اپنی پیٹھ پر محسوس کی تو یک بارگی لرز سی گئی۔

"آپ کو ہاتھ دیکھنا آتا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ آفتاب صاحب کی جانب بڑھا دیا۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پارک میں کچھ لوگ جاگنگ کر رہے تھے جبکہ دو تین جوڑے دور بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انھوں نے سلمیٰ کا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا، ایسے احتیاط سے جیسے وہ کوئی طبی اوزار اٹھا رہے ہوں۔

"نہیں، کچھ خاص نہیں۔"

"مجھے آتا ہے۔ دیکھیے۔ یہ لکیر دیکھی ہے آپ نے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری لو میرج ہو گی۔"

"اچھا؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"اور آپ؟ آپ دکھایئے اپنا ہاتھ،" یہ کہتے ہوئے اس نے ان کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیا۔ ان کی ہتھیلی کی پشت کے نیچے اس کی ہتھیلی بہت گرم محسوس ہو رہی تھی۔

"آپ کی بھی لو میرج ہو گی۔"

"لیکن میری یہ لکیر تو تمھاری لکیر سے ڈفرنٹ ہے؟"

"نہیں، مردوں میں ڈفرنٹ ہی ہوتی ہے۔"

"اور؟ اور کیا کیا ہو گا میرے ساتھ؟"

"آپ کی فنگرز بہت پیاری ہیں۔ بلکہ سارا ہاتھ ہی۔ کافی گرلش ہے آپ کا ہاتھ۔"

"مطلب؟"

"مطلب نرم ہے کافی۔ عورتوں کی طرح۔"

"لیکن میرے ہاتھ کی لکیریں تو عورتوں سے ڈفرنٹ ہیں نا؟"

سلمٰی مسکرا دی۔ ”ہاں وہ تو ہے... آپ کی ہارٹ لائن بھی اچھی ہے۔ آپ دل کے بہت اچھے ہیں۔“ وہ ان کے ہاتھ کے درمیان کی لکیر پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

”یہ دیکھیں میرا ہاتھ۔ ذرا ہارٹ لائن کو دیکھیں...“

اس کے کہنے پر آفتاب اقبال نے اس کے دائیں ہاتھ پر واقع ایک لکیر پر انگلی پھیری۔ پھر اچانک سر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک جوڑا انھی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے ہڑبڑا کر سلمٰی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بر ممکن سکون سے بولے:

”ہمیں چلنا چاہیے۔“

”ابھی تو پون گھنٹہ ہی ہوا ہے۔“

”نہیں۔ پھر ملیں گے انشاءاللہ۔“

”اچھا۔“

اس کے بعد دونوں ٹہلتے ہوئے پارک سے نکلے۔ سلمٰی ایک الگ رکشے پر بیٹھی اور گھر سے تھوڑی دور اس سے اتر کر ایک اور رکشے پر گھر پہنچی۔ آفتاب اقبال وہاں سے نکلے تو انھیں کچھ سمجھ نہ آیا کہ اب کہاں جائیں۔ اپنی کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ مری روڈ کی جانب جا نکلے۔ لیاقت باغ کے ساتھ گاڑی پارک کی اور ساتھ ہی واقع لائبریری میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے ایک دو کتابیں نکال کر پڑھنے کی کوشش کی، لیکن ان سے پڑھا نہیں گیا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر پہنچ گئے۔ بستر پر لیٹنے کے بعد وہ کافی دیر تک سلمٰی سے اپنی ملاقات کے مختلف لمحوں کو سوچتے رہے... سوچتے رہے۔

18

آفتاب اقبال کو سلمٰی کی آنکھیں پہلے بھی پرکشش محسوس ہوتی تھیں، لیکن اس ملاقات کے بعد جب ان آنکھوں کے لیے اس کے چہرے کا پس منظر بھی سامنے آ گیا تو انھیں وہ آنکھیں اور بھی پر معنی لگیں۔

ان آنکھوں کے زیریں کنارے تقریباً ایک سیدھی قطار میں تھے، جبکہ بالائی کنارے زیریں کنارے کے بالمقابل ایک نفیس سی قوس لگاتے تھے۔ یہ بات انھیں کچھ غیر معمولی لگی تھی کیونکہ انھوں نے غور کیا تھا کہ ان کے اردگرد موجود زیادہ تر لوگوں کی آنکھوں کے زیریں کنارے سیدھی لکیر کے

بجائے ایک معکوس قوس کی شکل میں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے چہروں پر اداسی کا تاثر ہوتا تھا جو قوس کی گہرائی کے حساب سے کم یا زیادہ نظر آتی تھی۔ لیکن سلمٰی کی آنکھوں کے زیریں کنارے میں کسی قوس کی غیر موجودگی اور بالائی کنارے میں قوس کی نفاست نے انھیں ایک غیر معمولی وقعت دے دی تھی۔ جن لوگوں کی آنکھوں کے زیریں کنارے معکوس قوس کی شکل کے ہوتے ہیں ان میں کچھ لوگ کسی سے کچھ سوال کرتے وقت یا تجسس کے وقت ان کناروں کی قوس کو سیدھا کر لیتے ہیں، اس لیے آفتاب کو سلمٰی کی آنکھیں ہر وقت کچھ پوچھتی اور متجسس لگتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے مخاطب کی باتیں بہت غور اور دلچسپی سے سن رہی ہے۔ اس کی آنکھوں کے اندر قرنیے بھی انتہائی سیاہ اور چمکدار تھے۔ بات کرتے وقت وہ اپنے چہرے کو سیدھا نہ رکھتی بلکہ کبھی بائیں جانب ترچھا کرتی، کبھی دائیں جانب، جیسے کوئی ایسی لڑکی ہو جو کبھی دائیں اور کبھی بائیں ٹانگ پر اپنا وزن ڈال کر کھڑی ہونے کی عادی ہو۔ جب وہ اس کی باتیں سن رہی ہوتی تو وہ اس کی متجسس نگاہوں کو اپنی آنکھوں، ہونٹوں، رخساروں، سر کے بالوں اور شرٹ پر بے چینی سے کچھ کھوجتے ہوئے محسوس کرتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ آنکھیں آپ سے کوئی بہت راز والی بات اگلوانا چاہتی ہیں۔ یہ وہی آنکھیں تھیں جن کی اپنی آنکھوں سے جڑت ان پہلی چیزوں میں سے ایک تھی جو آفتاب اقبال کو اس کے تعلق سے پسند آئی تھیں۔ آفتاب اقبال کو ان آنکھوں کے لیے ایک فقرہ انگریزی میں ہی سوجھ سکا: her very intimate eyes

دونوں آنکھوں کے درمیان اس کی ستواں ناک تھی، اس کے نیچے بالائی ہونٹ پتلا اور زیریں بھی باریک لیکن ایک قوس کی شکل میں تھا۔ یہ ہونٹ ایک پاؤٹ کی شکل میں بالائی ہونٹ سے جدا رہتا اور دونوں ہونٹوں کے درمیان سے اس کے موتیوں جیسے دانتوں کی متناسب قطار دکھائی دیتی رہتی۔ مسکراہٹ کی مختلف حدود میں یہ دانت کبھی کم اور کبھی زیادہ دکھائی دیتے اور آپ انھیں اور زیادہ دیکھنے کے شوق میں کوشش کر کے کوئی دلچسپ بات چھیڑ دیتے۔

19

سلمٰی کے والد صاحب کی فون کال میرے لیے کوئی خوشگوار یاد نہیں، پھر بھی میں وہ کال کبھی بھلا نہیں سکا۔ اتوار کو چھٹی کا دن تھا اور انھوں نے دوپہر کے وقت میرے گھر کے نمبر پر کال کی تھی۔ انھوں

نے اپنا تعارف کرایا تو مجھے حیرت تو ہوئی لیکن مجھے یاد ہے کہ ان کے بر فیلے لہجے کے سبب میری چھٹی حس مجھے زوردار طریقے سے خبردار بھی کرنے لگی تھی۔ پہلی چیز جو میں نے سوچی تھی وہ یہی تھی کہ میں نے سلمٰی کو اپنی فیملی کے بارے میں سب کچھ بتانے کے فیصلے پر عملدرآمد میں بہت تاخیر کر دی ہے اور اب میں پہلی فرصت میں یہی کام کروں گا۔ مگر مجھے یہ روایتی سا فقرہ لکھتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی ہے کہ تقدیر میرے ساتھ کھیل کھیل چکی تھی۔ تکلیف اس لیے کیونکہ میں اس خیال کا حامی ہوں کہ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے اور خود میں نے اپنی زندگی سے لڑ کر اپنے لیے خود راستے پیدا کیے تھے۔ میری جدوجہد کے راستے میں ایک چیز بار بار آ کر حائل ہو جاتی تھی اور وہ تھی میری فیملی کا ماضی۔ سلمٰی کے والد نے کہا تھا کہ سلمٰی کو میرے بارے میں سب کچھ پتا چل گیا ہے اور اب میرے لیے مناسب ترین یہ تھا کہ میں فوری طور پر استعفیٰ دے دوں ورنہ میرے خلاف ہیرس منٹ کی انکوائری شروع کرانے میں انھیں دو منٹ لگیں گے۔

میں اس موضوع پر سلمٰی سے بات کرنا چاہتا تھا مگر موبائل کی سم تبدیل کرنے سے پہلے اس کا ایک ایس ایم ایس مجھے آیا کہ "آئی نیور تھاٹ یو ور اے لائیر"۔

میں سلمٰی کو بتانا چاہتا تھا کہ جھوٹ بولنے کی نوبت تو تب آتی جب مجھ سے کوئی سوال پوچھا جاتا اور میں اس کا غلط جواب دیتا۔ بظاہر ایک حقیقت کو چھپائے رکھنا سلمٰی کے نزدیک جھوٹ بولنے کے مترادف تھا۔ شاید وہ ریالٹی ایسی تھی کہ کسی بھی شخص سے ذرا سا بھی قریبی تعلق بن جانے پر اس کا اظہار نہ کیا جائے تو یہ عمل تقیہ نہیں بلکہ جھوٹ کے زمرے میں آتا ہے۔ مگر میں یہ کیسے طے کرتا کہ سلمٰی سے میرا تعلق اب اس مرحلے پر آ چکا ہے کہ اسے وہ بات بتانا لازمی ہے؟ میرا تو یہ خیال تھا کہ ابھی ہم دوستی کے مرحلے پر ہیں اور ایک ساتھ زندگی بتانے کا خیال اگر سلمٰی کو نہ آیا تو میں اس کا کبھی ذکر بھی نہیں کروں گا۔ اگر ایسا کوئی خیال سلمٰی کے ذہن میں موجود تھا تو اس کی قصوروار وہ تھی، میں نہیں تھا۔

بہرحال میں اس تازہ صورت حال پر بہت دکھی تھا مگر حسبِ عادت میں نے یہ طے کیا کہ اپنی صورت حال کی فکری بنیاد ڈھونڈی جائے۔

20

میرے کے لیے یہ بات عجیب تھی کہ یہودی فلسفی بروچ سپائی نوزا کے خیالات سے متفق نہ

ہونے کے باوجود میں آج چوتھی مرتبہ ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار تھا جو سپائی نوزا کی زندگی میں بھی پیش آ چکی تھی۔ بروچ سپائی نوزا بطور انسان مجھے بہت پسند تھا لیکن مسئلۂ جبر و قدر کے بارے میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ تمام تر اختیار خدا ہی کو حاصل ہے جس نے انسان کی تقدیر طے کر دی ہوئی ہے۔ میرا موقف یہ تھا کہ اگر یہ نظریہ درست بھی ہے تب بھی قابلِ عمل نہیں اور یہ نظریہ انسان سے اس کی زندگی کے غیر متوقع حالات میں عمل کی طاقت سلب کر لیتا ہے۔

میرے لیے یہ بات عجیب تھی کہ سپائی نوزا کے نظریات سے متفق نہ ہونے کے باوجود وہ میری زندگی میں بار بار ایک مثال بن کر کیوں آتا ہے۔ سپائی نوزا ایک مظلوم اقلیت سے تعلق رکھتا تھا لیکن سچائی کی تلاش میں اس نے یہ بات بھی قبول کر لی تھی کہ یہودی ربی اسے اپنے دین سے خارج قرار دے دیں۔ میں بھی اپنے فرقے کو مظلوم سمجھتا ہوں، لیکن اس کے ساتھ ہی میں اپنے فرقے کی تمام تر عبادات اور مجالس سے دور رہتا ہوں۔ سپائی نوزا کے والدین کو اپنے بیٹے پر کوئی فخر نہیں تھا، اور والد کے مرنے کے بعد ان کی جائیداد سپائی نوزا کی بہن نے ہتھیانا چاہی تھی۔ سپائی نوزا نے مقدمہ لڑا، جیتا اور پھر وہ جائیداد اسی بہن کے حوالے کر دی جس کے خلاف وہ مقدمہ لڑ رہا تھا۔ تنہائی کے بہت سے برسوں میں پُرمشقت معاشی جدوجہد نے میری ماں کو اور خود مجھے ایسا غیور بنا دیا تھا کہ ہم ابو کی جائیداد میں سے کسی حصے کے خواہاں نہیں تھے۔ ابو کی وفات کے بعد ان کی جائیداد پر ان کے بھائی کمال محمد خاں نے قبضہ کرنا چاہا تو میں ڈٹ گیا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب امی کے اور ابو کی نئی وائف سلطانہ بیگم کے تعلقات بھی بحال ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی ایل ایل بی کی ڈگری کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنے چچا کی جانب سے اپنے فرقے کا مسئلہ عدالت میں اٹھائے جانے کے باوجود مقدمہ جیت گیا۔ مقدمہ جیتنے کے بعد میں نے شرعی قوانین کے مطابق اپنے والد کی جائیداد سلطانہ بیگم، جاوید اقبال، اپنی والدہ، تین بہنوں اور خود میں تقسیم کی۔ اس کے بعد اپنا حصہ بھی باقی سب میں برابر تقسیم کر دیا۔ امی نے بھی اپنے شوہر کی جائیداد اپنی تین بیٹیوں میں تقسیم کر دی۔

سپائی نوزا نے اپنے ایک استاد کی بیٹی سے محبت کی تھی اور محبت کرتے وقت یہ بھول گیا تھا کہ وہ لڑکی مسیحی ہے اور وہ خود یہودی۔ حالانکہ یہودی تو صرف اس کا باپ تھا۔ میں بھی سلمٰی سے تعلق کے دوران چاہتا تھا کہ یہ بات بھولا رہوں کہ میں ایک احمدی ماں کا بیٹا تھا۔ آج زندگی کے ایک اور اہم

مرحلے پر مجھے سپائی نوزا کی یاد آ رہی ہے۔ جب سپائی نوزا پر روزگار کے تمام دروازے بند کر دیے گئے تھے تو اس نے عدسے چمکانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ آج میں اپنے یونیورسٹی کریئر کو خیرباد کہہ چکا ہوں اور مجھے کسی نئے پیشے کا انتخاب کرنا تھا جو میری اولین محبت، یعنی تعلیم، سے الگ ہو۔ میرے پاس ایل ایل بی کی ڈگری ہے۔ شاید اب مجھے وکالت شروع کر دینی چاہیے۔

میں جبر و اختیار کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات سے خود کو متفق پاتا ہوں لیکن میرے لیے یہ بات عجیب ہے کہ جب میں سپائی نوزا کے خیالات سے متفق نہیں تو وہ بار بار میری زندگی میں ایک مثال بن کر کیوں آتا ہے۔

21

میلان کنڈیرا کے ایک ناول لافانیت (*Immortality*) کا تذکرہ اس کے دیگر ناولوں کی نسبت کم کیا جاتا ہے۔ یہ ناول اس نے عجیب بے فکری کے عالم میں لکھا ہے، بلکہ لگتا یہ ہے کہ اسے اس بات کی بھی فکر نہیں رہی کہ وہ ایک اچھا ناول لکھ پا رہا ہے یا نہیں۔ ناول کی مرکزی کردار ایگنس کو ایک اسپا (spa) سے بس یوں ہی منتخب کر لینے کے بعد وہ اس کی ایک چہل قدمی اور پھر اس کے ماں باپ کی کہانی سناتا ہے اور پھر دوسرے باب میں گوئٹے کی ایک کم عمر مداح بتینا کا قصہ لے بیٹھتا ہے جو گوئٹے کی اس لافانیت کا حصہ بن جانا چاہتی ہے جو گوئٹے کی زندگی میں ہی ایک طے شدہ امر بن چکی ہے۔ بتینا گوئٹے کی ماں سے بھی ملتی رہی ہے اور اس سے گوئٹے کے بچپن کے قصے سن چکی ہے۔ گوئٹے، جو بقول کنڈیرا 'اپنی لافانیت کا ایڈمنسٹریٹر' ہے، بتینا سے خائف ہے کیونکہ وہ اپنی طبیعت کے باوصف اس کی لافانیت میں سے اس سے زیادہ حصے پر اپنا استحقاق جتا سکتی ہے جتنے کی وہ درحقیقت مستحق ہے۔ دوسرے یہ کہ گوئٹے لافانیت کے لیے اپنا جو امیج چھوڑ کر جانا چاہتا ہے، بتینا اس میں گڑبڑ کر سکتی ہے۔

ناول کے تیسرے باب میں ایگنس، جس کے بارے میں اب کہیں جا کر کنڈیرا کو خیال آیا ہے کہ وہ کافی دیر سے اپنے ناول کی مرکزی کردار کو بھلائے بیٹھا ہے، کے شوہر پال کا ذکر آتا ہے۔ پال کا ایک دوست برنارڈ، جو ٹی وی پر ایک شو کرتا ہے، اسے ایک روز بتاتا ہے کہ ایک شخص اس کے گھر پر آیا اور

اسے بتایا کہ اس نے اسے ایک ڈپلوما عطا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ برنارڈ اپنا 'ڈپلوما' کھول کر دیکھتا ہے تو اس پر تحریر ہوتا ہے کہ "تصدیق کی جاتی ہے کہ مسٹر برنارڈ برٹرینڈ ایک سند یافتہ چوتیا ہے۔" ظاہر ہے کہ برنارڈ جو اپنے آبائی پیشے سیاست کو چھوڑ کر صحافت میں آیا تھا، یہ بالکل پسند نہیں کرتا کہ اسے نہ صرف 'ایک مستند چوتیا' قرار دیا جائے بلکہ اس بات کو ایک ڈپلوے کی شکل میں اسے پیش بھی کیا جائے۔

پال خود بھی ایک ریڈیو شو کی میزبانی سے محروم کیا جا چکا ہے اور سوچتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ دوسرے لوگ کیوں ہم سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ہم میں کیا بات انھیں بری لگ جاتی ہے، اور کیوں وہ ہم سے خار کھانے لگتے ہیں؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میڈیا میں 'اوور ایکسپوژر' بھی اس کی ایک وجہ ہے، لیکن کنڈیرا اس سے کچھ اور نتائج اخذ کرنے کی جانب نکل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری ذات محض ایک واہمہ ہے، ایک ایسی شے جو طے شدہ نہیں ہے۔ حقیقی چیز صرف ہمارا امیج ہے جس سے ہم پہچانے جاتے ہیں؛ وہ امیج جو دوسروں کی نظر میں ہوتا ہے۔ امیج سازی کے بارے میں سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ یہ امیج آپ خود نہیں بلکہ دوسرے بناتے ہیں۔ وہ آپ کی من مانی تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی ایسا ستم ظریف بھی ثابت ہو سکتا ہے جو صرف ایک فقرے کی مدد سے آپ کے امیج کو ایک ایسا رخ دے دے کہ حقیقت سے دور تک کا واسطہ نہ ہونے کے باوجود آپ کو دیکھ کر اسی فقرے کا خیال آنے لگے۔ جیسے کسی ستم ظریف نے برنارڈ کو 'ایک سند یافتہ چوتیا' کہہ دیا۔ گوئٹے ایسی ہی کسی ستم ظریفی سے اپنی لافانیت کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

آفتاب اقبال جس صورتِ حال میں پھنسے ہوئے ہیں اس میں انھیں بھی اصل فکر اپنے امیج کی ہے۔ وہ اپنے سیاسی اور مذہبی نظریات کی بنا پر اپنے لیے منحرف، غدار اور کافر جیسے القابات کے لیے تو تیار تھے مگر وہ یہ بات سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک روز انھیں لڑکیوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنے والے شخص کے طور پر بدنام کیا جا سکتا ہے۔ منحرف، غدار اور کافر جیسی تہمتیں لگنے سے انھیں خود پر کسی غازی ہونے کا گمان ہوتا تھا؛ ایک ایسا غازی جو جنگ میں زخم زخم ہے اور اپنے زخم دیکھ کر اپنے نظریے، اپنے کاز پر جس کا ایمان اور پختہ ہو جاتا ہے اور اپنی ثابت قدمی پر اور بھی فخر ہونے لگتا ہے۔ لیکن لڑکیوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنے والے شخص کا امیج انھیں کسی طور گوارا نہیں تھا۔ اس امیج سے بچنے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس متوقع امیج پر وہ اتنے خائف تھے کہ انھوں نے خود کو مار

ڈالنے کے امکان پر بھی غور کیا، لیکن دیگر باتوں کے علاوہ یہ دلیل بھی ان کے سامنے آئی کہ اس موقع پر ان کی غیر متوقع موت انھیں اسی امیج سے متصف کر دے گی جس سے بچنے کے لیے وہ موت تک کے امکان پر غور کر رہے تھے۔ ایسے میں انھیں سلمیٰ کے باپ کا یہ مطالبہ بہت چھوٹا محسوس ہوا کہ وہ اپنی نوکری سے مستعفی ہو جائیں۔ انھوں نے وائس چانسلر کے نام اپنا استعفیٰ تحریر کیا جس میں ملازمت جاری رکھنے سے انکار کی بنیاد ذاتی وجوہات کو قرار دیا۔ اس استعفے کی ایک فوٹو کاپی انھوں نے سلمیٰ کے والد کو بھی ارسال کر دی۔

22

اکتیس دسمبر 2007 کی رات آفتاب اقبال نے اپنی زندگی کے پرانے واقعات کو دنیا کے کچھ نئے واقعات سے جوڑ کر کچھ نتائج اخذ کرنے کی کوشش میں گزاری۔ اس سے چار روز پہلے بے نظیر بھٹو کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں جلسے سے واپسی پر قتل کر دیا گیا تھا۔ حکومت کا کہنا تھا کہ اگر بے نظیر اپنی ٹویوٹا لینڈ کروزر کے سن روف سے اپنا سر باہر نہ نکالتی تو دھماکے کے باوجود اس کی جان بچ سکتی تھی۔ ساتھ ہی انھیں سلمیٰ سے یونیورسٹی کے باہر اپنی ملاقات کے فیصلے اور اس کے نتیجے میں اپنی زندگی میں پیدا ہونے والے مصائب کا بھی خیال آیا اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وہ کیا چیز ہوتی ہے جو ایک اچھے بھلے سمجھ بوجھ رکھنے والے شخص کو ایسے فیصلے کرنے کی جانب لے جاتی ہے جو اس کے لیے بڑے نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ کیا یہ تقدیر ہے؟ انھوں نے سوچا۔ وہ تو اس بات کے قائل رہنے کے لیے کوشاں رہے تھے کہ آدمی اپنی تقدیر خود بناتا ہے؛ کیا ان کی زندگی کے یہ دو بڑے واقعات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ تقدیر انسانی زندگی میں خود سے بھی مداخلت کر سکتی ہے، اور بسا اوقات بہت اوچھی مداخلت؟

جس روز بے نظیر کا قتل ہوا، آفتاب اقبال بھی لیاقت باغ میں موجود تھے۔ کراچی سے ان کے بھائی خالد اقبال کا ایک دوست بھی ان کے گھر ٹھہرا ہوا تھا اور وہ اپنے طور پر جلسے میں گیا تھا۔ صادق نام کا وہ شخص آفتاب اقبال کو خاصا مخبوط الحواس لگا تھا اور وہ کسی بیل سوار جوان کی تلاش میں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بیل سوار جوان اُسے مری روڈ کے کسی مزار پر ملنے والا ہے۔ آفتاب اقبال کے پاس ایسے ضعیف الاعتقاد لوگوں کے لیے وقت تھا نہ صبر۔ جلسے کے روز صادق صبح ہی گھر سے غائب ہو گیا تھا اور پھر رات

تک دکھائی نہیں دیا۔ رات تک پاکستان کی تاریخ کا ایک اور خونیں باب قلم بند کیا جا چکا تھا اور آفتاب اقبال کے غصے میں یہ سوچ کر اور اضافہ ہو رہا تھا کہ صادق ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ وہ نیند کی گولی لے کر سو جانا چاہتے تھے اور صادق کا کوئی نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بارہ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی اور صادق ان کے دروازے پر نمودار ہوا۔ آفتاب اقبال نے اپنی طبع کے برخلاف اس پر ناراضی کا اظہار کیا تو اس نے کہا کہ دھماکا بیل سوار جوان نے ہی کیا ہے۔ اس پر آفتاب اقبال کا غصہ دو چند ہو گیا لیکن وہ صبر کا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ صبح انھوں نے صادق کا چہرہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ رات بھر روتا رہا تھا۔ وہ اسی روز واپس کراچی روانہ ہو گیا تھا۔

لیاقت باغ میں جلسے کے دوران آفتاب اقبال نے حاضرین کی تعداد جاننے کے لیے کئی بار کھڑے ہو کر جلسہ گاہ پر نظر دوڑائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ جلسہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔ وہ لیاقت باغ جسے نوّے کی دہائی میں بے نظیر دور دور تک بھر دیتی تھی، کئی جگہوں سے خالی پڑا تھا۔ جلسے کے شرکا میں بھی ویسا جوش و خروش نہیں تھا اور ملک بھر میں جلسوں سے خطاب کر کر کے اپنا گلا خراب کر بیٹھنے والی بے نظیر حاضرین کا جوش بڑھانے کے لیے اپنی طاقت سے زیادہ کوشش کر رہی تھی۔ بے نظیر کی تقریر کے دوران ہی بہت سے لوگ اٹھ کر جانا شروع ہو گئے تھے۔ انھیں دیکھ کر آفتاب کو بے نظیر کا خیال آ گیا تھا۔ وہ کیا سوچتی ہوگی کہ جس شہر سے اس کے باپ کی لاش لاڑکانہ بھیجی گئی وہاں کے لوگ آج بھی اس سے ہمدردی کرنے کے لیے تیار نہیں؟ بے نظیر کو راولپنڈی سے کتنی نشستیں ملیں گی؟ چھ میں سے شاید دو، مگر پنڈی شہر اور کینٹ کے علاقے سے تو شاید ایک بھی نہیں، ایسا آفتاب اقبال نے سوچا۔

جلسے سے نکل کر وہ ابھی لیاقت باغ لائبریری کے پاس پہنچے تھے کہ ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی تھی۔ دھماکا لیاقت روڈ کی طرف ہوا تھا۔ آفتاب بھاگتا ہوا دھماکے کی جگہ پر گیا تھا اور زخمیوں کو ایمبولینسوں میں سوار کرانے میں مدد کرتا رہا تھا۔ وہاں بے نظیر کی لینڈ کروزر موجود نہیں تھی لیکن کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ دھماکا اس کی لینڈ کروزر کے پاس ہوا ہے۔ شام تک پورے شہر میں پہلے اس کی موت کی افواہ گردش کرنے لگی جس کی کچھ ہی دیر میں تصدیق بھی ہو گئی تھی۔

وہ بھی عجیب دن تھا۔ آفتاب کو بڑے عرصے بعد کراچی سے اپنی سوتیلی امی کا فون آیا تھا۔ سلطانہ آنٹی بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ وہ رو رو کر آفتاب سے اس کا احوال پوچھ رہی تھیں۔ ڈھائی ماہ پہلے

بے نظیر کے قافلے پر کراچی میں جو حملہ ہوا تھا اس کی رپورٹنگ آفتاب کے سوتیلے بھائی جاوید نے کی تھی۔ آنٹی اس پہلے واقعے پر ہی بہت خوفزدہ تھیں، لیکن بے نظیر کے قتل نے تو انھیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کے پہلے فون پر تو آفتاب نے انھیں رسمی طور پر بتایا تھا کہ وہ خیریت سے ہے، لیکن رات کو ان کا پھر سے فون آیا اور وہ اس سے کوئی ایک گھنٹے تک بات کرتی رہیں۔ سلطانہ نے مارشل لا دور میں بھٹو خاندان کے لیے اپنی اور آفتاب کے والد اقبال محمد خاں کی ہمدردی کے قصے سنائے تھے اور بتایا تھا کہ آج انھیں اقبال محمد خاں بہت یاد آ رہے ہیں۔ آفتاب نے انھیں دلاسا دیا اور ان کے غم میں ایسا شریک ہوا کہ خود اس کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔ اپنی ماں پر سوتن لانے کے اٹھائیس سال بعد آفتاب نے پہلی مرتبہ اپنے دل میں یہ محسوس کیا تھا کہ سلطانہ آنٹی بھی اس کی ماں ہو سکتی ہیں۔

اور آج اکتیس دسمبر کی رات وہ اپنے ذاتی دکھ کو اپنے ملک کے دکھ سے ملا کر دیکھ رہا تھا کہ ان دونوں کا سبب کیا ہے اور ان میں تقدیر کہاں تک ملوث ہے۔

اگر وہ اپنے آخری دن اپنا سر لینڈ کروزر کی چھت سے باہر نہ نکالتی تو بچ جاتی کیونکہ گاڑی کے اندر موجود اس کے کسی ساتھی کے جسم پر خراش تک نہیں آئی تھی۔ اُس کے جسم پر زخم کا صرف ایک نشان پایا گیا تھا۔ اس کے سر کی ایک جانب زخم تھا جو امکانی طور پر پستول کا نہیں تھا۔ پستول چلانے والے کی دوسری گولی بھی ضائع گئی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی جو خودکش دھماکا ہوا تھا اس کی شدت سے اس کا سر لینڈ کروزر کے سن روف کے لیور سے اس زور سے ٹکرایا تھا کہ اس کی کھوپڑی دو جگہ سے کھل گئی تھی۔

مگر اس کی زندگی میں اور بھی تو بہت سے had she not تھے۔ مثلاً اگر اس نے مشرف کے لال مسجد پر دھاوے کی حمایت نہ کی ہوتی تو مذہبی جنونی اس کی جان لینے پر یوں اتارو نہ ہوتے۔ اگر اس نے پاکستان نہ آنے کا مشرف کا مشورہ قبول کر لیا ہوتا، اگر اس نے فاروق لغاری کو پاکستان کا صدر نہ بنایا ہوتا، اگر اس نے مشرف کے ساتھ 2002 میں ڈیل کر لی ہوتی یا اس سے بھی پہلے، لیکن ایسے ہی کئی had it not been تھے جنھوں نے اس کی مدد کر کے اقتدار کے ایوانوں تک اس کا راستہ ہموار بھی کیا تھا۔ ان میں طیارے کے حادثے میں ضیاء الحق کی موت اور پھر 1993 میں اسٹیبلشمنٹ کی جانب سے نواز شریف پر اعتماد ختم ہو جانا بھی شامل تھے۔

لیکن اگر دیکھا جائے تو پاکستان کی پوری تاریخ ہی had it been اور had it not been

جیسے اتفاقات سے بھری پڑی ہے۔ اگر بھٹو گیارہ جرنیلوں کو سپرسیڈ کر کے ضیاء الحق کو آرمی چیف نہ بناتا، اگر بھٹو مجیب الرحمٰن کو پاکستان کا وزیر اعظم تسلیم کرنے پر تیار ہو جاتا، اگر ایوب خان نے پاکستان میں سیاسی عمل کا راستہ روک کر 1958 میں مارشل لا نہ لگا دیا ہوتا، اگر 1951 میں راولپنڈی کے اسی لیاقت باغ میں لیاقت علی خاں کو قتل نہ کر دیا جاتا، اگر جناح قیام پاکستان کے ایک سال بعد ہی انتقال نہ کر گئے ہوتے تو پاکستان کی تاریخ شاید بہت مختلف ہوتی۔

لیکن پھر پاکستان کے قیام کی تاریخ میں بھی تو بہت سے had it not been موجود تھے۔ اگر نہرو نے 1946 میں کیبنٹ مشن منصوبے کے بارے میں بے تکا سا بیان نہ دیا ہوتا جو اس کی مخالفت پر محمول کیا گیا تو پاکستان کے قیام کا معاملہ کم از کم اگلے دس برسوں کے لیے ٹل جاتا۔ اگر 1937 کے انتخابات کے بعد بننے والی کانگریسی سرکاروں نے مسلم لیگ کے ساتھ اقتدار میں وافر شراکت کا فیصلہ کیا ہوتا تو شاید مسلم لیگ 1940 میں قرارداد لاہور میں یہ مطالبہ نہ کرتی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے الگ ریاستیں بنا دی جائیں۔

لیکن اس سے بھی پہلے اگر 1757 میں میر جعفر نواب سراج الدولہ کا ساتھ دیتا تو ہندوستان میں اپنی کالونی قائم کرنے کی انگریزوں کی کوشش ابتدا میں ہی ناکام ہو جاتی۔ احمد شاہ ابدالی اگر دہلی پر حملہ کر کے مرہٹوں کو شکست نہ دیتا تو شاید ہندوستان میں ہمارا کوئی ہم وطن ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کر لیتا۔ اس سے بھی پہلے اگر اورنگزیب اپنی فوجی طاقت اور خزانے کو دکن کی فتح پر ضائع نہ کرتا جو اس کے مرنے کے کچھ برس بعد پھر سے آزاد ہو گیا، اور اس سے بھی پہلے اگر تخت نشینی کی جنگ میں مذہب پسند اورنگزیب کے بجائے مذہبی روادار داراشکوہ جیت جاتا، اور اس سے بھی پہلے اگر جہانگیر انگریزوں کو تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت نہ دیتا تو شاید ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ اس بارے میں حتمی طور سے کون کچھ کہہ سکتا ہے!

23

آفتاب اقبال نے تاریخ کے مستقبل کے لیے امکانات کی بے انتہائی کا جو تذکرہ کیا ہے وہ فلسفے کے شعبے میں مسئلۂ جبر و قدر سے جڑ جاتا ہے۔ یعنی ہمارے پاس فیصلوں کے لیے بہت سے آپشن یا

بہت سی راہیں کھلی پڑی ہوتی ہیں اور ہم ان میں سے کوئی ایک یا کچھ آپشن منتخب کر کے اپنا مستقبل منتخب کرتے ہیں اور ایک طریقے سے اپنی تقدیر اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔

خورخے لوئیس بورخیس نے 1941 میں ایک کہانی لکھی تھی: ''ڈ گارڈن آف فورکنگ پاتھس''، جس کا کام چلاؤ سا اردو ترجمہ ہوگا: گھومتے گھماتے راستوں کا باغ۔ یہ تہہ دار کہانی ایک چینی پروفیسر ڈاکٹر یوسُن کے دستخط شدہ بیان پر مشتمل ہے۔ چینی پروفیسر دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی جرمنی کے جاسوس کی حیثیت سے برطانیہ میں رہ رہا ہے۔ چینی پروفیسر کو ایک روز پتا چل جاتا ہے کہ برطانوی خفیہ ایجنسی ایم آئی فائیو کا ایک اہلکار برطانیہ میں اُس کے رابطہ کار تک پہنچ چکا ہے اور اب کسی بھی لمحے خود اُس تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اپنی تقریباً یقینی گرفتاری سے پہلے پہلے اسے ایک آخری کام کرنا ہے اور وہ یہ کہ اسے برطانوی توپ خانے کے ایک ذخیرے کا پتا چلا ہے اور وہ یہ پتا اپنے جرمن دوستوں کو بتانا چاہتا ہے۔

جس جگہ برطانوی توپ خانے کا ذخیرہ موجود ہے، اس کے قریب ہی ایک ماہرِ چینیات ڈاکٹر سٹیفن البرٹ بھی رہتا ہے۔ چینی پروفیسر اسے ملنے جاتے ہوئے راستے میں اپنے آبا و اجداد میں سے ایک شخص کو یاد کرتا ہے جس نے اپنی زندگی دو اہم ترین کاموں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ایک کام ایک ایسا ناول لکھنا تھا جو بہت ضخیم و عریض ہو اور جس میں کئی چھوٹی کہانیاں آپس میں انتہائی مشکل سے نظر آنے والے راستوں کے ذریعے ملی ہوئی ہوں، جبکہ دوسرا کام ایک ایسی بھول بھلیاں تیار کرنا تھا جو ناول ہی کی طرح ضخیم ہو اور جس کے راستے اس کے مجوزہ ناول ہی کی طرح پیچیدہ ہوں۔ مگر پھر ہوا یہ کہ یہ دونوں کام مکمل ہونے سے پہلے کسی نے اسے قتل کر دیا۔

چینی پروفیسر جب ڈاکٹر البرٹ کے گھر پہنچتا ہے تو ڈاکٹر البرٹ یہ جان کر بہت خوش ہوتا ہے کہ وہ اسی شخص کی اولاد میں سے ایک شخص سے متعارف ہو رہا ہے جس کے ناول اور بھول بھلیوں کے بارے میں وہ تحقیق کرتا رہا تھا۔ ڈاکٹر البرٹ چینی پروفیسر کو بتاتا ہے کہ وہ اس کے چینی پردادا کے ناول اور بھول بھلیوں دونوں کا معما حل کر چکا ہے۔ اور وہ حل یہ ہے کہ ناول اور بھول بھلیاں درحقیقت ایک ہی چیز ہیں: یعنی ناول بھول بھلیاں بھی ہے اور ناول بھی۔

ڈاکٹر البرٹ چینی پروفیسر کو بتاتا ہے کہ چینی ناول میں راستوں کی کثرت مکان میں نہیں، زمان

میں ہے: یعنی وہ ناول اپنے کئی راستے ایک ہی وقت کے مختلف علاقوں میں پیش نہیں کرتا بلکہ وہ راستے وقت میں کافی آگے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر البرٹ کے مطابق چینی ناول نگار اپنی کہانی کے دوران کسی واقعے کے ایک سے زائد نتیجے پیش کرتا چلا جاتا ہے اور ان نتائج سے نکلنے والے مختلف راستے کہیں آگے جا کر آپس میں مل جانے کا امکان بھی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر البرٹ ایک آخری حیرت انگیز انکشاف یہ کرتا ہے کہ ناول میں خود اس کا اور اس سے ملنے آنے والے چینی پروفیسر کا بھی ذکر ہے اور یہ ذکر بھی ہے کہ چینی پروفیسر اُسے ملنے بیک وقت دو راستوں سے آیا ہے: ایک راستے سے دوست بن کر اور دوسرے راستے سے دشمن بن کر۔

چینی پروفیسر ان حیرت انگیز انکشافات پر ششدر رہ جاتا ہے۔ لیکن وہ ڈاکٹر البرٹ سے ملنے جن دو راستوں پر چلتا ہوا آیا ہے اُن میں سے کسی ایک سے بھی انحراف نہیں کر سکتا، اور نہ ہی وہ اُن میں سے کسی ایک راستے پر چلنے کی تقدیر سے اجتناب کر سکتا ہے۔ درحقیقت ڈاکٹر البرٹ کی سنائی ہوئی کہانی نے اسے خود اُس کی اپنی کہانی کے لیے بھی ایک راستہ سجھا دیا ہے: وہ ڈاکٹر البرٹ کا شکریہ ادا کرتا ہے اور پھر اپنا پستول نکال کر اُسے قتل کر دیتا ہے۔

کہانی کا خلاصہ آپ نے پڑھا: دلچسپ لگا ہوگا، اور شاید پیچیدہ بھی۔ لیکن یہاں میرا سروکار کہانی کے حیرت انگیز پلاٹ سے نہیں بلکہ میں آپ کی توجہ کہانی کے کردار اُس چینی ناول نگار کی جانب دلانا چاہتا ہوں جس نے ایک ایسے ناول کا منصوبہ بنایا جس میں کہانی کو آگے بڑھانے والے امکانات کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ قاری ان میں کھو کر رہ جائے۔ آفتاب اقبال نے اگر بورخیس کی یہ کہانی کبھی پڑھی، اور غور سے پڑھی ہوتی تو اسے اندازہ ہو جاتا کہ مستقبل کی تاریخ کو وہ جو امکانی طور پر کئی راستوں کو جاتا ہوا دیکھ رہا ہے تو اس کا یہ تصور بورخیس کے چینی ناول نگار کے مستقبل کے تصور سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ بس سمجھیے کہ دنیا کے سامنے کئی قسم کے مستقبلوں کا ایک وسیع و عریض، بلکہ نامختتم نقشہ پھیلا ہوا ہے اور دنیا کو کس، یا کن، راستوں پر سفر کرنا ہے، یہ فیصلہ کئی باورچیوں کے ہاتھ میں ہے جو شوربے کی ایسی تیسی بھی کر سکتے ہیں اور اسے دنیا کے کئی حیرت انگیز ذائقوں کا مجموعہ بھی بنا سکتے ہیں۔ لیکن زمین کی کہانی جو رُخ بھی اختیار کرے، آخر میں اس زمین کو تباہ تو ہونا ہی ہے۔ یعنی مستقبل کے راستے تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن وہ بالآخر نکلیں گے اسی ایک انجام کی طرف۔ ہے نا حیرت انگیز بات!

24

تقدیر کو بعض اتفاقات تشکیل دیتے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ آفتاب اقبال سلمٰی سے یونیورسٹی کے باہر ملاقات کے فیصلے میں اس کی ایک تجویز کے poetic element پر بہت سوچ بچار کر رہے ہیں۔ لیکن اتفاقات ہمیشہ ہی ایسے poetic نہیں ہوتے۔ بعض اتفاقات ایسے ہوتے ہیں جو اپنی اصل میں انتہائی بے معنی اور مضحکہ خیز ہوتے ہیں لیکن ان کے سبب کسی کی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ یہاں مجھے ایک فلم یاد آ رہی ہے: *Pulp Fiction*۔ اس کے دو مناظر اتفاقات کے اسی عنصر کو واضح کرتے ہیں جو بیک وقت مضحک، بے معنی اور المناک ہے۔ فلم میں جان ٹریولٹا اور اس کا دوست ایک قتل کے بعد اپنی کار میں جا رہے ہیں۔ کار کی پچھلی نشست پر ایک لڑکا بیٹھا ہے جس نے اس واردات میں دونوں کے لیے مخبری کی تھی۔ ٹریولٹا اور اس کا دوست واردات کے دوران پستول کے فائر سے معجزانہ طور پر بچ جاتے ہیں۔ ٹریولٹا اس معجزے کے بارے میں لڑکے کی رائے جاننے کے لیے پچھلی نشست پر اس کی جانب رخ کرتا ہے۔ پستول اس کے ہاتھ میں ہے۔ اچانک سڑک پر کوئی bump آتا ہے، ٹریولٹا کے ہاتھ سے پستول چل جاتا ہے اور لڑکے کی کھوپڑی چیخ جاتی ہے۔

ایک اور منظر میں بروس ولس اپنے گھر سے اپنے باپ کی دی ہوئی گھڑی اٹھانے آتا ہے جو اس کی پارٹنر گھر خالی کرتے وقت اٹھانا بھول گئی تھی۔ گھر پر بروس ولس کے دشمن قابض ہیں جن کا نمائندہ جان ٹریولٹا اس وقت واش روم میں ہے اور اسے بروس ولس کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں۔ بروس ولس اپنی گھڑی اٹھاتا ہے اور اپارٹمنٹ کو خالی پا کر مطمئن ہوتا ہے اور ایک ڈبل روٹی اٹھا کر اسے گرم کرنے کے لیے ٹوسٹر میں لگا دیتا ہے۔ اسی دوران اسے میز پر ایک بندوق رکھی ہوئی ملتی ہے جس سے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے گھر پر دشمن آ چکے ہیں۔ فوراً بعد ہی واش روم سے فلش کے چلنے کی آواز آتی ہے جس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ دشمن اس وقت واش روم میں ہے۔ بروس ولس بندوق واش روم کی دروازے کی جانب بندوق تان لیتا ہے۔ جان ٹریولٹا باہر نکلتا ہے تو خود پر بروس ولس کی بندوق تنی ہوئی دیکھ کر ہاتھ اوپر اٹھا دیتا ہے۔ یہ ایک تناؤ سے بھرپور لمحہ ہے۔ ایک tense moment۔ ٹوسٹر ڈبل روٹی گرم کر چکا ہے اور وہ ایک کلک کی آواز سے ڈبل روٹی کو اوپر کر دیتا ہے۔ اس کلک کی آواز پر

بندوق کی لبلبی پر رکھی بروس ولس کی انگلی دب جاتی ہے اور جان ٹریولٹا اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔

جان ٹریولٹا نے کار والے لڑکے کو مارنا نہیں چاہا تھا، اس سے اتفاقاً گولی چل گئی تھی۔ بروس ولس شاید اُس وقت ٹریولٹا کو مارنا نہیں چاہ رہا تھا، ٹوسٹر کی آواز پر اس کے اوسان ایک لمحے کے لیے خطا ہوئے اور ٹریولٹا کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئے۔ ٹریولٹا نے جیسے کسی اور کو اتفاقاً مار ڈالا تھا، ویسے ہی اتفاقاً خود بھی مر گیا۔

بیک وقت مضحکہ خیز، بے معنی اور المناک۔

لیکن ہماری زندگیوں کے بڑے بڑے فیصلے کیا ایسے ہی کسی مضحکہ خیز، بے معنی اور المناک پل میں نہیں ہو جاتے؟

ستائیس دسمبر کو بے نظیر بھٹو نے جلسے سے خطاب کر لیا تھا۔ آفتاب اقبال کے مطابق جلسہ ناکام تھا۔ اسے راولپنڈی شہر میں کوئی نشست نہیں ملنے والی تھی۔ اس نے اپنے پھٹے ہوئے گلے کے ساتھ جتنا جوشیلا خطاب کرنا تھا کر لیا تھا۔ اب مزید کوئی بھی محنت، کوئی بھی سیاسی داؤ پیچ اسے راولپنڈی شہر کی قومی یا صوبائی اسمبلی کی ایک بھی نشست نہیں دلا سکتا تھا۔ پھر بھی جب اس نے اپنی لینڈ کروزر کے باہر لوگوں کو جوش سے نعرے لگاتے ہوئے دیکھا تو ان کی طرف ہاتھ ہلانے کے لیے اپنی گاڑی کے سن روف سے سر باہر نکال بیٹھی۔

بیک وقت مضحکہ خیز، بے معنی اور المناک۔

25

اکتیس دسمبر 2007 کی رات آفتاب اقبال اپنے بستر پر وسکی کی چسکیاں لگاتے ہوئے بے نظیر بھٹو کے اپنی گاڑی کے سن روف سے سر باہر نکالنے کی بارے میں یہی کچھ سوچ رہے تھے اور اپنے آپ سے کہہ رہے تھے کہ وائے شی ہیڈ ٹو ڈو دِس۔ یہ وسکی ان کے والد کی شراب کی بوتلوں میں سے ایک تھی جنھیں وہ ان کی کتابوں کے ساتھ سنبھال کر اپنے گھر لے آئے تھے۔ جس روز وہ بہت اداس ہوتے، وہ ان رنگ برنگی بوتلوں میں سے کسی ایک کا ڈھکن کھولتے، تھوڑی سی شراب گلاس میں انڈیلتے اور ٹھنڈے پانی کے ساتھ مکس کر کے جرعہ جرعہ پینے لگتے۔ وہ بار بار سوچ رہے تھے کہ کاش کوئی بے نظیر کا سر دبا کر

گاڑی کے اندر کر دیتا۔ یا پھر اسے سختی سے جھڑک کر کہتا کہ سر اندر کرلو۔ انھوں نے سوچا کہ اگر وہ وقت کو پیچھے موڑ پاتے تو چلا چلا کر بے نظیر کو بتاتے کہ پنڈی شہر سے اسے کوئی سیٹ نہیں ملنے والی۔ وہ خواہ مخواہ اپنی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالے اور اپنا سر اندر کر لے۔ پھر پتا نہیں کب ان کی سوچوں کا رخ اپنی زندگی کی جانب مڑ گیا۔ بے نظیر کی جانب سے اپنا سر گاڑی کے سن روف سے باہر نکالنے کی طرح کیا آفتاب اقبال کا اپنی لگی لگائی نوکری چھوڑ دینے کا فیصلہ بھی مضحکہ خیز، بے معنی اور المناک نہیں تھا؟ کیا انھیں سلمٰی کے باپ کا بلف کال نہیں کر لینا چاہیے تھا؟ وہ بڑے آرام سے سلمٰی کی زندگی سے نکل سکتے تھے، یا کسی اور جگہ اپنا ٹرانسفر کرا سکتے تھے۔ کوئی تنازع پیدا کرنے کی کوشش میں ان سے زیادہ سلمٰی بدنام ہو سکتی تھی اور اس کی امکانی بدنامی کا خیال اس کے باپ کو اس قسم کا کوئی تنازع پیدا کرنے سے باز رکھ سکتا تھا جس کی اس نے آفتاب کو دھمکی دی تھی۔ پھر آفتاب نے ایسا فیصلہ کیوں کیا تھا؟ بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ سلمٰی انھیں کسی بھی قسم کے کٹہرے میں ان کے خلاف گواہی دیتی ہوئی نظر آئے۔ انھوں نے ایک ایسے دن کا منظر کئی بار اپنے ذہن میں دہرایا جس دن سلمٰی کے والد نے سلمٰی کو ان سے متعلق بتایا ہوگا اور سلمٰی کچھ بول نہیں سکی ہوگی۔ انھیں معلوم تھا کہ سلمٰی ان کے خلاف گواہی دے کر اپنے آپ سے دیانت دار نہیں رہ سکے گی اور اس کے نتیجے میں اس کی شخصیت بکھر جائے گی۔ اس لیے وہ اسے ایسے امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

سلمٰی نے ان پر جھوٹ بولنے کا جو الزام لگایا تھا وہ اتنا بودا تھا کہ انھیں یقین تھا کہ سلمٰی کو خود ہی کچھ روز بعد اس کے بودے پن پر یقین آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن ایک حقیقت کو محض چھپانے پر سلمٰی نے انھیں اپنی نظروں سے کیوں گرا دیا تھا؟ کیا صرف ان کی ماں کے مذہب کے انکشاف سے ان کی وہ ساری حقیقت سلمٰی کی نظر میں منقلب ہو گئی تھی جو وہ اس سے پہلے دیکھ رہی تھی؟ کیا سلمٰی بھی ان سے ویسی ہی نفرت کرنے لگی تھی جیسی دوسرے عام افراد کرتے ہیں؟ کیا سلمٰی کو ان سے اپنی سابق محبت یاد کرتے ہوئے اب گھن آتی تھی؟ اگر یہ سب تھا تو سلمٰی نے یہ بہانہ کیوں بنایا کہ میں نے اس سے جھوٹ بولا ہے؟ کیا اسے مجھ سے نفرت کو منطقی رنگ دینے کے لیے اس بودے الزام کی ضرورت تھی کہ میں نے جھوٹ بولا ہے؟ اس نے مجھ سے کوئی وضاحت مانگنے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی تھی؟ کیا اُسے یہ شک تو نہیں تھا کہ میں کوئی منطقی وضاحت کر کے اسے توڑ دوں گا اور وہ میری ماں کے مذہب سے اپنی

شدید نفرت کی راہ میں کسی بھی قسم کی منطق، کسی بھی قسم کی وضاحت کو بھی حائل نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ شاید وہ اس انکشاف پر اپنے والد کے سامنے شرمندہ ہی اتنی تھی کہ اس نے انھیں خاموشی سے اپنے متعلق ہر فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔

آفتاب اقبال اس مسئلے پر بہت سوچ چکے تھے۔ اس روز بھی وہ یہی سوچ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بال پین تھا۔ انھوں نے خود کو انگریزی کا ایک فقرہ بار بار دہراتے ہوئے پایا۔ اچانک انھیں یاد آیا کہ ایسا ہی فقرہ انھوں نے اپنے والد کی ڈائری میں بھی پڑھا تھا۔ یہ انکشاف اتنا حیرت انگیز تھا کہ انھوں نے فوراً قلم اٹھایا اور میز پر رکھی ڈائری پر، جس پر وہ اپنے والد کے برعکس کبھی کبھار ہی کچھ لکھتے تھے، انگریزی کا وہ فقرہ لکھ ڈالا اور اس کے بعد اسے حیرت سے تکنے لگے۔ انھیں اپنی رائٹنگ بھی اپنے والد سے مشابہ لگی۔ انھوں نے لکھا تھا:

Why you had to do this Umm e Salma?

باب سوّم

سوم یہ کہ فن بنیادی حقیقت کے غیاب کی نشان دہی کرتا ہے…
ژاں بودریاغ

ارشمیدس

ایک ضروری / غیر ضروری باب

1

میرے چاروں مرکزی کردار اپنے بارے میں جو کچھ بتانا چاہتے ہیں، اس سے ان کی کہانی پوری طرح سمجھی نہیں جاسکتی۔ اسی لیے میں نے ان کی کہانی میں بطور راوی بہت جگہوں پر خالی جگہیں پُر کی ہیں۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اپنے چار کرداروں کے بارے میں جو کچھ بتانا ہے وہ کوئی راوی بھی بیان نہیں کرسکتا۔ میری نظر کافی دیر سے جاوید اقبال کے کچھوے پر ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو باتیں یہ کردار اپنے بارے میں نہیں بتا سکتے وہ یہ کچھوا بتا سکتا ہے۔ کچھ باتیں راوی بھی نہیں بتا سکتا کیونکہ راوی کے خیال میں وہ باتیں کہانی اور خاص طور پر اردو کہانی سے باہر کا علاقہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں اس کچھوے کی کہانی کچھ اس طرح شروع کرسکتا ہوں۔

2

کچھوے کا تعارف

تاریخ جہاں کشا کے مشہور مصنف عطا ملک جوینی کے حلقہ احباب میں ایک عالم عماد الدین زکریا بن محمد قزوینی نام کا تھا۔ اس نے اپنی کتاب عجائب المخلوقات والغرائب الموجودات میں چینی سمندر میں واقع جزیروں پر پائے جانے والے کچھوؤں کا ذکر کیا ہے جن کی پیٹھ

بیس گز چوڑی ہوتی ہے۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ وہ کچھوے جیسے ایک جانور کی بابت لکھتا ہے:
''از اں جملہ ایک گروہ ایسا ہے جس کا چہرہ آدمی کی صورت پر اور پیٹھ کچھوے کی طرح اور سر پر لمبے لمبے سینگ ہوتے ہیں۔'' صورت اس کی یہ ہے:

میں جس کچھوے کا ذکر کرنے والا ہوں اس کی صورت اسی کچھوے سے ملتی جلتی ہے۔ اگر عماد الدین زکریا بن محمد قزوینی کی کتاب میں اس کا ذکر نہیں تو اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ یہ کچھوا اس کتاب کے لکھے جانے کے چند صدیاں بعد ہی پیدا ہوسکا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ملکِ سندھ کے پایۂ تخت ٹھٹھہ میں ایک نیم خود مختار گورنر مرزا غازی بیگ ترخان ہوا کرتا تھا جس نے سولھویں اور سترھویں صدی کے سنگم پر یہاں حکمرانی کی۔ یہ بادشاہ دیگر لذاتِ دنیاوی کے علاوہ عورات کا بھی بہت شوقین تھا۔ اس کی آنول نال ٹھٹھہ ہی میں گاڑی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ چار صدیوں بعد اس نال میں تخمیر ہوئی اور نال کے سرے سے ایک مہیب جانور سر نکالنے لگا۔ نال کا نچلا حصہ زمین میں ہی دبے رہنے کی بدولت اس کی چھال سخت ہوگئی، لیکن نال کا بالائی حصہ جب تن کر زمین سے باہر سر نکالتا تو کسی آئت کا نمونہ نظر آتا۔ ہم رنگِ زمیں ہونے کے سبب یہ مخلوق ابنائے آدم کو نظر نہ آتی، لیکن یہ کچھوا ہر شریف انسان کو دیکھ کر اپنی گردن تان لیتا اور اپنے ہر ہر مسام سے اس کی ہر قسم کی بو اپنے اندر اتارنے لگتا۔ ایسا لگتا کہ یہ اپنے

مساموں کی ہر ہر آنکھ سے اپنے معمول کو پڑھ رہا ہے۔

لیکن اس کچھوے کے آغاز و ارتقا سے متعلق بس یہی کچھ نہیں بتایا جاتا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ پہلے ایک انسان ہی تھا جو بغیر کسی رو رعایت، موقع کی مناسبت اور مروت کے اپنا جنسی اشتیاق ظاہر کر دینے کے لیے مشہور تھا۔ پہلے تو لوگوں نے اس کی ڈانٹ ڈپٹ کی، پھر اس پر گرجے برسے، پھر اسے اپنی محفل سے نکال دیا اور ازاں بعد اسے نظر انداز کرنے لگے۔ خواتین نے تو اس کا وجود تک تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اگر کبھی بات چھڑ ہی جاتی تو وہ کہتیں کہ اس نام کی کسی شے کو دیکھنا تو ایک طرف، وہ تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ایک طرف تحقیر اور دوسری طرف نظر انداز کیے جانے کے سبب وہ اپنے اندر سمٹنا شروع ہو گیا اور اپنے ذاتی ارتکاز سے اس نے خود میں ایسی صلاحیت پیدا کر لی کہ وہ موجود تو رہے لیکن کسی کو نظر نہ آئے۔ اس کی کامیابی میں اس امر نے بھی برابر کا حصہ لیا کہ لوگ اس کے وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ یوں وہ رفتہ رفتہ انسانوں کے بصری احاطے یا آپٹیکل سرکم فیرنس میں معدوم ہوتا چلا گیا۔

3

ماشاء اللہ، راوی صاحب کے بھی کیا ہی کہنے ہیں۔ ایک کچھوے کی کہانی سنانے کے لیے بھلا عطا ملک جوینی اور میرزا غازی بیگ ترخان کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت تھی! یہ اور بات ہے کہ اپنے متعلق کوئی غیر متعلق کہانی بھی سن کر مجھے لطف آتا ہے، سو اب کے بھی آیا۔ راوی کے اس قدر کہنے میں لطف سوا ہی آیا کہ میں پہلے انسان تھا اور پھر رفتہ رفتہ غائب ہو گیا۔ اس میں اتنا اضافہ کرنے کو البتہ میرا جی چاہتا ہے کہ میری تمام مشکلات کا سبب میرا مرئی وجود تھا اس لیے ایک روز میں نے خود پر ایک طلسم آزمایا۔ اس طلسم سے میں اپنے اندر ڈوبتا چلا گیا، حتیٰ کہ مجھے اس عمل میں کئی سال بیت گئے۔ کئی سالوں کی ارتکازی مشقت کے بعد میں بالآخر کامیابی سے بصری حقیقت کی دنیا سے معدوم ہو گیا۔

جب میں ایک مرئی وجود رکھتا تھا تو چاہتا تھا کہ جب میں کسی سے بات کر رہا ہوتا ہوں تو اس دوران میرا مخاطب مجھے نہ دیکھے۔ میں ان سے باتیں کرتے ہوئے ان کے جسم کے انتہائی دلچسپ حصوں کو دیکھنا اور دیکھتے رہنا چاہتا تھا، کیونکہ ان کے اجسام مجھے ان سے متعلق اس سے کہیں زیادہ بتا دیتے تھے جو وہ مجھے اپنے منہ سے بتا سکتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ جب وہ باتیں کر رہے ہوں تو میں ان

کے اجسام میں کوئی ایسی مخصوص شے دیکھ سکوں جو ان کی شخصیت کا بنیادی دھاگا مجھے فراہم کر دے۔ جسم کا کوئی پُرمعنی حصہ میرے لیے انھیں واضح تر کر دیتا، کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ وہی کچھ ہوتے ہیں جو آپ کا جسم ہوتا ہے۔ میں ان جسموں پر کوئی گنجا سر، غیر معمولی طور پر باہر نکلے ہوئے کان، مڑی ہوئی ناک، پھیلے یا سکڑے ہوئے نتھنے، کھلے، بند، موٹے یا پتلے ہونٹ، شرٹ سے باہر کو اُمڈتی ہوئی گولائی، سیدھی یا ابھری ہوئی پیٹھ تلاش کر لیتا اور اس کے اسرار کھوجتا رہتا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے مخاطب مجھ سے کوئی جواب چاہے بغیر بولتے رہیں اور اس دوران میں ان کے جسموں کا جائزہ لے کر ان کی شخصیت کی کلید دریافت کر سکوں۔ لیکن ان کی آنکھوں سے گریز کر کے یہاں وہاں بھٹکتی ہوئی میری آنکھیں زیادہ دیر ان کی توجہ سے محروم نہ رہتیں اور ان کی غیر معمولی حرکات کا نوٹس لے لیا جاتا۔ زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ میں شرمیلا ہوں یا یہ کہ وہ جو کچھ بول رہے ہوتے ہیں میں اس میں دلچسپی نہیں لے رہا ہوتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ ایک اور بات: میں یہ بھی چاہتا تھا کہ جب وہ بات کر رہے ہوں تو میں انھیں چھو سکوں؛ ان کی ٹائی پکڑ کر اس کا برانڈ ملاحظہ کروں، ان کی قمیضوں اور دوپٹوں کو چھو کر دیکھوں۔ میرا یہ تجسس مجھے آرام نہ لینے دیتا۔ عورتوں کے لباس میں چھوٹے چھوٹے رخنے ہوتے جو ان کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے کے دوران کبھی فراخ ہو جاتے اور کبھی تنگ۔ یہی میرا رزق تھا اور میں بس اسی پر قانع۔ لیکن لوگوں، خصوصاً عورتوں کو جلد ہی میری دیدہ دری کا پتا چل جاتا اور وہ مجھ سے محتاط رہنے لگتیں۔ اپنے سبجیکٹ کے اس سمٹاؤ سے میں بہت تنگ تھا اور چاہتا تھا کہ میرے انھیں دیکھنے کے دوران وہ مجھے نہ دیکھیں۔ اس لیے ایک روز میں نے خود پر ایک طلسم آزمایا۔ اس طلسم سے میں اپنے اندر ڈوبتا چلا گیا، حتیٰ کہ مجھے اس عمل میں کئی سال بیت گئے۔ کئی سالوں کی ارتکازی مشقت کے بعد میں بالآخر کامیابی سے بصری حقیقت کی دنیا سے معدوم ہو گیا۔

4

اگر کسی کچھوے کو دنیا کے عظیم ترین کچھوؤں میں جگہ بنانے کی کوئی خواہش نہیں تو میرا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ لیکن اس کچھوے نے اپنے متعلق جو جادوئی کہانی سنائی ہے وہ بھی کچھ ایسی قابلِ اعتبار نہیں۔ اب اس کچھوے نے مجھے حقائق سے گریز کا طعنہ دے ہی دیا ہے تو میں آپ کو اس کے اسی

جیٹ پاسٹ سے متعلق کچھ بتاتا ہوں۔ یعنی صرف وہی کچھ جس کی گواہی ایسے گواہوں سے لی جاسکتی ہے جو نہ صرف ثقہ ہیں بلکہ کہانی کے اندر کے علاوہ باہر بھی وجود رکھتے ہیں۔

کراچی میں صدر کے علاقے میں رتن تلاؤ کے نام سے ایک آبادی ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل کراچی جن گنی چنی آبادیوں پر مشتمل تھا ان میں رتن تلاؤ بھی شامل تھا۔ اس کا یہ نام اس لیے پڑا کیونکہ یہاں ایک تالاب تھا جس کے کنارے پہلوان ڈنڑ پیلتے تھے۔ چھوٹی سی اس آبادی میں دو مندر تھے جو اپنی پرانی شان وشوکت کھودینے کے باوجود اب بھی یہاں موجود ہیں۔ ایک مندر رام چندر ٹیمپل کہلاتا ہے اور پریڈی تھانے کے قریب ہی واقع ہے۔ دوسرا مندر اندر آبادی میں ہے اور اس کے قرب وجوار میں اب کراچی کی موٹر سائیکلوں کی سب سے بڑی مارکیٹ بنی ہوئی ہے جسے اکبر مارکیٹ کہتے ہیں۔ یہ ایک عجیب مندر ہے۔ یہاں شولنگ کی مورتی ہے اور اس کی پوجا بھی کی جاتی ہے لیکن ساتھ ہی ہری پگڑی والوں کے سبز جھنڈے بھی یہاں نصب ہیں۔ بکروں کو قربان کر کے ان کا خون شولنگ پر بھی انڈیلا جاتا ہے اور دس محرم کو اسی مندر سے امام حسین کا تعزیہ بھی نکالا جاتا ہے۔ اس تعزیے کو مائی کا تعزیہ کہا جاتا ہے۔ مائی اس عمارت کی مالکہ ہے اور اسے کچھ ایسا گر آتا ہے کہ ہندو، مسلمان، شیعہ اور بریلوی سب یہاں حاضر ہوتے ہیں۔ عمارت میں ایک پرانا دھرانا کنواں بھی ہے۔ ایک روز مائی نے دیکھا کہ ایک کچھوا کنویں میں سے نکلا اور اس کمرے کی جانب بڑھنے لگا جس میں شولنگ موجود تھا۔ مائی حیران ہوئی کہ یہ کچھوا کہاں سے آٹپکا۔ پھر وہ مسحور سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ کچھوا خراماں خراماں چلتا ہوا شولنگ کے پاس پہنچا اور اپنے آگے کے دونوں پاؤں اٹھا کر سر کے پاس لے گیا، جیسے شو کو پرنام کر رہا ہو۔

مائی نے سن رکھا تھا کہ وشنو کے دس اوتاروں میں سے ایک اوتار کچھوا بھی تھا۔ جب دیوتاؤں کو امر ہونے کے لیے امرت پینے کی خواہش ہوئی تو معلوم ہوا کہ سمندر کو متھ کر امرت نکالا جاسکتا ہے۔ سمندر منتھن کے لیے واسکھی نامی سانپ رسی بن گیا اور مندرا کی پہاڑی کو کاٹ کر لکڑی بنائی گئی۔ اب ضرورت تھی کسی ایسی شے کی جو سمندر میں مضبوطی سے کھڑی رہ سکے اور جس کے گرد لکڑی اور رسی کو گھمایا جاسکے۔ اس موقع پر وشنو بھگوان نے کچھوے کا روپ دھارن کیا اور یوں سمندر کو متھ کر امرت کاڑھا گیا جسے پی کر دیوی دیوتا لازوال ہوے۔ مائی کو معلوم تھا کہ برہما، وشنو اور شو بھگوانوں میں بھائیوں جیسا تعلق ہے۔ تو کیا اس کچھوے کے روپ میں وشنو بھگوان شو جی کو سلام کرنے آئے تھے؟ مائی یہ سوچ کر لرز سی گئی۔

مائی اگر کہیں اور رہ رہی ہوتی تو وہ اس معجزے کی نشر واشاعت میں اپنا تن من دھن صرف کر دیتی۔ لیکن رتن تلاؤ کی اس آبادی میں اب مندر کی حفاظت کے لیے بس وہی باقی رہ گئی تھی۔ اس کے سارے رشتہ دار ہندوستان چلے گئے تھے اور اس مندر کی حفاظت اس نے کس جوکھم سے کی تھی۔ دس محرم کو مندر سے تعزیہ نکالنے کا رواج تو پاکستان بننے سے پہلے سے تھا، لیکن ہری پگڑی والوں کو اپنے جھنڈے لہرانے کی اجازت اسی نے دی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس مندر میں ایک ایسا کچھوا ہے جسے وہ وشنو کا اوتار کہہ رہی ہے تو کوئی آ کر اس کچھوے کو نقصان پہنچا دے گا۔

مائی نے کچھوے کی سیوا تو بہت کی اور ہر صبح سورج نکلتے ہی اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی پرارتھنا میں بھی اسے بہت سکون ملتا تھا، لیکن وہ اس کے لیے کسی اور ٹھکانے کی تلاش میں تھی۔ انھی دنوں مندر میں جاوید اقبال کا آنا جانا ہوا۔ مائی نے دیکھا کہ وہ کچھوے سے بہت پیار کرتا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ سے پتے توڑ توڑ کر کھلاتا تھا۔ مائی پاس کھڑی دیکھتی کہ اس دوران اس کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ پھیلی رہتی تھی۔ لیکن مائی اسے یہ بتانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی کہ یہ وشنو کا اوتار ہے۔

''آپ نے اس کا کوئی نام نہیں رکھا؟'' ایک دن جاوید نے اس سے پوچھا۔

''کرما!'' مائی کے منھ سے جھٹ نکلا۔ لیکن پھر جلد ہی ہڑبڑا کر بولی، ''نام کا کیا ہے! نام تو وہاں ہوتے ہیں جہاں ایک ہی جات کے کئی ہوں۔ یہ تو چھڑا چھانٹ ہے۔''

''یہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ کیا میں اسے ایک دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں؟''

مائی اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔ پھر کہا کہ وہ اس کے بیٹے کارتک کو بھی بہت پسند ہے۔ وہ اسکول سے آجائے تو ہی کچھ بتا سکتی ہے۔ لیکن یہ صرف ایک بہانہ تھا۔ کارتک کو کچھوے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مائی کی اس کہانی سے بھی متاثر نہیں ہوا تھا کہ وہ کچھوا کوئی اوتار وغیرہ ہے۔ اس کی کلاس میں بچے اس کا مذاق اڑاتے تھے کہ وہ کئی خداؤں کی پوجا کرتا ہے۔ یہ سن کر اسے بہت غصہ آتا لیکن خاموش رہتا۔ کلاس میں وہ اپنے ایک کرسچن دوست کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ دونوں میں ایک دوسرے کے مذہب پر بہت کم بات ہوتی تھی۔

جاوید چلا گیا تو مائی نے سوچا کہ اگر جاوید کرما کی مناسب دیکھ بھال کرنے کا وعدہ کرے تو اسے اس کے پاس رکھا جاسکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ شوراتری کے تہوار پر جب اس کی برادری کے لوگ

مندر آئیں گے تو وہ انھیں وشنو کے اوتار کی زیارت کرائے گی۔ لیکن اس کا ہر وقت مندر میں موجود رہنا اس کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کرما کی دیکھ بھال کے سلسلے میں جاوید سے تفصیلی بات کرے گی۔ جب جاوید نے اسے اپنے گھر، کچھوے سے اپنی محبت اور اس کے لیے ایک بڑا سا ٹینک خریدنے کے منصوبے سے آگاہ کیا تو مائی نے وہ کچھوا جاوید کو دے دیا۔ لیکن ساتھ یہ شرط بھی رکھی کہ شِوراتری کے تہوار سے ایک روز پہلے وہ کچھوے کو مائی کے پاس چھوڑ جایا کرے گا۔ جاوید نے ہامی بھر لی۔

5

Well… well… well.. enough of you, Mr. Aftab Iqbal and Mr. Javed Iqbal. And Mr. Ravi, you can only be a drenched river. You can only rot along our cultural capital. Enough of you for the time being at least. You can get hold of your stories but you can't go very far with that. I will get hold of you again like my balls.

Lo and behold! Let me take out the first ball out of my cloak. See this ball. His name is Bala. When he was born he was named 'Iqbal', after the great poet-philosopher. His father was fond of reading the 'prayer comes to my lips' by Iqbal that he used to sing at his school and hence named his son. But his fellow villagers were not content with the delicate pronunciation of the name, or any name for that matter (to set the facts straight), so they turned it into 'Bala' and its vociferous form 'Balaaayyy' was even more frequent and in vogue. But his father was still not satisfied with his nickname. Bala had turned out to be a fiend, or so his father had come to believe, so his father always liked to remind him of the orifice of his origin. So the second name his father gave him can be roughly translated as 'product of the vulva' or 'vagi-begotten'. But for a near phonetic similarity we would call him 'Bala the vagi-got', as its sound is somewhat akin to the power of the Punjabi abuse that his father loved to hurl at him. And his father had got, mind you, a rare collection of abuses and curses and you will wonder at their ingenuity once you see them used in their proper setting. For now, here is our Bala the vagi-got. And don't underestimate him a bit. I know, as knows

the Ravi, that he has to play a very vital role in our story; he has the potential of turning the world politics upside down.

6

جاوید نے مائی کے ہاں جب اس کچھوے کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو اسے تبھی وہ بہت پر اسرار لگا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا تو اس کی آنکھیں کسی انسان کی طرح جذبات اور محسوسات کا اظہار کرتی ہوئی لگتی تھیں۔ وہ بھی ایسا انسان جس میں بچوں کی معصومیت بھی ہو اور بزرگوں جیسی بصیرت بھی۔ اس کی آنکھوں میں پیار تھا اور ایک التجا کہ مجھے اپنا دوست بنا لو، مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کے خول کی چھال سنہری تھی اور خول سے نکلے ہوئے سر کی کھوپڑی بھی سورج میں چمکتی ہوئی سنہری لگتی تھی، اگرچہ جاوید نے اسے گھٹتی بڑھتی روشنیوں میں کئی رنگ اختیار کرتے دیکھا تھا۔

جاوید نے جس روز اسے گھر لا کر ٹینک میں رکھا تو اس میں کچھوا کچھ اور بھی پیارا لگا۔ اس کا بدن پانی کے اندر تھا اور سر پانی کی سطح سے باہر نکلا ہوا تھا جس پر لگی مہین آنکھوں سے وہ ٹینک کے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ پانی میں اسے ڈولتے دیکھ کر جاوید اقبال کے ذہن میں ایک نام کوندا: 'ارشمیدس'۔ اور جاوید نے اسے ارشمیدس کے نام سے ہی پکارنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ تو اس کا بنیادی نام تھا؛ مختلف اوقات میں وہ اسے اور بھی کئی ناموں سے پکارتا۔ مثلاً ابے او ارشو!، میرا عرشی فرشی اور میرا سنہری کچھوا ارشمیدس وغیرہ وغیرہ۔ اس نے اپنا معمول بنا لیا کہ دن بھر کی اہم باتیں کچھوے سے کر لیا کرتا اور کبھی کبھار اسے سیر پر اپنے ساتھ بھی لے جاتا۔

7

For you I have become a yearning little tortoise. An innocent tortoise who gets out of his limbo and thrusts his head out of his shell - holds it high to admire you; higher still to watch you; higher still to touch you - adore you. I could have become a bushy little dog as well with his tongue held out to get to see and feel more than what his already protruding eyes can. I swim and dive in a sea of possibilities; without needing any oxygen mask, I swim here and there like a water baby.

Possibility is, in my opinion, the sexiest word in the dictionary.

What is 'there' is there to rot, but what is possible has the possibility to both flower and grow stale. With our day-dreaming camera we can move it both ways; nothing can be more interesting - and yes, nothing can be more hideous. As I have before mine eyes the possibility of a whole country rotting, I look askance and focus my day-dreaming camera on a voluptuous possibility. The possibility of the other possibility (of watching my country rot) necessitates and fires my voluptuous dream and makes it an essential 'possible'. I visualize the possibility of watching Kareena Kapoor stripping herself leaf after leaf.

First I take a loose shot to establish her in her surroundings - an open green hillside where she usually sings and gyrates and where her beauty blossoms amidst a cloudy sunshine. Then I zoom my camera to get a closer and closer shot of her face. Ghalib would have said of her, "being brightened by the wine - the garden of a face". In her face a shimmering shame is mingling into a glimmer of a voluptuous possibility. Her naughtily drooping lower lip (not the length of a pout) offers a lilting lullaby - a lullaby that begets a naughty thrill in my tortoise.

I know she has a bushy nape and I can feel a damp fragarence rising from the pores where her hairs are trying to sprout, bringing their scent with them. But I know, I am expected to tell a story here, or to be exact, provide pieces of a story which are missing and thus solve a puzzle for Ravi, or the reader, or for who knows.

8

کسی کچھوے کو دیکھ کر اس کی عمر کا حتمی اندازہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ کچھوے ریپٹائلز میں شمار کیے جاتے ہیں، حالانکہ ایمفی بیئن خاندان کے پانی اور خشکی دونوں سے شغف کی خاصیت ان میں بھی پائی جاتی ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ زمین پر انسانوں کی آمد سے بہت بہت پہلے، آج سے پینتیس کروڑ سال قبل سمندر سے ایمفی بیئن باہر نکلے اور انھوں نے اپنی زندگیوں کا کچھ حصہ خشکی پر بھی بسر کرنے کی روش اپنائی۔ تاہم انھوں نے پانی سے اپنا ناتا کبھی نہ توڑا۔ آج ان ایمفی بیئن میں سے صرف کچھ ہی گروہ اس زمین پر موجود ہیں۔ مینڈک اور سالا مانڈر انھی کی موجودہ شکلیں ہیں۔ ان کی خشکی

پر آمد کے تقریباً پانچ کروڑ سال بعد ریپٹائلز نے بھی خشکی کا رخ کیا۔ عظیم الجثہ ڈائنوسار بھی انھی ریپٹائلز میں شامل تھے۔ آج ان کے پانچ گروہ زمین پر موجود ہیں جن میں مگرمچھ، گرگٹ اور کچھوے بھی شامل ہیں۔ ان میں سے کچھوے اس حوالے سے زیادہ دلچسپ ہیں کہ پچھلے کئی لاکھ برسوں سے ان کی شکل و شباہت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے انھیں زمین کے قدیم رازوں کا سب سے اہم امانت دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی یہی خصوصیات تھیں جن کا پتا جاوید اقبال کو ٹی وی پر ایک ڈاکیومنٹری دیکھ کر لگا تھا۔ بعد میں اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہندومت میں وشنو بھگوان کا ایک اوتار کچھوا بھی تھا۔ وہ اکثر کچھوے کی گردن دیکھ کر سوچا کرتا کہ اسے وشنو کا نہیں، شو جی کا اوتار ہونا چاہیے تھا۔ اپنے اس خیال پر وہ مسکراتا اور اس کی گردن پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتا۔ وہ جب اسے اپنے ہاتھوں سے لیٹوس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کھلاتا تو اسے بڑا مزہ آتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے زمین کا کوئی بہت پرانا اور بڑا بوڑھا اپنا پوپلا منھ چلا رہا ہو۔

9

راوی کے کرداروں کو جتنا میں جانتا ہوں، اتنا کسی راوی کا باپ بھی نہیں جان سکتا۔ ذرا بھابھی زرینہ کے بارے میں جاوید اقبال کا بیان دیکھ لیجیے۔ راوی نے اپنے تئیں جاوید کو اجازت دی تھی کہ اپنے خیالات اور محسوسات کا خود اظہار کر سکے۔ ریالٹی کی وہ شکل پیش کر سکے جو اسے، اپنی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ مگر جاوید نے کیا کیا؟ زرینہ کو بھابھی بنا کر اس پر احترام کی چادر ڈال دی۔ ہر ایک کو اپنی ریالٹی خود پیش کرنے کی اجازت دے دی جائے تو دنیا میں سچ اس سے کہیں زیادہ کمیاب رہ جائے جتنا کہ وہ اب ہے۔ اور اب بھی وہ بہت کمیاب ہے۔ اور راوی جیسے راویوں کو تو سچ لکھنے کا یارا ہی نہیں۔ یہ جو راوی کبھی ایک کردار کے اور کبھی دوسرے کردار کے ہاتھ میں قلم تھما رہا ہے، یہ اصل میں اپنے خوف کو چھپانے کی کوشش ہے۔ اس کی زبان میں وہ کردار پیدا ہی نہیں ہوئے جو ناف سے نیچے بھی وجود رکھتے ہوں۔ یہ میں ہوں جو انسانوں کی ناف کے نیچے کینچلی بنا کر سویا رہتا ہوں۔ اور جب جاوید کسی لڑکی سے یا کسی عورت سے باتیں کر رہا ہوتا ہے تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کب اپنا سر اٹھا کر اس لڑکی یا اس عورت کو سراہنا ہے۔ میں ہوں وہ ہیرو میٹر جو جاوید اقبال کی، یا کسی بھی اور مرد کی، کسی عورت کے لیے پسندیدگی

کی اصل پیائش کر سکتا ہے۔ میں ہی ہوں وہ مقیاس الحبت جس پر کسی محمد خالد اختر کو کہانی لکھنی چاہیے تھی۔ جب یہ مرد عورتوں سے دفتر کی، یا مامے چاچوں کی، یا ابوامیوں کی یا کریئر کی باتیں کر رہے ہوتے ہیں، تو میں اپنا کام کر رہا ہوتا ہوں۔ میں کبھی اس عورت کی مسکراہٹ کو دیکھتا ہوں، کبھی اس کے ہونٹوں کو۔ یہ میں ہوں جو سوچتا ہوں کہ اس عورت کے چہرے پر کس جگہ کا بوسہ لینا مناسب رہے گا۔ یہ میں ہوں جو عورتوں کی ہڈیوں کی مضبوطی دیکھ کر انھیں کڑکڑانے کی تمنا کرتا ہوں۔ ان کی گولائیوں کو دیکھنے کے لیے اپنا سر اٹھاتا ہوں اور اٹھائے ہی چلا جاتا ہوں۔ یہ میں ہوں جو ان کے دوپٹوں میں داخل ہو جاتا ہوں اور چادروں میں گھس جاتا ہوں۔ یہ میں ہوں جو ان کے لباس کے مہین سے مہین رخنے سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہوں تاکہ میرا ادھ موا سراس سے حاصل کردہ توانائی سے فراز ہو سکے۔ یہ میں ہوں جو عورتوں کے پائنچوں کے ذرا سا اٹھنے پر ان کی پنڈلیوں کے بال دیکھتا ہوں اور ان کی ملائمت یا سختی سے ان کے جسموں کی نوعیت کا اندازہ لگاتا ہوں۔ یہ میں ہوں جو عورتوں کے ننگے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتا ہوں اور ان کی آستینیں اَور اوپر تک چڑھا دیتا ہوں۔ یہ میں ہوں جو ان کی گردن کو سرفراز رکھنے والی دو بافتوں کے کناروں پر اپنی انگلیاں پھیرتا ہوں اور ان کی گدی سے اٹھنے والی گرمی کی مہک سے سانسیں بھرتا ہوں۔ یہ میں ہوں کہ جب عورتیں مردوں سے منھ پھیر کر چل دیتی ہیں تو ان کی ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کی سختی کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے محسوس کرتا ہوں اور ان کے گدیلی کولھوں پر سے اپنی ہتھیلی پھیرتا چلا جاتا ہوں۔ میں، صرف میں یہ جانتا ہوں کہ ایک مرد کو کوئی عورت کتنی خوبصورت لگتی ہے اور وہ اس کی قربت کا کتنی شدت سے خواہش مند ہے۔ جب وہ عورت پر اپنی شرافت اور خاندانی نجابت کا سکہ بٹھا رہا ہوتا ہے تو میں کینچلی سے سر نکال نکال کر اس کی عورت پر لپ لپ اپنی زبان پھیر رہا ہوتا ہوں۔ دنیا کی ہر کہانی اس قابل ہے کہ وہ کم از کم ایک دفعہ میرے اور صرف میرے منھ سے بھی سنی جائے۔

راوی کے کرداروں کو جتنا میں جانتا ہوں، اتنا کسی راوی کا باپ بھی نہیں جان سکتا۔

10

میری کوشش، اور اس سے زیادہ خواہش، یہ تھی کہ کچھوے کو اس تحریر میں علامتی طور پر لایا

جائے۔ اس کے لیے میں ایک شریفانہ سیٹنگ کا بندوبست کرنا چاہتا تھا۔ یہ جو میں نے عمادالدین زکریا بن محمد قزوینی کی کتاب عجائب المخلوقات کا ذکر کیا تھا تو اس لیے کیا تھا کہ کچھوے کو ایک اساطیری سی حیثیت حاصل ہو جائے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ کچھوے نے میری اس کوشش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد میں نے اس کا تعلق اسی مندر سے جوڑنے کی کوشش کی جہاں سے جاوید اقبال کی ملاقات ایک کچھوے سے ہوئی تھی، لیکن لگتا ہے کہ وہ اس تعارف پر بھی زیادہ مطمئن نہیں ہے۔ کچھوے نے اپنے پچھلے بیان میں جو کچھ بتانے کی کوشش کی ہے، اس کا خدشہ مجھے پہلے ہی سے تھا۔ اسی لیے میں اس کے لیے کسی شریفانہ سیٹنگ کی تلاش میں تھا۔ آپ میں سے جو قارئین کچھوے کی اس باغیانہ روش کو ہضم کر سکیں وہ بے شک اس کے بیان کو میری بیان کردہ سیٹنگ سے ہٹ کر دیکھتے رہیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک ادبی تحریر کو ایسا ہونا چاہیے کہ اسے آپ کے گھر کی مائیں بہنیں بھی مطالعہ کر سکیں۔ میں اب بھی آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس کچھوے کو اس استعاراتی اور اساطیری سیٹنگ میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک راوی کا واسطہ حقائق کے ساتھ ساتھ کرافٹ سے بھی ہوتا ہے، اس لیے میں آپ سے اس درجے کی صداقت کا وعدہ نہیں کرتا جس درجے کی صداقت کا وعدہ یہ کچھوا کر رہا ہے۔ اگر ادبی تحریروں میں ایسی صداقتوں کا چلن عام ہو گیا تو سارے کردار سب سے پہلے اپنے کپڑے اتار کر ایک طرف رکھ دیا کریں گے اور اس کے بعد ہی اپنا حال احوال بتائیں گے۔ بہرحال، میں نے کچھوے کے طرزِ اظہار کے بارے میں اپنے خدشات آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کس کے بیانیے پر اعتبار کرتے ہیں۔

11

راوی نے باب چہارم کے سولھویں حصے میں حکیم حافظ برکت اللہ شاہین کی ایک تحریر نقل کی ہے مگر اس میں اپنے طور پر شرعی یا غیر شرعی ترمیم کر دی ہے۔ حکیم نے اپنے بیان میں حکیمی زبان استعمال کی ہے۔ میں اس زبان کو تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔ راوی نے اس کے بیان کے جو حصے کاٹ دیے ہیں وہ میں آپ کو سناتا ہوں:

''اسلام کے بطلِ جلیل، جہاد کے جوہری بم یعنی فدائی حملے کے استاذ، قاری حسین محسود فضلہم

اللہ تعالیٰ کا سینہ ایمان کی حرارت سے بردم گرم رہتا تھا۔ لیکن ان کے قلبِ تپاں کی بدولت ان کا سارا جسم ہی اس حرارت سے مملو تھا۔ ان کے شکم کے نیچے بفضلِ الٰہی دو بیضوی غدود تھے جن کی نالیوں میں نافعِ دین خلیوں کی افزائش بدرجۂ اتم ہوتی تھی۔ یہ خلیے منوی قنیات کے ذریعے برنجی نالی میں پہنچتے اور پھر وہاں سے مجریِ بول میں چلے آتے۔ ایسا معجزہ مخصوص بندوں ہی کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنے مجریِ بول سے بھی دین ہی کا بول بالا کریں۔ وہ اپنی دینی حرارت وحمیت یہیں مجتمع رکھتے اور بوقتِ تلذذ اپنے قضیب کے راستے اسے فدائین کی جوفِ دُبر میں پہنچا دیتے۔ سننے میں آیا ہے کہ نصرتِ ایزدی سے ان کا قضیب بوقتِ جلال ان کی انگشتِ شہادت سے کہنی تک آتا تھا، سو جملہ اجواف کی تہوں تک بارودِ حمیت کی رسائی ممکن ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد فدائی کے جسم سے کیسا ہی آکہ لگا لیا جاتا، اس کے بدن سے حمیت کی بو تک نہ سونگھ پاتا۔ معمول جب مُحب ہو جاتا تو دنیا کا کوئی تعلق اس کے من کو نہ بھاتا اور وہ سیدھا جنتِ موعود کو دوڑتا چلا جاتا۔

"فدائی اقبال اللہ عسکری کو بھی قاری صاحب موصوف کے حوالے کیا گیا اور ہم نے معمول کے حلقوم سے بلند ہوتی ہوئی آوازِ تحسین سے اندازہ لگایا کہ قضیب سے اس کی مراد پوری ہوئی اور اس کا کام بطریقِ احسن انجام پایا۔ بے شک وہ اللہ کے خاص بندے ہی ہیں جن کے دلوں اور دیگر اجواف میں اللہ ایسی گنجائشیں پیدا کرتا ہے۔"

راوی نے باب چہارم کے پارہ نمبر سولہ میں ڈرڈر کر جو کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے اس کے ساتھ مندرجہ بالا تحریر جوڑ لیجیے۔ آگے آپ کی مرضی! اسی بات کو بعد کے زمانے کا ایک انگریزی زبان مصنف یوں بیان کرتا ہے:

12

The Strategic Depth

Qari Hussain told him that they have discovered a unique method of bomb blast which no security agency can disclose or decipher. There is a tunnel at the hind side of every man, he elaborated, which can be used as a trajectory for bombs and missiles. He used to call it 'the strategic

depth'. But first, he said, this tunnel has to be lavelled so that it is friction-free and takes the missile ahead smoothly and without any - *any* (he stressed the word) restriction whatsoever. A boy has a relatively smoother tunnel than a man has, he told him, so we choose boys between the age of 14 to 18. But first we test the friction of the tunnel and insert shafts of different length and breadth into it to ascertain its width, breadth and friction. Then we insert the bomb-missile into the tunnel and kiss the boy farewell. God willing - if the boy succeeds, the bomb-missile takes him directly to heavens where houris and beautiful ghilman are just waiting to receive him in their embraces.

You also have to fill up all the nearby tunnels with ammunition and we take care that you do eventually. No need to say that Bala went through the due process and successfully graduated from the school of Qari Hussain.

13

اس کہانی کے چار درویش میرے قابو سے باہر ہو ہو جاتے تھے۔ اگر ان کی کہانی کہنے میں دیگر اسباب کے باعث مشکلات تھیں تو ان کی جانب سے خود مختاری کی جدوجہد سے وہ مشکلات دو چند ہی ہوئیں۔ جاوید اقبال کے کچھوے کو دیکھ کر مجھے لگتا تھا کہ وہ بھی اس کہانی کا ایک خاموش کردار ہے۔ لیکن اب جبکہ اسے اس کہانی میں در آنے کا موقع دیا ہے، وہ نہ صرف اپنی اور جاوید کی، بلکہ باقی کرداروں کی کہانی بھی اپنے طور پر سنانے پر بضد ہے۔ حکیم حافظ برکت اللہ شاہین کی تحریر سے متعلق اس نے جو در فنطنی چھوڑی ہے اس کی ذمہ داری قطعی طور پر خود اسی پر اور قبلہ حکیم صاحب پر، اگر وہ تسلیم کریں تو، عائد ہوتی ہے۔ حاشا کہ میرا اس بیان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔

ماہرین بتاتے ہیں کہ کچھووں کے ہاں دو چیزیں انسانوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں بیماریوں کے خلاف مزاحمت کی صلاحیت ایسی عمدہ ہوتی ہے کہ وہ لمبی عمر پاتے ہیں جو عموماً عام انسانوں کی اوسط عمر سے زیادہ ہی ہوتی ہے، اور پاکستانیوں کی اوسط عمر سے تو یقیناً زیادہ۔ دوسرے یہ کہ ان کی بصارت بہت عمدہ ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے ہاں بصیرت کا کیا سلسلہ ہوتا ہے، لیکن

جس کچھوے کا میں تذکرہ کر رہا ہوں، اس نے تو لگتا ہے جیسے مجھے گردن سے جکڑ رکھا ہے۔ اور تو جو کچھ بھی ہوتا لیکن میں اپنی کہانی میں فحاشی کو اس حد تک ڈھیل دینے پر قطعاً آمادہ نہ ہوتا جس قدر یہ کچھوا مجھ سے چاہتا ہے۔ اندازہ کیجیے، اپنی کہانی کہنے کے لیے زبان نہیں اور دوسروں کی کہانی کہنے کے لیے چلا ہے! یہ سوال میرے ذہن میں پہلے بھی آیا تھا کہ کچھوا اگر اپنی کہانی کہے گا تو کون سی زبان میں کہے گا۔ اس پر کچھوا کسی فرشتے کی سی زبان میں کہنے لگا کہ اگر کوئی فرشتہ کہانی سنا سکتا ہے تو دنیا کی کوئی بھی زبان بول سکتا ہے۔ اب اس نے دنیا کی مختلف زبانوں میں جو ہفوات بافی کی ہے، اس سے آپ درگزر کر سکتے ہوں تو مزید پڑھ لیجیے، ورنہ جانے دیجیے۔ اپنی صاف ستھری کہانی سنانے کے لیے ہر شخص خود تو موجود ہی ہے۔ جائیے، اسی سے سن لیجیے۔

14

راوی نے مجھے ایک اساطیری سیٹنگ عطا کرنے کی جو کوشش کی ہے اس پر میں اپنی گردن کو پوری طوالت تک باہر نکال کر اور پھر اسے آگے کی سمت پوری طرح جھکا کر اسے کورنش بجا لاتا ہوں۔ شاید ان کوششوں کے نتیجے میں راوی کبھی نہ کبھی کچھ لکھنا سیکھ ہی لے۔ ذیل میں میں بعد کے زمانے کے ایک انگریزی زبان مصنف کی تحریر کا ایک ٹکڑا پیش کر رہا ہوں جس میں اس نے مجھے متعارف کرایا ہے اور جاوید اقبال سے میرے تعلق کی وضاحت کی ہے۔ ہو سکتا ہے راوی یہ تحریر پڑھے اور اپنی بھونڈی کوششوں پر نادم ہو سکے:

Let me tell you at the outset that this golden tortoise has a connection with our story. He can be just anyone in this country because he has no face. The reason he wants to submit his own evidence, so to speak, is that Javed Iqbal, as you have seen, Aftab Iqbal, as you will see ahead, and others like them would deny any association with him. He and his brothers can be seen in the public discourse but the whole race is absent from the journalistic and literary discourses. But he is also somewhat different from his race as well. He has a poetic imagination which works superbly on women. There are others of his race who creep

here and there with their muddy brains and filthy tortoises. But he has got a golden tortoise with him. If women can develop admiration for Iguanas, they may also like him and his tortoise. I imagine them just rubbing the canopy of his tortoise and expressing their motherly affection as well as their sisterly concern that how such a sensitive innocent little thing is able to survive at all. In all probability, he would just smile and go his way. He is rather a dreamer than a mover or a shaker; storms may gather in his mind but subside there as well. He is a real gentleman with a golden tortoise. It is time for me to take leave of you for some moments and leave you in his poetic company. I take you to his room where he is busy in his usual musings in memory of his love (or loves). Ladies and Gentlemen! The fourth dervish of our story; the man with the golden tortoise!

15

Salma wanted him to fuck his ideology: get hold of it, nail it to the floor and overpower it - fuck it through and through. She offered resistance because she knew it would only add to her zest. If she had been a boy she would definitely have been offended but she liked the way her ideas were torn apart, ravished and then raped by him. It was a rape where she was a willing partner, though only psychologically. She was always giving him a resistance in shape of her arguments, but it was only to give the process a colour of rape, to make it more delicious, more lecherous. It was as if her legs remained wide open while on her lips she always had the mantra that "no, you are wrong" (oh! don't go on); oh don't say that (oh don't insert it); this is anti-religion (this is anti-religion).

Every fuck goes like that. First you fuck someone in the mind and then get ready to fuck one actually.

16

''ایدھر آ اوئے بالیا پھدی دیا...''

بالا نجانے کہاں تھا؟ گاڑی کی سیٹ پر بیٹھا تھا، یا کھیت کے بنیرے پر دھریک کے نیچے لیٹا تھا

یا قبائلی علاقے میں کچی مٹی کے فرش پر سو رہا تھا۔ وہ یہ آواز سن کر ہڑبڑا کر جاگ اٹھا تھا اور اس کا منہ غصے کی کڑواہٹ سے بھر گیا تھا۔

اُس کی زبان میں غصے کو 'کوز' کہتے تھے۔

17

لاحول ولا قوۃ۔ اگر آپ کچھوے اور اس کے پیش کردہ انگریزی زبان مصنف کی بکواس سے اکتا گئے ہوں تو میں آپ کو فرنینڈو پیسوآ کے بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔ پرتگالی ادیب پیسوآ صرف سینتالیس برس کی عمر پا کر 1935 میں فوت ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے گھر سے لکڑی کا ایک صندوق برآمد ہوا جس میں اس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے پچیس ہزار صفحات موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر ابھی تک صاف کر کے شائع نہیں کیے جا سکے۔

ان اوراق سے پتا چلتا ہے کہ پیسوآ کے اندر کئی انسانوں کے دماغ تھے۔ ان اوراق میں کہیں اس کی شاعری درج ہے تو کہیں نثر۔ کہیں اس نے کوئی جاسوسی کہانی لکھی ہوئی ہے، کہیں ستاروں کی چال پر مبنی کوئی زائچہ بنا رکھا ہے۔ یہ سب تحریریں پیسوآ ہی کے ہاتھ کی ہیں لیکن اس نے ان کے لیے سو سے زیادہ تخلص یا ادبی نام منتخب کر رکھے ہیں۔ اور جس نام سے بھی اس نے کوئی تحریر لکھی ہے اس کا اسلوب باقی ناموں سے لکھی جانے والی تحریروں کے اسالیب سے مختلف ہے۔ ان شخصیات کو وہ اپنے ''ناموجود ملاقاتی'' کہتا تھا۔ یہ تمام 'ناموجود ملاقاتی' ادیب اور شاعر تھے اور ان کے درمیان پیسوآ کا وقت خوب کٹتا تھا۔ مزید مزے کی بات یہ ہے کہ یہ تمام ادیب اور شاعر ایک دوسرے کی تصنیفات پر تبصرے بھی فرمایا کرتے تھے۔

پیسوا نے ادب نہیں، ایک پوری ادبی دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔

اپنے تخلیق کردہ ان کرداروں کے ساتھ ساتھ پیسوآ کو دیگر ادیبوں کے تخلیق کردہ کرداروں سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس نے تنہا زندگی گزاری اور تیس برس تک ایک ہی ریسٹورنٹ سے کھانا کھایا، لیکن وہ اس بات پر رو بھی سکتا تھا کہ وہ ڈکنز کے تخلیق کردہ کردار 'مسٹر پک وک' سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں کر سکا۔

پیسوآ کے ان ناموجود ملاقاتیوں میں سے ایک ریکارڈو ریس بھی تھا۔ حوزے سارا ماگو نے اسی ریکارڈو ریس کو اپنے ایک ناول کا کردار بنایا، جو پیسوآ کی موت کی خبر سن کر برازیل سے لزبن چلا آتا ہے۔

پیسوآ نے اپنی شخصیت کو سو سے زیادہ شخصیات میں شناخت کیا تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے اندر سے اپنے ہی عکس نکال نکال کر باہر لائے اور انھیں جیتا جاگتا وجود عطا کر دے۔ اب اس کے برعکس ایک صورتِ حال کے امکان پر غور کیجیے۔ جیسے پیسوآ نے اپنی شخصیت سے مزید سو شخصیات نکال لیں، اسی طرح کوئی شخص ایسا بھی تو ہو سکتا ہے جو اپنی شخصیت کے مختلف حصوں کو پہلے سے موجود ایک یا ایک سے زیادہ شخصیات کے مختلف حصوں سے جڑا ہوا محسوس کرے۔ جب آپ کوئی کتاب پڑھتے ہوئے سوچتے ہیں کہ ہاں ہاں! ایسا تو میں بھی سوچ چکا ہوں، تو دراصل آپ مصنف یا اس کے کسی کردار سے ایسی ہی یگانگت محسوس کرتے ہیں۔

آفتاب اقبال نے اپنی ایک کلاس میں 'میمیسس' یعنی ریالٹی کی نقالی کے تصور پر لیکچر دیا تھا۔ اسی تصور پر ایک اور یونانی فلسفی ڈایونیسئس نے ایک انوکھی رائے پیش کی۔ اس نے 'میمیسس' کے بجائے 'امی ٹیشو' کا تصور پیش کیا، جس کے مطابق ادب پہلے سے موجود کسی ادیب کے فن پارے یا متن کی نقالی، اس سے اخذ و استفادے، اسے نئے زمانے سے ہم آہنگ کرنے، اس کی نئی تفہیم کرنے اور اسے توڑ موڑ کر پھر سے جوڑنے جاڑنے اور اسے ایک نئی شکل دینے کی کوشش کا نام ہے۔

(حسین سے حسین عورت کو چھونے کی مردانہ خواہش میں بھی کہیں یہ آرزو تو نہیں چھپی ہوتی کہ اُس کے حسن کی ترکیب، اُس کے حسن کی میک اپ کو ہر جانب سے ٹھونک بجا کر چیک کیا جائے، اسے مختلف پوزیشنوں میں اور مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا جائے اور اپنے ذہن کی رومانی یادداشت میں اس کے حسن کو نئے سرے سے ترتیب دیا جائے؟ اور کیا ایسا نہیں ہے کہ ایک حسین عورت، بلکہ کسی بھی عورت کو، ہر مرد نے اپنی یادداشت میں ایک الگ ہی انداز میں تالیف کر رکھا ہوتا ہے؟ ویسے اس ترتیبِ نو کو تالیف کہنا چاہیے یا تصنیف؟)

بات ہو رہی تھی ریالٹی کی نقالی کی۔ اس کی ایک اور صورت بھی ممکن ہے، اور یہ صورت ادیبوں کے ہاں زیادہ نظر آتی ہے۔ ادیبوں کے پاس امیجی نیشن کی صلاحیت ہوتی ہے جس کی بدولت وہ کسی

کردار کو دیکھ کر، اس کے آس پاس گھوم کر، اس کے بارے میں یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسی کردار کو طرح طرح کی سچویشن میں ڈالا جائے تو اس کا رویہ کیا ہوگا۔ ان سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا اور وہ اپنی امیجی نیشن کا تجربہ کہاں کہاں نہیں آزماتے۔ ان سے یہ بھی بعید نہیں کہ کسی شریف بی بی کی خوابگاہ میں جا گھسیں اور مجامعت کے وقت اس کے منہ سے نکلتی ہوئی آہیں اور کراہیں کچھ اس طرح آپ کے گوش گزار کریں کہ اس کی شخصیت کے کچھ پوشیدہ گوشے کھل کر آپ کے سامنے آجائیں۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے پیسو آ نے خود کو کئی شخصیات میں تقسیم کر کے دیکھا تھا، اسی طرح ادیب اپنے کرداروں میں خود کو شامل کر کے دیکھتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے خدا کسی میں حلول نہیں کرتا، لیکن ادیب اپنے کرداروں میں حلول کر جاتے ہیں، یا کم از کم اس کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

یہ کچھوا جو بیک وقت جاوید اقبال، آفتاب اقبال، بالے اور اقبال محمد خاں کے بارے میں جو جی میں آئے بانک رہا ہے، اسے ریکارڈو ریس کی طرح میری، یعنی راوی ہی کی شخصیت کا ایک روپ سمجھا جا سکتا ہے۔ تاہم میری آپ سے گزارش ہے کہ ایسا نہ سمجھیں۔ اس کے بجائے میں آپ کے سامنے ایک اور تجویز پیش کروں گا۔ آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کچھوا ایک وقت جاوید، آفتاب، بالے اور اقبال محمد خاں کی شخصیت کا ایک حصہ ہے، اس لیے ان کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے۔ اگر آپ یہ conjecture تسلیم نہ کریں تو مجھے کچھوے کے اس کردار کی موجودگی، چار اہم کرداروں کے بارے میں اس کی آگاہی اور پھر ان کے بارے میں مسلسل رائے زنی کے اس کے حق کی خاطر کچھ اور بھی justifications دینا پڑیں گی۔ خیر، جلدی کس بات کی ہے۔ کہانی چل رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ اور justifications بھی نکل آئیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ کچھوا مزید کیا بکواس بازی کر رہا ہے۔

18

لومیکنگ کے فکری عوامل

راوی اگر اپنے کرداروں کے بارے میں کچھ conjectures پیش کر سکتا ہے تو مجھے بھی اس کا حق حاصل ہے۔ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں اور میری زبان منہ میں بند رکھنے کے لیے نہیں، باہر نکال کر دکھانے کے لیے ہے۔ تو حاضر ہیں میرے conjectures:

اقبال محمد خاں کو کیا تکلیف تھی کہ وہ ہر عورت کی ٹانگوں میں گھس جانا چاہتے تھے؟ ویسے ان پر یہ الزام غلط ہے کہ وہ 'ہر عورت' کے بارے میں یہ سوچتے تھے۔ ایسا ہوتا تو انھیں طوائف بازی کا بھی شوق ہوتا۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رومانی طبیعت رکھتے تھے اور ہر ایسی عورت کے ساتھ رومانس لڑانے کے بھی قائل تھے جس کے ساتھ انھوں نے کبھی بھی جنسی تعلق قائم کیا۔

لومیکنگ کیا ہے؟ ایک سوراخ میں متواتر دخول۔ عورتیں، اور کئی مرد بھی، یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ اس سے ملتا کیا ہے؟ ایک فوری جواب تو یہی سامنے آتا ہے کہ اس سے تنے ہوئے اعصاب کو سکون مل جاتا ہے۔ لیکن اگر لومیکنگ اور اس کی خواہش کا یہی ایک سبب ہوتا تو ہر مرد خودلذتی پر ہی گزارہ کر لیتا اور عورت کو گھاس تک نہ ڈالتا۔ اعصابی اور جنسی تناؤ کی حقیقت اپنی جگہ، لیکن معاملہ اس سے کچھ آگے کا ہے۔

میں یہاں ایک اور conjecture پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ لومیکنگ کے دوران ایک سوراخ میں دخول سے انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک اور ریالٹی میں سوراخ کر کے اس میں داخل ہو رہا ہے۔ انسانی فلسفے نے ہر شے کو کسی دوسری شے سے مقابلہ کر کے، اس کے مماثل رکھ کر یا اس کے مقابلے میں ناپ کر پہچانا ہے۔ سیلف کی ریالٹی اپنی شناخت کیسے کرتی ہے؟ خود کو کیسے پہچانتی ہے؟ دوسروں کی آنکھوں سے۔ جی ہاں، دوسروں کی آنکھ سے۔ ایک سیلف کی ریالٹی جب دوسرے سیلف کی ریالٹی میں سوراخ کر کے داخل ہو جاتی ہے تو بیک وقت دو حقیقتوں کا اثبات ہو جاتا ہے۔ کسی سے ہاتھ ملانے یا گلے ملنے کی بھی ایک significance ہے، لیکن تہذیب کے ہزاروں لاکھوں سال کے سفر نے یونی میں ایک ایسی significance پیدا کر دی ہے جس کے سبب مرد اسے عورت کی ذات کا مرکزہ سمجھنے لگے ہیں اور وہ کسی بھی عورت کو پسند کرنے کے بعد اس کے اس مرکزے تک رسائی کو ہی اس کی اصل ریالٹی تک رسائی سمجھتے ہیں۔ وہ اس ریالٹی میں سوراخ کر کے ان کی ذات کے مرکزے، ان کی ذات کی کنہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اپنی ریالٹی پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے انسان کیا کیا نہیں کر سکتا۔ سیکس کون سی بڑی چیز ہے؛ دوستوئیفسکی کے ہیرو کسی کو زخم لگا کر اپنی ریالٹی تک پہنچتے تھے۔

میں زخم لگاتا ہوں اس لیے میں ہوں۔

میں قتل کرتا ہوں اس لیے میں ہوں۔

دوسری جانب عورت یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے اندر ایک خلا ہے جو ذکر کے دخول سے بھر رہا ہے۔ عورت لوسیکنگ کے دوران اپنے خالی پن کو بھرتی ہے اور اس طرح اس کی ریالٹی، جس سے ریالٹی منہا ہو چکی ہوئی ہے، کچھ وقت کے لیے بھر جاتی ہے۔ ذکر اس کے لیے ایک ستون ہے جو منہا شدہ ریالٹی میں اس کے اکھڑے ہوئے قدموں کو ایک جگہ رک کر زمین پر جمنے میں مدد دیتا ہے۔ اور مرد؟ مرد کسی ایسے ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح پانی میں ڈبکیاں لگاتا ہے جسے کسی سہارے کی تلاش ہو، کوئی ٹھوس سہارا جس سے جڑ کر، جس سے لگ کر اس کی ریالٹی کو کوئی دہلیز، کوئی قدمچہ، کوئی threshold مل سکے اور وہ اس پر کھڑا ہو کر اپنے ہونے کا اعلان کر سکے۔ ایک زوردار اعلان۔ کسی دوسری ریالٹی میں داخل ہونے سے اس کا یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی ایک ریالٹی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اب ہم دیکارت کے مشہور مقولے 'میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں' میں یوں ترمیم کر سکتے ہیں:

'میں چودتا ہوں اس لیے میں ہوں۔'

19

کچھوے نے اقبال محمد خاں جیسی معزز شخصیت کے بارے میں جو بکواس کی ہے، میں، راوی، اس سے خود کو بری الذمہ سمجھتا ہوں۔ یہ جو کچھ اس نے تحریر کیا ہے اس کی صداقت یا عدم صداقت سے قطع نظر، اس کا غیر اخلاقی طرزِ کلام مجھے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ میں اس کی ذمہ داری سے مکمل طور پر ہاتھ اٹھا لوں۔ لیکن طرزِ کلام سے صرفِ نظر کیا جائے تو کچھوے کا موقف بنیادی طور پر یہ ہے کہ اقبال محمد خاں، شعوری یا لاشعوری طور پر، یہ سمجھتے تھے کہ ریالٹی پر ان کی گرفت کمزور تھی۔ میرا خیال ہے کہ کچھوے کی اس بات سے میں اگیری کر سکتا ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال محمد خاں کیوں یہ سمجھتے تھے کہ ریالٹی پر ان کی گرفت کمزور ہے؟ لیکن یہ مسئلہ ایک اقبال محمد خاں کا تھوڑا ہی تھا۔ ان کے ملک کی اکثریت اسی مسئلے سے دوچار تھی۔ غریبوں کو تو ویسے ہی نہیں پتا ہوتا کہ کل وہ کہاں اور کس حال میں ہوں گے، مگر اسلام آباد، لاہور اور

کراچی کی کوٹھیوں میں رہنے والے بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ کل ان کے ہاتھ میں پیسہ اور جائیداد ہو گی یا نہیں۔ ان میں سے اکثر نے یہ پیسہ غیر قانونی ذرائع سے بنایا تھا اور انھیں فکر تھی کہ کل اگر ان کا پول کھل گیا تو وہ فٹ پاتھ پر آن بیٹھیں گے۔ ان کے شعبے میں نئے آنے والے جلد از جلد بہت سا پیسہ اکٹھا کرنا اور جائیداد بنانا چاہتے تھے جس کے بعد انھوں نے ایک پرسکون زندگی کا خواب دیکھا ہوا تھا۔ اچھی تنخواہیں لینے والوں کو فکر تھی کہ اچانک کسی دن کچھ ہو گا اور ان کی نوکری جاتی رہے گی۔ اگر اور کچھ نہیں ہو گا تو ملک کے حالات اکیسویں یا چھتیسویں مرتبہ ایک ایسا موڑ لیں گے جس سے ان کی گھریلو معیشت تباہ ہو جائے گی۔ پاکستان میں نجی زندگی میں بڑے پیمانے پر اتھل پتھل کوئی عجیب بات بھی تو نہیں تھی۔ کسی خاندان میں ایک لڑکا ہونہار نکل آتا، اسے اچھی نوکری مل جاتی اور اس کے دیگر گھر والوں کو سہارا مل جاتا تو کسی روز وہ کسی ڈاکو کی گولی یا کسی دہشت گرد کے بم کا نشانہ بن سکتا تھا۔ کوئی لڑکا اپنا سارا بچپن گلیوں میں آوارہ گردی کر کے گزار چکا ہوتا تو جوانی میں قسمت کے ایک اچھے اسٹروک سے بیرونِ ملک جانے میں کامیاب ہو جاتا اور وہاں سے ڈالروں اور ریالوں کی بوریاں بھیج کر اپنے گاؤں یا شہر میں اپنے باقی گھر والوں کے لیے بڑا سا مکان بنانے میں مدد دے سکتا تھا۔ کوئی لڑکا کسی سیاسی جماعت کے ساتھ لگ کر کچھ ہی سالوں میں ٹھیکے وکے حاصل کر کے علاقے میں ممتاز حیثیت اختیار کر سکتا تھا یا کوئی لڑکا کسی اور سیاسی جماعت کے ساتھ لگ کر کچھ ہی سالوں میں کسی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔

ایسے میں ریالٹی پر کسی کی گرفت کہاں تک مضبوط رہ سکتی تھی؟

20

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال محمد خاں کیوں یہ سمجھتے تھے کہ ریالٹی پر ان کی گرفت کمزور ہے؟ اس کا ایک جواب شاید ان ڈائریوں میں سے ایک میں ملتا ہے جو آفتاب اقبال کے ہاتھ آئی تھیں اور جن کے موضوعات سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی اکتاہٹ کے کئی گھنٹے ان پر صرف کیے تھے۔ ایک ڈائری میں ایک اقتباس کچھ یوں درج تھا:

''میں نے اکثر سوچا ہے کہ میں عورتوں میں انوالو ہونے کی اپنی کمزوری پر قابو کیوں نہیں پا

سکا۔ عمر کے مختلف اوقات میں میں نے اس کے مختلف اسباب طے کیے ہیں۔ آج مجھے ایک اور بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ اس بات کا تعلق عورتوں کی ایک خاصیت سے ہے۔ ایک سے زیادہ مردوں سے کسی نہ کسی سطح کا تعلق رکھنے والی عورتوں میں میں نے ایک بات دیکھی ہے۔ انھیں ذرا کرید اجائے تو وہ ایسے مردوں کا تذکرہ کرتی ہیں جو ان کے بقول ان میں دلچسپی رکھتے تھے۔ میں نے ان کی یہ بات کبھی من و عن تسلیم نہیں کی۔ اس میں کچھ نہ کچھ لو چا ہوتا ہے جسے وقت کے ساتھ میں تھوڑا بہت پہچاننے لگا ہوں اور اس میں عورت کے چہرے کے تاثرات پڑھنے سے کافی مدد مل جاتی ہے۔ زیادہ تر عورتیں ان مردوں کو اپنے عاشق قرار دیتی ہیں۔ البتہ کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو آہیں بھرتی ہوئی، اپنے کسی عشق کا اقرار بھی کر لیتی ہیں۔ ان عورتوں کی نظر سے ان کے عاشق مردوں کو دیکھا جائے تو انھیں دو کیٹیگریز میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ برسوں عورتوں کی کہانیاں سننے کے بعد میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے ان میں سے کسی کیٹیگری میں نہ رکھا جائے۔ پہلی کیٹیگری میں عورتیں ان مردوں، لڑکوں یا بزرگوں کو رکھتی ہیں جو ان پر نظر رکھتے ہیں، انھیں بہانے بہانے سے چھونے کی کوشش کرتے ہیں، اور کبھی موقع مل جائے تو بانہوں میں جکڑ کر بوسہ لینے کے لیے بھی جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ لفظ مجھے انتہائی ناپسند ہے لیکن عورتیں ایسے مردوں کو 'ٹھرکی' کہتی ہیں۔ یہ وہ مرد ہوتے ہیں جن کا لمس عورت کے لیے repelling ہوتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ کوئی عورت مجھے اس کیٹیگری میں شامل کرے اور میں اسے چھونے سے پہلے ہر ہر لحاظ سے اطمینان کر لیتا ہوں کہ میرا لمس اس کے لیے repelling نہیں ہوگا۔ تجربہ کار عورتوں نے ایک دوسری کیٹیگری بھی بنائی ہوئی ہے۔ یہ ان مردوں کے لیے ہے جنھیں ان عورتوں نے قریب آنے کا موقع دیا لیکن وہ اپنی جھجک، شرافت یا کسی اور مخمصے کی وجہ سے اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ایسے مردوں کو عورتیں جھینپو، للّو اور بعض تو نامرد تک کہتی ہیں۔ یہ وہ مرد ہوتے ہیں جنھیں عورت اپنا آپ سونپنے پر آمادہ ہوتی ہے لیکن وہ اسے مایوس کرتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ کوئی عورت مجھے اس کیٹیگری میں بھی شامل کرے۔

''میں سوچتا ہوں کہ عورتوں میں میری مسلسل انوالومنٹ کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے ہمیشہ ان کے بیانیے کو اہمیت دی ہے۔ میں اپنی ریالٹی کو انھی کی زبان سے سمجھتا اور انھی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا ہوں۔ جب کوئی قابلِ لحاظ عورت میرے قریب آئی تو میرے اندر یہ کشاکش پیدا ہو گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو

تھے۔ بالا اپنی کامیابی پر مسکراتا ہوا گھر واپس چلا گیا۔

رفیق اور اس کے سنگیوں نے بالے کو دیکھا تو نہیں تھا لیکن بکری کے سر پر گہرے زخم کے نشان اور پاس پڑے ہوئے خون آلود پتھر سے وہ اس کی ہلاکت کے سبب تک فوراً پہنچ گئے تھے۔ شام کو گاؤں میں اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ بکری کو پتھر سے کون مار سکتا ہے۔ چاچے نورے نے اطلاع دی کہ اس نے ایک دن بالے کو دیکھا تھا کہ وہ ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا، سامنے کھڑے ہوئے کھمبے کو پتھروں سے نشانہ بنا رہا تھا۔ فیضو مچھیرے کے لڑکے طہرو نے بتایا کہ اس نے بالے کو رسول جھیل کے کنارے پرندوں کو پتھر سے نشانہ بناتے ہوئے دیکھا ہے۔ سب نے یہ صلاح دی کہ انھیں چل کر بالے کے باپ سے اس کی شکایت کرنی چاہیے۔ رفیق کے قریبی دوستوں کا خیال تھا کہ انھیں بالے کو پکڑ کر اس کی خوب ٹھکائی کرنی چاہیے، لیکن رفیق نے ان سب کو روک دیا۔

'وخ میں کردا کے آں ایدے نال!' اس نے کہا اور سنگیوں کے پوچھنے پر بھی نہ بتایا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔

9

بالا حسبِ دستور باپ سے جوتوں پر لات کھا کر باہر نکلا تو اسے شفقت نظر آیا۔ شفقت بڑے دوستانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا اور اس سے کہا کہ وہ کئی روز سے اسے ایک راز میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ بالے کو راز کے لفظ سے ہی پتا چل گیا کہ وہ رفیق اور اس کی بہن کے بارے میں کچھ بتانے والا ہے۔ بالے کو پتا تھا کہ نسرین جب بھی گھر سے باہر نظر آتی ہے، رفیق اسے تاڑتا ہے اور اس کی جانب ذو معنی جملے اچھالتا ہے اور اس کی سہیلیوں کی موجودگی کی بھی پروا نہیں کرتا۔ نسرین یہ بات گھر میں بھی بتا چکی تھی اور عالمگیر نے ایک مرتبہ گھر سے باہر نکل کر رفیق کو اپنی بہن سے جنسی تعلقات قائم کرنے کا بانگِ دُہل مشورہ بھی دیا تھا۔ مگر رفیق نے یہ گالی بھی مسکرا کر وصول کی تھی اور اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا۔

''مینوں پتا اے،'' بالے نے شفقت کو بات کرنے سے روکتے ہوئے کہا۔ لیکن شفقت نے اسے کہا کہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ رفیق اپنے دوستوں کو کچھ اور بھی بتاتا پھر رہا ہے۔ بالا سمجھ گیا اور اس نے شفقت کو مزید بات کرنے سے ایک بار پھر روک دیا۔ اس نے اپنا خون کھولتا ہوا محسوس کیا

اور تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ ابا گھر سے نکل کر جا چکا تھا اور نسرین جھاڑو لگا رہی تھی۔ بالا سیدھا نسرین کی طرف بڑھا اور اس کی کمر پر پوری طاقت سے مکا رسید کیا۔ نسرین درد سے پیٹھ کے بل زمین پر ڈھے گئی۔ اس نے حیرانی سے بالے کی طرف دیکھا۔ بالے نے آنکھوں میں خون بھر کر اس سے پوچھا کہ رفیقا گاؤں بھر میں کیا کہتا پھر رہا ہے۔ نسرین نے کہا کہ اسے نہیں معلوم، وہ تو اس پر تھوکتی بھی نہیں۔ بالے کو بھی یقین تھا لیکن فی الحال اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنا غصہ کس پر اتارے۔ نسرین کی کراہ سن کر عالمگیر بھی چلی آئی۔ بالے نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے اسے بتایا کہ رفیقا گاؤں بھر میں کیا بتاتا پھر رہا ہے۔ عالمگیر کے منہ سے گالیوں کا ایک فوارہ اٹدا اور اس نے کہا کہ رفیقا بکواس کر رہا ہے۔ نسرین کئی دن سے اکیلی باہر ہی نہیں گئی۔ بالا چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس نے خود کو ایک ایسا ذمہ دار فرد محسوس کیا جسے جلد از جلد اس معاملے میں کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ گھر پر ایک سکوت سا طاری تھا۔ عالمگیر نے چارپائی پر بالے کو سنجیدگی سے بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کے اوپر سرمئی سی لوئی آ رہی تھی جو اس کی جوانی کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ عالمگیر اس سکوت کے عالم میں بالے کو دیکھتی رہی۔ اس نے اپنے سینے میں ممتا کو انگڑائی لے کر جاگتے ہوئے محسوس کیا اور سوچا، "ہن وڈا سارا ہو گیا اے میرا پتر..." وہ ایک احساسِ تفاخر کے ساتھ کچھ دیر بالے کو دیکھتی رہی اور پھر بالے کے پاس آ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی، "چل روٹی کھا لے"۔ بالے نے سختی سے عالمگیر کا ہاتھ اپنے کاندھے پرے سے ہٹا دیا اور چارپائی سے اٹھ کر چلا گیا۔ وہ روٹی کی چنگیر کی طرف گیا تھا۔ عالمگیر چاہتی تھی کہ اسے روٹی وہ خود نکال کر دے مگر وہ جانتی تھی کہ بالا روٹھا ہوا ہے اور وہ اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ وہ دور ہی سے بالے کو پسندیدگی سے دیکھتی رہی جس میں آج اقبال محمد خاں کی شباہت زیادہ ہی نظر آ رہی تھی، جب وہ بہت سنجیدہ ہوا کرتے تھے۔ عالمگیر کی توجہ کافی دیر سے نسرین کی طرف نہیں ہوئی تھی جو بالے سے گھونسا کھانے کے بعد سے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی ٹسوے بہا رہی تھی۔ عالمگیر نے اسے گھور کر دیکھا تو نسرین نے سسکیاں لیتے ہوئے جھاڑو دوبارہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ گھر میں کچھ دیر جھاڑو کے فرش پر چلنے کی آواز آتی رہی۔ بالا کچھ دیر بعد گھر سے پھر باہر نکل گیا۔ عالمگیر نے پیچھے سے اسے آواز دی تو غصے کی ایک لہر بالے کے تن بدن میں دوڑ گئی۔ "آپنے کم نال کم رکھیا کر!" اس نے عالمگیر کو سختی سے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

گھر سے باہر اسے جو لوگ ملے تو اسے ایسا لگا کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں اور آپس میں ایسی باتیں کر رہے ہیں جن کا موضوع وہ یا نسرین ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے رفیق کے دو دوست نظر آئے جو اسے مسکرا کر دیکھتے رہے۔ بالا ان کے پاس سے گزرا تو ان میں سے ایک کی آواز اس کے کانوں میں آئی:

"یہ دتی! ہاہاہا..."

بالا غصے سے مڑا اور انھیں گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ دونوں اسے مسکرا کر دیکھنے لگے۔ وہ دونوں اٹھارہ بیس سال کے ہٹے کٹے جوان تھے اور بالا جانتا تھا کہ وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ وہ وہاں سے چل دیا۔ اسے پیچھے سے ان کی آواز آئی۔

"ہاں ہاں۔ راتیں چھت تے بلا کے تے..."

"ہاہاہا!" دوسرے کا قہقہہ اسے سنائی دیا۔

بالا کڑی دوپہر میں چلتا ہوا اپنے برگد کے درخت پر پہنچا۔ درخت کی ایک شاخ کی کھوہ میں چھپائے پتھروں کی تھیلی نکالی اور بہت کچھ سوچنے لگا۔

10

بالا روز صبح اٹھ کر رفیقے کے گھر پر نظریں جما دیتا لیکن رفیقا صبح سویرے گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ تین چار روز بعد اس نے دیکھا کہ سرگی کی اذان کے بعد رفیقا گھر سے نکل کر رسول بیراج کی طرف جا رہا ہے۔ بالا بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ نہر کے پیچھے سرکنڈوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ سرکنڈوں میں اسے نشانہ بنانا آسان نہیں تھا کیونکہ پتھر سرکنڈوں سے ٹکرا کر اپنی سمت تبدیل کر سکتا تھا۔ بالا کافی دور سے رفیق کو دیکھتا رہا۔ رفیق نے سرکنڈوں کے درمیان ایک خالی جگہ دیکھی اور اپنی شلوار کا ناڑا ڈھیلا کر دیا۔ اس نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا اور پھر چلتا ہوا کچھ دور جا کر شلوار گھٹنوں سے نیچے لے جا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ بالا بغیر کوئی آواز پیدا کیے اب اس کے پیچھے کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ رفیقے نے اپنی قمیض اوپر کی ہوئی تھی اور اس کی ننگی تشریف بالے کے بالکل سامنے تھی۔ بالے نے اپنے اندر نفرت کے ساتھ ساتھ گھن بھی محسوس کی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتھر پر اس کی گرفت

اور بھی مضبوط ہو گئی۔ بالے نے دو تین بار اپنے بازو کو بالے کی طرف کیا۔ وہ یہ بات یقینی بنانا چاہتا تھا کہ اس کا نشانہ کم از کم اس بار تو بالکل نہ چوکے۔ یکا یک رفیعے نے منہ پھیرا تو بالے نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر پوری طاقت سے اس کی طرف پھینک دیا۔ پتھر رفیعے کے ماتھے پر لگا اور وہ اپنے پاخانے پر ڈھے گیا۔ بالے نے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک اور پتھر دائیں میں سنبھالا اور رفیعے کے سر پر پہنچ گیا۔ رفیعے کے ماتھے سے خون ابل رہا تھا لیکن اس نے اگلے وار سے بچنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ منہ کے آگے کر لیے تھے۔ بالے نے اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا۔ رفیعے نے اس بار اپنا چہرہ چھپانے کے بجائے اٹھ کر بالے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کی شلوار اس کے گھٹنوں میں پھنسی ہوئی تھی اس لیے وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا اور بالے نے اس کے سینے پر لات مار کر اسے پھر گرا دیا۔ اس کا منہ خون سے لت پت ہو چکا تھا اور شلوار پیروں میں اٹکی ہوئی تھی۔ بالے کا تیسرا پتھر اس کے زخمی ماتھے پر لگا اور اس کا سر چکرا کر ڈھے گیا۔ بالا اس کے سر کی پچھلی جانب سے آیا اور ایک بڑے پتھر سے اس کے سر پر بار بار ضرب لگانے لگا۔ رفیعے کے ہاتھ نیم بے ہوشی میں اپنے سر کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ جس جگہ نا موجود ہوتے پتھر کی ضرب وہیں پڑتی۔ بالے نے پتھر سے کوٹ کوٹ کر اس کی انگلیاں بھی توڑ دیں۔ رفیعے کے جسم میں کوئی حرکت باقی نہ رہی تو بالے نے پتھر سے مار مار کر اس کا سر کچل دیا۔ بالا اٹھا تو اس نے رفیعے کا جسم دیکھا جو نیچے سے ننگا تھا۔ اس کی جانگھوں کے درمیان ایک مریل سا چوہا پڑا تھا۔ نفرت کی ایک اور لہر بالے کے سینے میں امڈی اور اس نے پتھر مار مار کر اسے بھی کچل دیا۔

ایک موٹی سی مکھی کہیں سے آن موجود ہوئی اور رفیعے کی لاش، خون اور پاخانے پر منڈلانے لگی۔ صبح کی دور دور تک پھیلی ہوئی خاموشی میں ہوا سرکنڈوں کے جھاڑ جھنکاڑ کے اوپر سے گزرتی ہوئی سانپ کی شوکر جیسی آواز دیتی۔ خاموشی میں موٹی مکھی کی آواز کسی سائرن جیسی تھی۔ مکھی نے کچھ دیر واویلا کیا اور پھر دور جاتے ہوئے بالے کے کانوں میں اس کی اس کی آواز بھی معدوم ہوتی چلی گئی۔

11

بالے نے ایک پوٹلی میں پہلے ہی اپنا سامان باندھ رکھا تھا۔ رفیق کے قتل کا پوری طرح یقین کر لینے کے بعد اب اسے وہاں سے بھاگنا تھا۔ اسے پتا تھا کہ رفیق کے گھر والے دوپہر کے کھانے سے

پہلے اس کے بارے میں پریشان نہیں ہوں گے۔ ان چھ گھنٹوں میں اسے کہیں نہ کہیں نکلنا تھا۔ بس میں بیٹھنے میں یہ قباحت تھی کہ ہر بس کے ڈرائیور، کلینر یا کچھ مسافر اسے یا اس کے ابے شوکت کو جانتے تھے اور وہ بعد میں بتا سکتے تھے کہ وہ بس میں بیٹھ کر کہاں گیا تھا۔ اس نے پہلے سے طے کر رکھا تھا کہ وہ وہاں سے پیدل نکلے گا۔ وہ مونگ گاؤں کے پیچھے سے ہوتا ہوا دریائے جہلم کی طرف چلنا شروع ہوا اور دریائے جہلم کے اس کنارے پہنچا جو کم چوڑا تھا۔ اس نے پوٹلی سر پر رکھی اور تیر کر دریا پار کر لیا۔ اب ملک پور کا گاؤں اس کے سامنے تھا۔ راستے میں سرکنڈوں کے جھاڑ جھنکاڑ میں وہ آسانی سے روپوش ہو سکتا تھا۔ یہاں اسے شروع میں کچھ ڈر لگا کہ کسی بھی وقت کوئی جانور وہاں آ سکتا تھا، مگر اسے اپنے پتھروں کی پوٹلی پر پورا بھروسا تھا۔ دوپہر ہو گئی تو اس نے پوٹلی سے روٹی نکال کر کھائی۔ کھانے سے اُسے نیند سی آ گئی اور وہ وہیں ننگی زمین پر سو گیا۔ سہ پہر کو اُس کی آنکھ کھلی تو وہ اٹھا اور واپس دریا کی طرف گیا۔ کنارے سے کوئی بھی اس کی سمت میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دریا میں اتر کر منہ پر پانی کے چھپاکے مارے اور پھر اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے طے کیا تھا کہ وہ رات میں اپنا سفر کرے گا۔ پوٹلی میں اب بھی ایک روٹی بچی ہوئی تھی۔ یہ روٹیاں اس نے رات کو تندور سے خرید کر گھر میں چھپا کر رکھی ہوئی تھیں اور سالن گھر سے ہی اٹھایا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہوئے تو اس نے دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرنا شروع کیا۔ اس کا رخ جلال پور شریف کی طرف تھا جہاں حکیم حافظ برکت اللہ شاہین کا گھر تھا۔

جب وہ جلال پور شریف پہنچا تو سارا گاؤں سویا ہوا ملا۔ وہ ایک گلی سے اندر داخل ہوا تو اس کا استقبال کتوں نے کیا۔ ایک آدھ کتا ہوتا تو وہ پتھر کے آزمودہ نسخے سے اس کا کام تمام کر دیتا، لیکن پہلے کتے کی آواز پر پورے جلال پور شریف کے کتے بیدار ہو کر اس کی آواز میں آواز ملانے لگے تھے۔ بالا قصبے سے باہر نکل آیا اور ایک کھیت کے بنّے پر چادر بچھا کر لیٹ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور ویسے بھی اس کی آنکھیں سرگی ویلے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس کا جی نہانے کو چاہا۔ وہ اٹھا اور کپڑے اتار کر بنے کے ساتھ بنی ہوئی کھال میں لیٹ گیا، لیکن اسے اپنے بدن پر کیچڑ کی چکناہٹ کا احساس ہوا۔ کھال کے اوپر تو پانی صاف تھا لیکن کھال میں اس کے اترنے سے نیچے کی کیچڑ اور بھربھری مٹی اوپر چلی آئی تھی اور وہ نہانے سے صاف ستھرا ہونے کے بجائے کیچڑ سے پُت گیا۔ وہ

جلدی سے باہر نکلا، کپڑے پہن لیے اور کھال میں مٹی کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ مٹی تھوڑی سی بیٹھی تو اس نے منھ پر پانی کے چھپاکے مار کر اسے صاف کیا اور چادر کی بکل مار کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد قصبے سے فجر کی اذانیں سنائی دینے لگیں تو وہ قصبے کی طرف لپکا۔ چار پانچ منٹ بعد وہ برکت اللہ شاہین کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے چادر کی بکل مارے بالا کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں تو وہ اسے پہچان نہ پایا، لیکن اس نے چادر اتاری تو پہچان گیا اور اسے گھر کے اندر لے آیا۔

حافظ کے باورچی خانے سے دھواں اٹھ رہا تھا مگر کوئی اندر موجود نہیں تھا۔ حافظ خود ہی صبح سویرے چولھے پر چائے کی کیتلی چڑھا دیتا تھا۔ گھر میں اس کی بی بی اور ایک آٹھ نو سال کی لڑکی موجود تھی، جو دونوں سو رہے تھے۔ بالے نے مختصر الفاظ میں حافظ کو بتایا کہ وہ گھر سے بھاگ آیا ہے اور اس نے خود کو دین کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے حافظ ہی اسے بتائے کہ اسے آگے کیا کرنا چاہیے۔ حافظ صبح ہی صبح پڑنے والی اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے بالے سے کہا کہ اسے کچھ سوچنے کا موقع دے۔ ویسے بھی اسے نماز پڑھنے جانا تھا۔ وہ بالے کا ہاتھ پکڑ کر اسے لکڑیاں اور دیگر فاضل سامان رکھنے والی کوٹھری میں لے آیا اور اسے کہا کہ وہ وہیں رکے۔ بالا حیران پریشان یہ سب دیکھتا رہا اور حافظ اسے کوٹھری میں بند کر کے باہر سے تالا لگا کر چلا گیا۔

12

حافظ برکت اللہ شاہین سے اس کی دو تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور وہ دین کے لیے خود کو وقف کرنے کا اس سے وعدہ کر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ اسے مونگ کی مسجد کے پیش امام نے جمعے کی نماز کے دوران متعارف کرایا تھا۔ وہ کشمیر اور افغانستان میں جہاد کے سلسلے میں چندہ اکٹھا کرنے کی مہم پر تھا۔ عالمگیر کو اپنے گناہوں کا خیال بھی ستاتا تھا اس لیے وہ بالے سے صرف ایک فرمائش کرتی تھی کہ وہ کم از کم جمعے کی نماز پڑھنے مسجد چلا جایا کرے۔ بالے کو مسجد میں آنے والا وہ شخص کچھ عجیب سا لگا تھا۔ اس نے اپنے مختصر خطاب میں اپنے ساتھیوں کے کارنامے بتائے تھے جس پر مسجد نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کے نعرے گونج اٹھے تھے۔ بالے نے بھی اپنے سینے میں ایک جوش سا ابلتا ہوا محسوس کیا تھا۔ نماز کے بعد کئی لوگوں نے حافظ شاہین کے گرد گھیرا ڈال لیا اور اس سے مختلف سوالات پوچھنے لگے۔ بالا خاموشی سے اس

کی باتیں سنتا رہا اور پھر ایک دن اس کے گاؤں جلال پور شریف پہنچ گیا جو دریائے جہلم کے اُس پار ہی واقع تھا۔ حافظ شاہین اسے جلال پور شریف کی مسجد میں نماز کے وقت مل گیا تھا اور حافظ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا تھا۔ بالا گھر سے بھاگ جانے کے منصوبے تو پہلے ہی بنا چکا تھا۔ مگر اسے یہ نہیں سوجھتا تھا کہ وہ بھاگ جانے کے بعد کرے گا کیا؟ تعلیم اور ہنر اس کے پاس کوئی خاص تھا نہیں کہ کوئی اسے نوکری دیتا۔ اسے یہ بات بڑی مناسب معلوم ہوئی کہ بھاگنے کے بعد وہ کسی ایسے گروپ کے ساتھ ہو لے جو اس کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا بھی انتظام کر دے۔ اس کے بعد وہ اپنے مستقبل کے بارے میں مزید کچھ سوچ سکتا تھا۔ حافظ شاہین کے گھر اس کی باتیں سننے کے بعد اس نے یہ طے کر لیا کہ وہ بھاگ کر اسی کے ساتھیوں میں شامل ہوگا اور اس نے شاہین سے کچا پکا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ حافظ شاہین کو امید نہیں تھی کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ اسلام کی حمایت میں گھر بار چھوڑ دینے کا ارادہ تو بہت لوگ کرتے تھے، لیکن اسے پورا کرنے کا خیال کم ہی لوگوں کو آتا تھا۔ دوسری جانب بالے کو یہ تو پتا تھا کہ اگر وہ گھر سے بھاگنے کی کہانی حافظ کو سنائے گا تو وہ اسے اپنے پاس پناہ دے دے گا، لیکن وہ اسے یہ بتانے پر ابھی خود کو آمادہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ اپنے گاؤں میں قتل کر کے بھاگا ہوا ہے۔

13

کچھ دیر بعد بالے کو باہر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ اس نے دروازے کی درز سے جھانک کر دیکھا تو حافظ کی بیوی اور بیٹی اٹھ چکے تھے۔ آٹھ نو سال کی بچی کچھ دیر چولھے کے نیچے جلتی ہوئی لکڑیوں میں لوہے کی ایک پھونکنی سے پھونک مارتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد توے پر پکتے ہوئے پراٹھوں کی خوشبو اس کے نتھنوں میں آئی تو اس کی بھوک بیدار ہو گئی۔ کچھ دیر بعد حافظ کی بیٹی برقع پہنے، کاندھے پر بستہ لٹکائے نظر آئی اور پھر باہر نکل گئی۔ اتنے میں حافظ بھی گھر آ گیا۔ بے چینی سے بالے کا برا حال ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں حافظ پولیس کو اطلاع نہ دے آیا ہو اور کچھ ہی دیر میں سپاہی اسے پکڑنے نہ آ رہے ہوں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے حافظ پر اعتبار کرنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔ کچھ دیر بعد اسے دروازے پر قدموں کی آواز آئی اور پھر تالا کھلنے کی۔ دروازہ کھلا اور حافظ اس کے سامنے تھا۔ وہ اسے پکڑ کر گھر کے بڑے سے کمرے میں لے گیا اور اندر سے کنڈی لگا دی۔ اس نے اپنی بیوی کو باہر کہیں بھیج دیا تھا۔ بالا

کمرے میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا جس کے سامنے میز پر اخبار پڑا تھا۔

حافظ کے چہرے سے پریشانی نمایاں تھی۔ اس نے اخبار کھولا اور اس کے اندر کے صفحات پر درج ایک خبر اسے دکھائی۔ بالے نے خبر کی سرخی پڑھی تو خوف کی ایک لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیکن خبر پڑھتے ہوئے اس کو اتنا غصہ آیا کہ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔

''بہن سے مبینہ زیادتی پر دوست کا قتل''

منڈی بہاء الدین (نامہ نگار) منڈی بہاء الدین کے قصبے مونگ میں ایک نوجوان اقبال عرف بالا نے اپنی بہن سے دست درازی کرنے پر طیش میں آ کر اپنے دوست محمد رفیق کو قتل کر دیا۔ اہلِ علاقہ کا کہنا ہے کہ محمد رفیق نے مبینہ طور پر کچھ روز پہلے بالے کی بہن مسماۃ ن سے زیادتی کی تھی تاہم محمد رفیق کے اہلِ خانہ کا کہنا ہے کہ یہ الزام غلط ہے۔ خود مسماۃ ن نے بھی تھانہ مونگ میں نامہ نگار سے بات کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ مقتول محمد رفیق نے اس سے زیادتی نہیں کی تھی۔ تاہم پولیس کا کہنا ہے کہ اصل بات اس کی میڈیکل رپورٹ کے بعد ہی معلوم ہو سکے گی۔ پولیس نے اقبال کے والد شوکت کو حراست میں لے لیا ہے جب کہ اقبال عرف بالے کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے۔''

14

''یہ سب بکواس ہے۔ کس کنجر نے یہ خبر بنائی ہے۔ میری بہن کے ساتھ کچھ کرنے کی کسی کو جرأت بھی نہیں ہو سکتی۔ اس کنجر نے اپنی گندی زبان سے صرف میری بہن کا نام لیا تھا۔ اگر وہ اور کچھ کرتا تو میں اس کے پورے خاندان کو گولی مار دیتا۔'' بالا اپنی آواز کو پوری قوت سے دبانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن غصے سے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

''پتر، یہ سب تو ہوتا ہی ہے۔ اخبار والوں کو مرچ مسالے سے کام ہوتا ہے۔ لیکن تو نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تو قتل کر کے بھاگا ہوا ہے؟ اخبار میں خبر چھپ گئی ہے۔ اب پولیس تیرے پیچھے ہو گی۔''

حافظ نے خلافِ توقع اس کے قاتل ہونے کے انکشاف پر زیادہ گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہ بات اسے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ حافظ نہ صرف افغانستان جا چکا ہے بلکہ پاکستان میں بھی لوگوں پر

حملوں میں ملوث رہا ہے اور انسان کے ہاتھوں انسان کا خون اس کے لیے کوئی انہونی بات نہیں۔

''تو فیر میں کیا کروں؟''

''یہ جگہ بہت نزدیک ہے۔ تجھے کہیں اور جانا ہوگا۔ لیکن ابھی دن نکل آیا ہے۔ جب تک میں نہ کہوں، تو کوٹھڑی میں ہی رہ۔ میں کچھ اور سوچتا ہوں۔'' حافظ نے اسے دلاسا دیا اور پھر دروازے کی کنڈی کھول کر اس کے لیے چائے اور گرما گرم پراٹھے لے آیا۔ اس کے بعد اسے پھر سے لے جا کر کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ پراٹھے کھا کر بالے کو نیند سی آنے لگی تھی۔ حافظ نے اسے ایک تکیہ بھی دیا تھا۔ وہ ایک بڑی سی لکڑی پر تکیہ رکھ کر زمین پر ہی لیٹ گیا اور کچی مٹی کے فرش کی خوشبو سانسوں میں اتارتا گہری نیند سو گیا۔

15

بالے کی آمد کے بعد سے حافظ اس کے بارے میں بہت پریشان تھا۔ اگر وہ گھر سے بھاگ کر آیا ہوا ہوتا تو وہ اسے بہ آسانی بھلوال، سرگودھا یا خوشاب میں اپنے دوستوں کے سپرد کر سکتا تھا، لیکن یہاں معاملہ قتل کا تھا۔ دوپہر میں اس نے بھلوال میں اپنے ایک دوست فتح دین کو فون کیا اور اسے بتایا کہ اس کے پاس ایک لڑکا آیا ہے جو دین کے کام کے لیے گھر سے بھاگ آیا ہے۔ فتح دین نے اس پر خوشی کا اظہار کیا تو حافظ نے اسے بتایا کہ معاملہ اور پیچیدہ ہے، فون پر بتایا نہیں جا سکتا۔ فتح دین نے اسے ایک گھنٹے بعد فون کرنے کا کہا۔ ایک گھنٹے بعد حافظ نے فون کیا تو فتح دین نے اسے بتایا کہ وہ اگر بھلوال سے بالے کو لینے آئے تو اسے آتے اور پھر واپس جاتے ہوئے دریائے جہلم دو مرتبہ پار کرنا پڑے گا اور اس راستے میں پولیس کی چوکیاں بھی بے شمار ہیں، اس لیے حافظ خود دریائے جہلم پار کر کے کسی طرح بالے کو ملک وال کے قریب چک دادن پہنچا دے جہاں سے وہ اسے لے لے گا۔

جب سارا قصبہ سو گیا تو حافظ نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور دونوں قصبے سے نکل کر کھیتوں سے ہوتے ہوئے دریائے جہلم کی طرف چلے۔ حافظ نے اپنی بیوی کو بتا دیا تھا کہ وہ رات کو سرگودھے جا رہا ہے۔ وہ اپنے دینی کام کے سلسلے میں پیر پیادل ہی لمبے لمبے سفر کیا کرتا تھا اس لیے بیوی اس کے رات گھر پر نہ رہنے کی عادی تھی۔ گھر سے پیدل نکل کر وہ کسی دوست کے موٹر سائیکل پر یا کسی اناج بردار

ٹرک سے لفٹ لے کر سفر کیا کرتا تھا۔

رات کو حافظ تہجد پڑھنے کے لیے اٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر بالے کو چپکے سے نکال کر گھر سے باہر کر دیا۔ پھر وہ دوبارہ سے گھر میں داخل ہوا اور سفر کی پوٹلی اٹھا کر باہر نکلا۔ بیوی بھی اس کے ساتھ ہی تھی جس نے اس کے پیچھے گھر کا دروازہ بند کیا۔ بالا اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ حافظ نے اسے ساتھ لیا اور وہ کھیتوں کے راستے قصبے سے باہر نکل گئے۔ ان کا رخ دریا کی طرف تھا۔ دریا کے کنارے آ کر دونوں نے اپنے کپڑے اتار کر دھوتیاں پہن لیں اور کپڑے پوٹلیوں میں رکھ کر پوٹلیاں سروں پر رکھ لیں۔ دریا پار کر کے دونوں اب ضلع منڈی بہاء الدین کی حدود میں تھے۔ انھوں نے دھوتیاں اتار کر خشک کپڑے پہن لیے اور چلتے رہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہ پنڈی الیانی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ دونوں نے گاؤں میں داخل ہونے سے گریز کیا اور گاؤں کے باہر بہنے والی ایک کس کے پانی سے وضو کر کے فجر کی نماز پڑھی۔ پھر وہ ملک وال جانے والی سڑک پر آ گئے اور لاری کا انتظار کرنے لگے۔ اس کام میں خطرہ زیادہ تھا لیکن حافظ نے سوچا ہوا تھا کہ اگر بالے کو کسی نے پہچان لیا تو وہ انجان بن جائے گا اور پولیس کی تفتیش کی صورت میں کہے گا کہ اسے بالے نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ قتل کر کے بھاگا ہوا ہے۔ مزید مسائل کی صورت میں وہ اپنے جیش بدر کے دوستوں سے رجوع کر سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک لاری وہاں سے گزری تو دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ بالا چادر سے اپنا منہ لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ وارا چھمیاں کے مقام پر دو پولیس والے بھی لاری میں بیٹھے، جنھیں دیکھ کر حافظ اور بالے کا خون خشک ہو گیا، لیکن پولیس والوں نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ کھیتوں کے پار مشرق سے سورج کی ابھرنے والی شفق دھرتی کو نارنجی کر رہی تھی اور کھلی ہوئی کھڑکیوں سے تیز ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ لاری کے اندر بیٹھے مسافروں پر نیند سی طاری تھی اور پولیس والوں سمیت ان میں سے کوئی بھی ہوشیار نہیں لگ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ملک وال سے کچھ دور سڑک کے کنارے اتر گئے۔ کچھ دور چک دادن نامی گاؤں نظر آ رہا تھا۔ کسی آدمی نے اپنی سوزوکی پک اپ سڑک کے کنارے سے نیچے اتاری ہوئی تھی اور اس کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ حافظ بالے کو ساتھ لے کر اس پک اپ کی جانب بڑھا اور گاڑی کے نیچے لیٹے آدمی کی ٹانگ کو پاؤں سے ٹھوکا دے کر اسے اٹھا دیا۔ وہ فتح دین تھا۔ حافظ نے بالے اور فتح دین کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا اور پھر پوٹلی سے پراٹھے اور انڈے نکال لیے۔ رات کے پکے ہوئے

انڈے پراٹھے ٹھنڈے ٹھار ہو چکے تھے لیکن تینوں تھکے ہوئے تھے اس لیے انھوں نے بڑے شوق سے ناشتہ کیا۔ فتح دین نے اپنے سفر کے بارے میں انھیں صرف اتنا بتایا کہ منڈی بہاء الدین کی حدود میں خطرہ زیادہ ہے اس لیے وہ ملک وال شہر کے اندر سے نہیں گزرے گا۔ منڈی کی حدود سے نکلنے کے بعد سکون ہو گا کیونکہ دوسرے ضلعوں کی پولیس کے پاس اپنی حدود میں ہونے والے مقدمات ہی بہت ہیں۔ ناشتے کے بعد حافظ نے ان سے اجازت لی جبکہ فتح دین اور بالا پک اپ میں بیٹھ گئے۔ فتح دین بہت دیر تک پک اپ کو اوبڑ کھابڑ راستوں پر چلاتا رہا اور پھر چک سیدہ کے مقام پر پکی سڑک پر ہو لیا جو میانی جا رہی تھی۔

اسی پکی سڑک پر چلتے ہوئے وہ بھیرہ، جھاوریاں اور شاہ پور صدر سے آسانی سے گزر گئے۔ شاہ پور صدر سے انھیں پل پار کر کے خوشاب میں داخل ہونا تھا۔ پل پر پولیس چوکی والوں نے انھیں روک لیا۔ بالے کو خوف سے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا مگر فتح دین چوکی والوں سے بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ وہ گاڑی سے نیچے اتر کر کچھ دیر ان سے بات چیت کرتا رہا، پھر گاڑی میں واپس آیا، کچھ کاغذات نکالے اور چوکی والوں کو دکھائے۔ چوکی والے ایک اہلکار نے بالے کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون ہے۔ فتح دین نے اسے اپنا بھتیجا بتایا۔ ''تم سے تو نہیں ملتا،'' اہلکار نے ہنس کر کہا۔ ''اپنی ماں پر گیا ہے،'' فتح دین نے وضاحت کی۔ چوکی والوں سے خلاصی پا کر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پل پار ہو گیا تو بالے کی جان میں جان آئی۔ اب وہ جہلم اور دریائے سندھ کے دوآبے میں تھے۔ رات ہونے تک وہ میانوالی کے ایک قصبے کندیاں پہنچ گئے۔

16

میران شاہ میں داخل ہوئے بغیر وہ سارا دن پہاڑیوں پر گھومنے کے بعد دتا خیل آئے تھے۔ دتا خیل نام تو ایک تھا لیکن دوسرے دیہاتوں یا قصبوں کی طرح یہاں مکان ایک دوسرے کی کمر سے ملے ہوئے نہیں تھے بلکہ دو تین مکان یہاں تھے اور دو تین وہاں۔ یہ مکان اسی طرح پہاڑی سے نیچے یہاں وہاں ایسے ٹکے ہوئے تھے جیسے بڑے بڑے پتھر ہوں جنھیں لڑھکتے لڑھکتے جہاں کہیں رکنے کی جگہ ملی ہو وہیں ٹک گئے ہوں۔ پھر یہ مکان بھی اس علاقے کے پٹھانوں کے خاص اسٹائل میں تھے۔

دو، تین، چار یا حسبِ منشا بڑے بڑے کمرے اور اس کے آگے بہت بڑا سا صحن۔ انھی میں سے ایک حجرے میں بالے نے رات گزاری۔

صبح سویرے کچھ نوجوان محمد خان سے ملاقات کے لیے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں اور سروں پر صافے باندھے ہوئے تھے۔ چائے پینے کے بعد وہ سب گھر سے باہر نکلے۔ کچھ دور بہت سی کچی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ نوجوانوں میں سے ایک تگڑے جسم والے ہوشیار بدن شخص نے گائیڈ کے فرائض سنبھال لیے۔ یہ جانان محسود تھا۔ اس نے بتایا کہ کچھ روز پہلے یہاں ڈرون حملہ ہوا تھا جس میں یہ سب مجاہد افراد مارے گئے۔ قبروں پر فاتحہ کرتے ہوئے بالے نے اپنے جسم میں ایک نئے عزم کی سنسنی پھیلتی ہوئی محسوس کی۔ جانان نے بتایا کہ ڈرون حملوں میں عام لوگ بھی مارے جاتے ہیں اور ڈمہ ڈولہ میں ایسے ہی حملے کے بعد اس نے بچوں کی قبریں بھی دیکھی تھیں۔

"دا ټول مجاہدین دے،" جانان نے سامنے کی قبروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جہاد فرض دے۔ اَو خو تئے انتقام زمنگا پار اقرض دے۔ واللہ باللہ تاللہ،" وہ بولا۔ بالے کو ان کے درمیان دو ہفتے گزارنے کے بعد تھوڑی بہت پشتو سمجھ میں آنے لگی تھی۔ جانان کا قسم اٹھانے کا یہ انداز "واللہ باللہ تاللہ" اسے بہت بھایا اور اس نے اسے اپنے لیے بھی اپنا لیا۔

"میرا جی چاہتا ہے میں ان ڈرون بھیجنے والوں کو پھاڑ دوں،" وہ جوش سے بولا۔

"موقع ملے گا۔ اللہ پاک موقع دے گا۔ لیکن ہمارے غدار خود امریکہ سے کہتا ہے کہ یہاں ڈرون بھیجو،" جانان تلخی سے بولا۔

"کون بولتا ہے؟"

"مشرف بولتا ہے۔ بے نظیر بولتا ہے۔"

"بے نظیر بہت کمینا ہے۔ ہم اُدھر اپنے گاؤں میں بھی اس کے خلاف ہوتا تھا،" بالے نے ان کے درمیان انھی کے انداز میں مونث کو مذکر کر کے کہا۔

"عورت کا حاکمیت منحوس ہوتا ہے۔ اس کا عقل چوٹا ہوتا ہے۔ ہمارا ہاتھ میں ہو تو اس کو ابھی گولی مار دے۔ بس امیر کا حکم نہیں ہے۔ سنا ہے کچھ دنوں میں وہ کراچی آنے والا ہے۔ وہ ایک بار آ جائے، پر دیکھو اَم اس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔"

قبروں پر حاضری کے بعد وہ مغرب کی جانب چلنا شروع ہو گئے۔ آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد پہاڑ میں ایک غار دکھائی دیا۔ ان میں سے ایک شخص غار میں گیا اور اس کے ساتھ غار میں سے دو آدمی نکل آئے۔ وہ سب غار کے دہانے کے قریب باتیں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک قاری حسین تھا۔

اگلے کچھ روز انھوں نے اسی پہاڑ کے اردگرد قیام کیا۔ رات کو وہ کسی درخت کے نیچے یا کسی بڑے پتھر پر چادر بچھا کر سو جاتے۔ صبح کے وقت ورزش ہوتی تھی اور وہ پہاڑ پر تیزی سے چڑھنے اور پھر اترنے کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس کے بعد چاند ماری ہوتی تھی۔ دور کوئی تختہ لگا لیا جاتا تھا اور اس پر بندوقوں سے نشانہ لگایا جاتا تھا۔ بالے نے بندوق کبھی استعمال نہیں کی تھی لیکن وہ ذرا سی تربیت کے بعد سیکھ گیا اور دوسروں نے جانا کہ اس کا نشانہ بہت پختہ تھا۔ بالے نے انھیں بتایا کہ وہ پتھروں سے نشانہ لگانے کی مشق کافی عرصے سے کرتا چلا آ رہا ہے۔ دو ہفتے میں ہی اسے امتحان میں پاس قرار دے دیا گیا اور اسے مزید دو ہفتے بعد اسے اوراد و وظائف کے لیے غار میں قاری حسین کے ساتھ شب بسری کا موقع ملا۔ لیکن اس سے پہلے اسے اور دوسرے لڑکوں کو استاذ عبدالقدیر کے درس سے گزرنا پڑا تھا۔

17

قرآن تو وہ سب پڑھے ہوئے تھے، اور جو نہیں پڑھے ہوئے تھے انھیں بھی قرآن پڑھانے کا تکلف نہیں کیا گیا تھا۔ بس قرآن کی کچھ آیتیں تھیں جو ان سب کو زبانی یاد کرائی جا رہی تھیں۔ استاذ عبدالقدیر کے آنے سے پہلے ان کا مانیٹر عبدالحکیم انھیں یہ آیتیں اور کچھ حدیثیں رٹا دیتے جو جہاد اور کافروں سے قتال کے بارے میں تھیں۔ بالے کو حیرت ہوئی جب استاذ عبدالقدیر نے پہلے دو تین روز اسے جہاد یا کسی اور چیز پر درس دینے کے بجائے تقدیر پر درس دیا۔ وہ بعد کے مہینوں میں بھی خود کو اس درس اور اس میں بیان کردہ چیدہ چیدہ نکات اپنے ذہن میں دہراتے ہوئے پاتا رہا اور دین کے لیے قربانی دینے کا اس کا عزم اور بھی مستحکم ہوتا رہا۔

"تم میں سے کوئی کسان کا بیٹا ہے، کوئی چرواہے کا، کوئی قصائی کا، کوئی موچی کا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اللہ نے تمھیں بھی کسان، چرواہا، قصائی اور موچی بننے کے لیے پیدا کیا ہے؟

"تم کسی کسان، کسی چرواہے، کسی قصائی، کسی موچی کے گھر پیدا ہوئے ہو۔ لیکن کیا معلوم اللہ

سبحانہٗ تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہ رہا ہو۔ کوئی ایسا کام جسے تم کر کے جنت کے اعلیٰ ترین طبقے میں داخل ہو جاؤ۔ اگر تم نے یہ موقع حاصل نہ کیا تو کیا تم ایک کسان، ایک چرواہے، ایک قصائی، ایک موچی کی حیثیت سے ساری زندگی گزارنے پر مطمئن ہو جاؤ گے؟ کیا بعد کی زندگی میں تم خود سے سوال نہیں کرو گے کہ اللہ سبحانہٗ نے تم کو اعلائے علیین میں داخل ہونے کا اتنا سنہرا موقع دیا اور پھر بھی تم غافل رہے؟

''کیا انسان اپنی تقدیر بدلنے پر قادر ہے؟ کیا پاکستان کے نظام میں ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی کسان کا بیٹا گھاس نہ کاٹے، کسی چرواہے کا بیٹا بھیڑ بکریاں نہ چرائے، کسی قصائی کا بیٹا جانور ذبح نہ کرے اور کسی موچی کا بیٹا لوگوں کے جوتے نہ گانٹھے؟''

بالے کے ذہن میں اپنے گاؤں کی کچھ مثالیں آ رہی تھیں جنھوں نے تعلیم حاصل کر کے اپنے آباواجداد کے پیشے سے پیچھا چھڑا لیا تھا، لیکن جب اس نے باقی تمام لڑکوں کو اونچی آواز میں ''نہیں!'' کہتے سنا تو ان کی آواز میں آواز ملا دی۔

''کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ تم مشرپ کا، بے نظیر کا تختہ الٹ سکتے ہو؟

''سب ممکن ہے۔ سب ممکن ہے۔ لیکن اس میں ایک رکاوٹ ہے۔ تمھارا ارادہ۔''

''ہمارا ارادہ؟ وہ کیسے؟'' ان میں سے کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے تھے۔

''یہ تمھارا ارادہ ہی ہے جو تمھیں اپنے بس میں کر لیتا ہے اور تم الصلوٰۃ خیر من النوم کی صدا سننے کے باوجود اپنے بستر میں دبکے پڑے رہتے ہو۔ یہ تمھارا ارادہ ہی ہے جو کشمیر، فلسطین، افغانستان اور پاکستان میں مجاہدین پر ظلم کی داستانیں سننے کے باوجود تم سے کہتا ہے کہ جہاد کے لیے دوسرے لوگ کافی ہیں، ہم کیوں جائیں؟ یہ تمھارا ارادہ ہی ہے جو تمھیں اللہ کی راہ میں قربانی سے روکتا ہے۔''

''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' بالے نے ایک بار پھر جسارت کی تھی۔

''اپنا ارادہ اپنے میں سے کسی مضبوط شخص کی تحویل میں دے دو۔ ایسے شخص کی تحویل میں دے دو جس کے بارے میں تمھیں سو فی صد یقین ہو کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے، وہ اسلام سے بے وفائی نہیں کرے گا۔ اپنا ارادہ اس کے حوالے کر دو۔ اسے کہو کہ میرے حوالے سے جو فیصلہ وہ کرنا چاہے کر لے۔ پھر اس فیصلے کو بلا چون وچرا قبول کر لو۔ اپنے اردگرد نظریں دوڑاؤ۔ کون ہے جس کا کردار اتنا عظیم ہے کہ تم سب اپنے ارادے اس کی تحویل میں دے سکو؟ اس زمین پر خدا کا نائب کون ہے؟ خدا کا خلیفہ

کون ہے؟ امیرالمومنین کون ہے؟''

''حضرت ملا محمد عمر۔'' تقریباً سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

''درست! بالکل درست۔ لیکن ہم سب حضرت مولانا سے ملاقات نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں اپنا ارادہ ان کے عظیم سپہ سالاروں کی تحویل میں دینا ہوگا۔ یہاں اس کیمپ میں اسلام کے عظیم سپہ سالار قاری حسین موجود ہیں۔ آج عہد کرو کہ تم اپنے اپنے ارادے ان کی تحویل میں دے دو گے۔

''اور آخر میں مَیں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم سب کا مالک کون ہے؟''

''اللہ تعالیٰ!'' کچھ نے بڑبڑاتے ہوئے اور کچھ نے بہ آوازِ بلند کہا۔

''سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ومن الناس من یشریٰ نفسہ ابتغاء مرضات اللہ۔ واللہ رؤف بالعباد۔ تم میں سے کون ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لیے خود کو بیچ دے۔ اور اللہ اپنے بندوں کے لیے بہت رحم کرنے والا ہے۔ خود کو پورے کا پورا بیچ دو۔ یہ سارا جسم، یہ چہرہ، بازو، سینہ، پیٹ، ٹانگیں، ہاتھ پیر، آنکھیں، دل دماغ، روح سب بیچ دو۔ سب بیچ دو اللہ کی خوشنودی کے لیے۔ بتاؤ اللہ سے بہتر بھی کوئی گاہک تمھیں مل سکتا ہے؟ بتاؤ اللہ سے بہتر کوئی خریدار تمھیں مل سکتا ہے؟ ارے، اللہ خود تمھیں خریدنے کی بات کر رہا ہے۔ تو کیا تمھیں اس سے بڑا کوئی خریدار مل سکتا ہے؟''

لڑکوں نے نفی میں سر ہلائے۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ تمھیں یہ آنکھیں، یہ ناک کان، یہ سینہ، یہ پیٹ، یہ جسم، یہ دل، یہ روح، کتنے میں ملے تھے؟''

لڑکے خاموش رہے۔

''سب مفت ملے تھے ناں؟ یا کوئی پیسہ ویسہ دیا تھا تم نے اس کے لیے؟ سب فری میں ملے تھے تمھیں۔ اور اب اللہ تمھارا خریدار بننا چاہتا ہے۔ کوئی فیکٹری والا، کوئی این جی او والا تمھیں دو لاکھ میں خریدے گا، پانچ لاکھ میں خریدے گا، دس لاکھ میں خریدے گا۔ مگر ان میں سے کوئی تمھیں اللہ سے زیادہ قیمت دے سکتا ہے؟''

لڑکوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم کو اپنا یہ جسم، یہ روح یہ دل مفت میں ملا اور اللہ اس پر سب سے زیادہ منافع دینے والا

ہے۔ تو پھر خود کو کس کے پاس بیچو گے؟"

"اللہ کے پاس!" دو تین لڑکوں کی آواز آئی۔

"اچھا۔ اب ایک بات سنو۔ جو کسی چیز کا مالک ہوتا ہے وہ اس چیز کے لیے تدبیر بھی خود ہی کر لیتا ہے۔ اپنے لیے تدبیر بھی اپنے مالک کو ہی کر لینے دو۔ اللہ کی تدبیر کیا ہے؟ وہی شریعت ہے۔ اللہ کی تدبیر وہ راستہ ہے جو اس نے تمھارے لیے پسند کر لیا ہے۔ تو بس اپنی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں دے دو۔ ابھی تم پوچھو گے کہ اپنی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں کیسے دے دیوے۔ وہ ایسے کہ اس دنیا میں ایسا شخص تلاش کرے جس کی مرضی اللہ کی مرضی کے ساتھ ایسے ہو (یہاں مولوی صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کے ساتھ پھنسا دی)۔ تم کو لگتا ہے کہ یہ مشرپ، یہ بےنظیر، یہ نواش شریپ کی مرضی اللہ کی مرضی کے ساتھ ایسے ہے؟"

"نہیں ہے۔ نہیں ہے۔"

"تو پھر کس کی مرضی اللہ کی مرضی کے ساتھ ایسے ہے؟"

"امیر المومنین کی۔ ملا محمد عمر کی،" مختلف آوازیں آئیں۔

"تو اللہ کی مرضی جس امیر المومنین کی مرضی کے ساتھ ایسے ہو جاتا ہے اس کے بارے میں قرآن میں اللہ فرماتا ہے: ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیہم۔ اس کا مطلب جانتے ہو؟

"اس کا مطلب ہے کہ جو لوگ تمھارے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، وہ اللہ ہی کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اور اللہ کا ہاتھ ان سب کے بھی ہاتھوں پر ہے۔"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ!"

"تو پھر کون ہے جو اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہے؟ کون ہے جو اپنی تدبیر اللہ کی تدبیر کو سونپنا چاہتا ہے؟"

بالے نے باقی طالبعلموں کی دیکھا دیکھی اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لیے، مگر مولوی صاحب نے انھیں جھڑک دیا:

"نہیں۔ نہیں۔ ایسے نہیں۔ اپنی تدبیر اللہ کی تدبیر کو سونپ دینے کا مطلب اتنا آسان نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تمھیں اللہ کے حکم کی سختی سختی نہ لگے۔ تمھارے ذہن کی کھڑکی اتنی کھل جائے کہ

تمھیں اللہ کی تدبیر ہی اپنی تدبیر لگنے لگے۔ جب تم سوچو کہ تمھیں جو سخت حکم دیا گیا ہے وہ اللہ کی تدبیر ہے اس لیے تمھاری سختی کا بوجھ بھی وہی اٹھائے گا۔ اس کے بعد تمھیں کوئی بھی سختی سختی محسوس نہیں ہوگی۔ اور جب تمھیں پتا چلے گا کہ کسی حکم کی سختی کے بدلے میں تمھیں کون کون سے انعامات ملنے والے ہیں تو وہ سختی بھی تمھیں اتنی نرم محسوس ہوگی کہ دنیا کے نرم ملائم ترین گدے اور فوم سے زیادہ۔ اور تمھیں اپنی تدبیر اللہ کی تدبیر کو سونپ دینے میں ایسا لطف آنے لگے گا جو دنیا کی کسی چیز میں نہیں آیا ہوگا۔"

ایک لڑکے نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور سب نے جوش و خروش کے ساتھ اس کا جواب دیا۔

"تو تم میں سے کون کون تیار ہے اپنی تدبیر اپنے اللہ اور امیر المومنین کے حوالے کرنے کے لیے؟" سب نے اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ قاری حسین نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ سب سے پہلے ایک آزمودہ شاگرد آگے بڑھا اور سورۂ حمد کی تلاوت کے بعد قاری حسین کے ہاتھ چوم لیے۔ پھر بالے سمیت باقی لڑکوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اب وہ سب اپنے ارادے، اپنی تقدیر، اپنی تدبیر اپنے امیر کو سونپ چکے تھے۔

18

"...نے بم اور میزائل کو چھپانے کے لیے انسانی جسم کے اندر ایک سرنگ دریافت کی ہے۔ اس سرنگ کو بم اور میزائل کے لیے راکٹ لانچر کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ سرنگ جس قدر نرم اور رکاوٹوں سے تہی ہوگی اتنی ہی موثر ثابت ہوگی۔ جسم جتنا نوعمر ہوگا اس کی سرنگ اتنی ہی رکاوٹوں سے پاک ہوگی۔ سرنگوں کی تلاش میں تیرہ سے بیس برس کے جسم تلاش کیے جاتے ہیں اور ان کی سرنگوں کا جائزہ لینے اور انھیں رکاوٹوں سے مزید پاک کرنے کے لیے ان میں مختلف لمبائی اور چوڑائی کی سلاخیں ڈالی جاتی ہیں۔ آخرکار اس سرنگ میں میزائل ڈالا جاتا ہے اور سرنگ کا منھ چوم کر اسے بند کر دیا جاتا ہے۔"

19

میں سوچتا ہوں کہ بڑے اور ذہین مجرموں میں بھی ایک کہانی کار چھپا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے

جرم کا پلاٹ ایک ذہین کہانی کار کی طرح تیار کرتے ہیں۔ جیسے قاری کہانی کار کو فالو کرتا ہے اسی طرح مجرم کے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں وہ کھوجی بھی ضرور ہوتے ہیں جو اس کے جرم کی کھوج لگانے کی کوشش کریں گے۔ جو مجرم اپنی کہانی میں کوئی لوپ ہول، کوئی خامی چھوڑ دیتے ہیں انھیں کوئی نہ کوئی کھوجی جا لیتا ہے۔ لیکن ذہین مجرم اپنے کھوجیوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایسے نشانات بھی چھوڑ جاتے ہیں جو کھوجیوں کو مجرم کا کھرا اپنانے کے بجائے کہیں اور لے جائیں۔

بڑے مجرموں میں کہانیوں کے مختلف سرے آپس میں ملانے کی بھی خوب صلاحیت ہوتی ہے۔ مثلاً ایسے مجرم کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جس نے اپنے کسی دشمن کو نقصان پہنچانے کے لیے بڑے عرصے سے سوچ رکھا ہے لیکن اس پر عملدرآمد نہیں کر پا رہا؟ ایک روز اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس دشمن کو کسی اور شخص نے دھمکی وغیرہ دی ہے یا اُس سے اس کی لڑائی ہوئی ہے، تو یہ جاننے کے بعد وہ اپنے ملتوی کردہ منصوبے پر عملدرآمد کر لیتا ہے۔ کھوجی جرم کے تازہ نشان سے اُس شخص تک پہنچ جاتے ہیں جس نے اسے تازہ دھمکی دی تھی۔ یوں وہ کہانی شروع ہو جاتی ہے جس کا مقتول کی کہانی سے سرا اصل مجرم نے جوڑا تھا۔

قاری حسین ایسا ہی ایک کہانی کار تھا۔

کبھی پشاور کے قصہ خوانی بازار میں خریداری کے لیے آئے اور اپنی پوٹلیوں میں قسم قسم کی کہانیاں سجائے لوگوں کی کہانی میں وزیرستان کے کسی غریب محسود قبائلی کا قصہ گھول دیتا، کبھی لاہور، راولپنڈی اور کراچی میں، بقول اُس کے، عیش کرتے خواتین و حضرات کے لہو میں ڈیرہ غازی خان کے کسی غریب، لاوارث نوجوان کے خون کی آمیزش کر دیتا۔ بالے کی زبانی یہ سننے کے بعد، کہ اسے سب سے زیادہ نفرت بے نظیر سے ہے، اس نے اس کی یورپ، امریکہ اور دبئی میں گھومتی ہوئی زندگی، اس کے سوئس اثاثوں، اس کے سرے محلات، اس کے بڑے بڑے فارم ہاؤسز، اس کے بلاول ہاؤس، اس کے پی ایم ہاؤس میں چلتی پھرتی زندگی کا آخری باب اس بالے سے لکھوانے کا فیصلہ کیا جو بے خانماں تھا، جو اگلے وقت کی روٹی کے لیے اس کا محتاج تھا اور جو ایک جرم کے طفیل انسانوں کی برادری سے ہمیشہ کے لیے نکال باہر کر دیا گیا تھا؛ اس بالے سے جو اگر اس سے ملاقات کے لیے آ جاتا تو تین گھنٹے باہر انتظار کرانے کے بعد اسے اس کی مسکراہٹ سے مستفید کر کے گیٹ سے باہر کر دیا جاتا۔ قاری حسین نے فیصلہ کیا تھا کہ بے نظیر کے خون میں بالے کا خون گھلا ملا دیا جائے۔

قاری حسین ایسا ہی ایک کہانی کار تھا۔

20

بالا وزیرستان میں تھا جب ایک رات اس نے ایک حیرت انگیز خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اس نے ہاتھ میں ایک کتاب پکڑی ہوئی ہے جسے اس نے بھینچ کر سینے سے لگایا ہوا ہے۔ اس نے اپنے جسم کے بالائی حصے پر قمیض پہنی ہوئی ہے لیکن وہ نیچے سے ننگا ہے۔ بالکل جیسے وہ اپنے بچپن میں گھوما کرتا تھا۔ بالے کو احساس ہوتا ہے کہ اس کے جسم میں جو میزائل داخل کیا گیا ہے وہ اس کے جسم کے اگلے حصے سے باہر نکلنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا ہے لیکن اس کی آلت کے گوشت میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ گوشت کے اندر سے باہر کو اُمڈ آنے کے لیے اس کا دباؤ اتنا شدید ہے کہ آلت کی رگیں پھولی جاتی ہیں۔ بالے کو ایسا شدید درد محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میزائل ابھی اس کے جسم کے اگلے حصے سے باہر نکلے گا اور پھٹ کر ارد گرد بکھر جائے گا۔ لیکن ذمہ داری کے ایک عجیب احساس کے سبب بالا اپنے اعصاب کی تمام تر قوت کے ساتھ اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ میزائل اس کے جسم سے تب تک نہ نکلے جب تک وہ اس کے اخراج کی کوئی مناسب جگہ نہیں دیکھ لیتا۔ درد کی شدت سے وہ کتاب کو اپنے سینے سے اور بھی زور کے ساتھ بھینچ لیتا ہے۔ لیکن اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش اس نے کتاب ہاتھوں میں نہ پکڑ رکھی ہوتی تو وہ میزائل کو قابو کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو بھی استعمال میں لا سکتا تھا۔ اتنے میں تیز ہوا چلنے لگتی ہے اور اس کی قمیض ہوا میں اڑنے لگتی ہے۔ ارد گرد لوگ اس کا ننگ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں اور پھر اِدھر اُدھر کھسکنے لگتے ہیں۔ بالا ان کے پیچھے بھاگتا ہے۔ بے دھیانی میں اس کے ہاتھ اپنے جسم کے زیریں حصے کی جانب بڑھتے ہیں اور کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے میزائل کو تھامتا ہے اور اسے سہلاتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اسے ایک رخ عطا کر دیتا ہے۔ میزائل کے ایک شدت کے ساتھ اس کے گوشت سے باہر نکلنے کے درد سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

21

کراچی میں بالے کو سلطان آباد کے ایک مکان میں ٹھہرایا گیا۔ یہ مکان کمانڈر بلال نے کچھ

روز پہلے ہی کرائے پر لیا تھا۔ کچھ روز بعد پیپلز پارٹی کی تین رنگوں والی ٹوپیاں بھی آ گئیں اور وہاں موجود چار پانچ لڑکے باری باری ان ٹوپیوں کو سر پر سجانے اور خود کو آئینے میں دیکھنے لگے۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ لڑکے عشا کی نماز سے پہلے غسل کر چکے تھے لیکن بلال نے انھیں قاری صیب کا بیان سننے سے پہلے تازہ وضو کرنے کی بھی ہدایت کی۔ وہ وضو کر کے اور سروں پر سفید جالی دار ٹوپیاں پہن کر آئے تو قاری صیب کے آنے کا وقت ہو رہا تھا، اس لیے بلال نے انھیں بیٹھک میں بٹھا دیا جہاں فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ آج انھوں نے بتانا تھا کہ اپنی مرضی کو اپنے استاذ کی مرضی میں ضم کرنے کے بعد جو شخص جنت میں پہنچتا ہے تو اسے وہاں کیا ملتا ہے۔ کمرے میں زیرو کے بلب کی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اگر بتیوں اور لوبان کی مہک مشامِ جاں کو معطر کر رہی تھی۔ قاری صیب ایک کونے میں گدے سے کمر ٹکائے آنکھیں موندے تسبیح پڑھنے میں مشغول تھے۔ بلال نے اندر داخل ہوتے ہی لڑکوں کو شش شش کر کے خاموش رہنے کی ہدایت کی اس لیے وہ قاری صیب کو سلام بھی نہ کر سکے۔ وہ نہایت احتیاط سے چاندنی پر بیٹھ گئے اور انھیں ایسا محسوس ہوا کہ قاری صیب کا بیان شروع ہونے سے پہلے ہی ان کے اندر کوئی نور سا اترنا شروع ہو گیا ہے۔

22

"... زوجۃ حَسن و جمیلہ... جنت کی حسین لڑکیاں۔ مشک، عنبر، زعفران، کافور سے بنی۔ ان کے چہرے کا نور اللہ کے نور میں سے ہے۔ آبِ حیات سے ان کا جسم بنایا گیا۔ اللہ کا نور ان پر سجایا گیا۔ اور ستر جوڑے بھی وہ پہنے ہوئے ہوں تو ان کا جسم شیشے کی طرح ان میں نظر آتا ہے۔ وہ سورج کو انگلی دکھائے، سورج بے نور ہو جائے۔ اور جب وہ مسکراتی ہے تو اس کے دانتوں کے نور سے ساری جنت جگمگا جاتی ہے۔ جب وہ اپنے خاوند کی طرف قدم اٹھاتی ہے تو ایک لاکھ قسم کے ناز و انداز اپنے خاوند کو دکھاتی ہے۔ جس کی عام چال یہ ہے، اس کی ناز والی چال کیسی ہوگی؟ اور وہ اندھیروں میں اپنی کلائی عریاں کرے تو سارے اندھیرے روشن ہو جائیں۔ اور وہ اپنا دوپٹہ ایسے ہوا میں لہرا دے تو ساری کائنات روشن بھی ہو جائے اور خوشبو سے معطر بھی ہو جائے۔ اس کے سر کے بال سر کی چوٹی سے پاؤں کی ایڑی تک چلتے ہیں۔ اور ایک ایک بال میں نور بھرا، خوشبو بھری۔ اور وہ تین میل کی چوڑائی کا غرارہ

پہنے ہوئے ہوگی، جو تین میل کے دائرے میں گھوم رہا ہوگا۔ اگر موت مر نہ گئی ہوتی تو جنتی جنت کی اس لڑکی کو دیکھ کر مر جاتے، ان کے کلیجے پھٹ جاتے۔ ہاں، اس زمین کی نیک عورتیں جنت کی حور سے بھی ستر ہزار گنا زیادہ خوبصورت ہوں گی۔ وحُلَلٌ کثیرا۔ بڑے عالیشان جوڑے۔ سو سو جوڑے جنتی پہنیں گے۔ نہ اتارنے کی ضرورت پڑے گی نہ پہننے کی۔ طاق کا منھ کھلا۔ اس میں سو جوڑے آئے۔ پچھلے چلے گئے۔ اتارنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ غائب ہو گئے، بس۔ کیونکہ جنت میں دھوبی بھی کوئی نہیں رہتا۔ جنت میں واشنگ مشین بھی کوئی نہیں۔ اور جنت میں لانڈری بھی کوئی نہیں۔ کوئی صابن کوئی نہیں۔ کوئی سرف کوئی نہیں۔ نہ کوئی گائے سوپ نہ کوئی صوفی سوپ۔ تو اب ان جوڑوں کو کیا کریں؟ غریب بھی کوئی نہیں۔ فقیر بھی کوئی نہیں۔ تو اب یہ جوڑے کس کو دیں؟ تو میرے اللہ کا نظام ہوگا۔ سو جوڑے آئیں گے اور پچھلے سو جوڑے اپنے آپ غائب ہو جائیں گے۔ ادنیٰ درجے کا جو جنتی ہوگا اسے اسی ہزار نوکر، بہتر بیویاں، سو عالیشان محل عطا کیے جائیں گے۔ فاکہۃ سدرہ۔ سدرہ کا ایک مطلب ہے موسیقی۔ ہر وقت موسیقی سنتے پھرو۔ کبھی اللہ سنائے۔ کبھی جنت کی حوریں سنائیں۔ کبھی داؤد علیہ السلام سنائیں۔ اللہ کہے گا، وہ لوگ سامنے آ جائیں جو دنیا میں گانے نہیں سنتے تھے۔ باقی سب چلے جائیں۔ تم میں سے جو دنیا میں رنڈی کے گانے سے راضی ہو گئے وہ جنت کے گانے سے محروم ہو گئے۔ ہوا چلے گی۔ ساری جنت کی ہوا کو موسیقی بنا دے گی۔ ہوا موسیقار، ساری جنت ساز، اور ساری جنت کی لڑکیاں آواز۔ اور ایک آدمی بس یوں کر کے اسے دیکھتا رہے گا اور ستر سال وہ لڑکی گانا گاتی رہے گی، وہ اس کے گانے سے بور نہیں ہوگا۔ ستر سال۔ ستر سال وہ اس گانے سے بور نہیں ہوگا۔ بس جذب ہو جائے گا اس کی آواز میں۔ یہ اللہ تعالیٰ دے گا، صرف موسیقی کو چھوڑنے کا صلہ۔ یہ تو صرف ادنیٰ درجے کے جنتیوں کو ملے گا۔ اور تمھیں کیا ملے گا؟ یہ تو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تمھارے چھوٹے چھوٹے دماغوں میں اتنی سکت، اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ تم سوچ سکو کہ جنت میں تمھیں جو حوریں ملنے والی ہیں وہ کتنی خوبصورت ہوں گی۔

"ذرا سا میں بتا دوں کہ اس کا حسن کیسا ہوگا؟ سن سکو گے؟ اشتیاق ہے تمھیں سننے کا؟ ارے تم نے دنیا میں کوئی عورت اتنی حسین دیکھی ہی کہاں ہے کہ اس کی مثال دے سکوں۔ سنو گے مجھ سے جنت کی لڑکیوں کی خوبصورتی کا بیان؟ آؤ تمھیں میں سناتا ہوں..."

23

بالا کراچی کی زینب مارکیٹ میں گھوم رہا تھا۔ استاذ نے ان سب کو پہننے کے لیے پینٹ شرٹ دی تھی تاکہ وہ ان میں خود کو آسودہ محسوس کر سکیں۔ وہ سرزمین خان کے ساتھ نکلے تھے جسے گھر سے نکلے چار سال ہو گئے تھے اور وہ بڑا پختہ کار جہادی تھا۔ زینب مارکیٹ میں عورتوں کو دیکھ کر بالے کو مولوی صیب کی تقریر یاد آ رہی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں گناہ کے احساس سے عاری مارکیٹ میں گھوم رہی تھیں۔ کم ہی ایسی تھیں جنھوں نے چادر اپنے سینے پر اچھے طریقے سے لے رکھی ہو۔ کسی نے دوپٹہ گلے میں اڑسا ہوا تھا اور کسی نے ذرا سا کھول کر سینے پر پھیلایا ہوا تھا۔ وہ ان کے سینوں کی اٹھانیں دیکھتا تو جسم میں لرزش کے احساس کے ساتھ وہ غصے سے بھی بھر جاتا۔ ان سب کو احساس نہیں تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی مرتکب ہو رہی تھیں۔ ان کے ترشے ہوئے بال، ان کی مہین قمیضیں، ان قمیضوں کے ہوا سے اڑتے ہوئے دامن، جو اڑتے تو شلواروں کے اندر ان کے کولھوں کی فراخی کا نظارہ کرا دیتے، اس کے غصے میں اضافہ کرتے رہے۔ لیکن اس غصے میں اسے لطف بھی آیا۔ ''سب رنڈیاں ہیں یہ!'' اس نے اپنی ٹھوڑی پر اگے ہوئے بالوں کے گچھے کو کھجاتے ہوئے خود سے کہا۔ ''انھیں دین کا یا اللہ کے احکامات کا کوئی خیال نہیں۔ اپنے باپوں کا اور شوہروں کا پیسہ ان کپڑوں کو خریدنے میں خرچ کر رہی ہیں جن کے پہننے سے ان کی زینتیں عریاں ہو جائیں گی۔ لیکن قیامت قریب ہے اور اللہ ان سب سے جلد حساب لینے والا ہے۔ اگر انھیں اسی وقت قبر میں پہنچا دیا جائے تو ان کا عذاب فی الفور شروع ہو جائے۔ انھیں پتا ہی نہیں کہ اگر میں یہاں کوئی دھماکا کر دوں تو وہ اپنے عذابِ قبر سے صرف پندرہ سولہ گھنٹے دور ہیں۔ مگر یہاں کیسی مگن ہیں۔'' اسے اپنی پینٹ بھی عجیب لگی۔ اس کی تشریف اس میں اکڑی ہوئی تھی اور وہ اس میں سہولت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں سرزمین خان انھیں ایک طرف لے گیا اور انھوں نے ایک ریڑھی سے مالٹے کا جوس پیا اور گھر آ گئے۔

24

سترہ اور اٹھارہ اکتوبر کی درمیانی رات بالے کو تیسرا دھماکا کرنا تھا۔ اس کے سینے پر بم باندھ دیا

گیا تھا اور استاذ نے ان تینوں کا ماتھا چوم کر انھیں رخصت کیا تھا۔ چوتھا دھماکا کرنے کے لیے نیامت خان کو بھی تیار کیا گیا تھا لیکن عین وقت پر اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ استاذ نے اسے پہلے لاڈ پیار، پھر غصے اور پھر اسلام کا واسطہ دے کر بہت کہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ اب پہلا دھماکا سرزمین خان، دوسرا آفتاب اور تیسرا اس نے کرنا تھا۔ پہلے دھماکے کی آواز کے ساتھ بالا لرز گیا۔ لیکن اس کے ساتھ موجود استاذ نے اسے حوصلہ دیا۔ استاذ نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بے نظیر کے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ بالے کے دل میں جوش و خروش کی ایک لہر بیدار ہو گئی۔ استاذ رخصت ہوا تو وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ٹرک کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی تک دوسرا دھماکا نہیں ہوا تھا۔ اسے آفتاب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید آفتاب ڈر گیا اور اس نے دھماکا کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ یہ سوچ کر وہ خود ٹرک کی جانب بڑھنے لگا۔ 'جاںنثارانِ بے نظیر' کے بیج لگائے بہت سے کالے اور نیم کالے لڑکے ٹرک کے اردگرد اکٹھے تھے۔ بالا ان کی جانب بڑھ رہا تھا کہ دوسرا دھماکا ہو گیا۔ ایک شخص زور سے آ کر اس سے ٹکرایا اور بالے کا کمزور وجود اچھل کر دور جا گرا۔ وہ صادق بھائی تھے جو اس سے ٹکراتے ہوئے اپنی تشریف کے بل زمین پر گرے تھے۔ بالا ان سے چھ سات قدم دور گرا۔ اس کا سر زمین پر زور سے پٹخا تھا اس لیے کچھ لمحوں تک تو اسے بالکل ہوش نہیں رہا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ اس نے یہ بھی سمجھا کہ شاید بم اسے بھی لگ گیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں بم کی تار تلاش کرنا چاہی تو وہ اس کی آستین میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے سینے کے بل لیٹ گیا تاکہ کسی کو اس کے بم کا پتا نہ چل سکے۔ جب لڑکے اسے اٹھانے کے لیے اس کے قریب آئے تو اس نے آنکھیں بند کیں اور اپنے ہاتھ میں موجود بٹن دبا دیا۔ اگلے لمحے اسے خوشگوار حیرت ہوئی جب کچھ نہیں ہوا۔ اس کے بم کا سرکٹ ٹوٹ چکا تھا۔ لڑکے اس کی کمر کو ٹٹولنے لگے تو بالے نے کہا کہ میں خیریت سے ہوں، تم لوگوں کو دوسرے زخمیوں کو اٹھانا چاہیے۔ اس کے بعد وہ ہمت کر کے اٹھا اور پیدل چلتا ہوا سڑک سے نیچے اتر گیا۔ نیچے اندھیرا تھا اور کوئی اسے دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ ایک جھاڑی کے قریب گیا اور چاہتا تھا کہ اپنی قمیض کے نیچے سے بم نکال کر پھینک دے کہ اس کی گردن پر ایک زبردست ہاتھ پڑا۔ وہ ہڑبڑا گیا کہ یہ کوئی پولیس والا ہی ہوگا۔ مگر یہ استاذ تھا جو اسے دیکھ رہا تھا۔

''استاذ، سرکٹ ٹوٹ گیا تھا،'' بالے نے کہا۔

استاذ نے اس کو بازو سے پکڑا اور اپنے پیچھے چلاتا ہوا ایک ایمبولینس کی طرف لے گیا۔ اسے ایمبولینس میں بٹھایا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ راستے میں پولیس نے انھیں کچھ نہیں کہا۔ ایک جگہ پر استاذ نے ایمبولینس کے ڈرائیور سے کہا کہ اس کا بھائی ٹھیک ہے، وہ اسپتال نہیں جانا چاہتے، انھیں وہیں اتار دیا جائے۔ وہ جگہ جناح اسپتال کے قریب تھی۔ وہاں سے کینٹ کی ریل کی پٹریوں کو پار کرتے ہوئے ایک درمیانی راستے سے پیدل سلطان آباد پہنچ گئے۔ بم کے ساتھ پیدل چلنا ایک مشکل فیصلہ تھا مگر استاذ کے پاس ریوالور موجود تھا اور اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر پولیس سے سامنا ہوا تو وہ پہلے بالے کو اور پھر کوئی راستہ نہ پا کر خود کو بھی گولی مار لے گا۔

کچھ روز بعد بالے نے اخبار دیکھا تو اس میں دھماکے کی منصوبہ بندی کرنے والے تمام افراد کی فہرست موجود تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ دھماکے کس کس نے کیے۔ بالے اور نیامت خان کا نام مطلوب افراد کے ناموں میں درج تھا۔ بالے کو پہلے وہی خوف محسوس ہوا جو اس نے حافظ شاہین کے گھر اخبار میں اپنا نام پڑھنے کے بعد محسوس کیا، ساتھ ہی اسے لگا کہ اب وہ کوئی اہم آدمی بھی بن گیا ہے کیونکہ اخبار میں اس کا وہی نام درج تھا جو طالبان نے رکھا تھا۔ اچھا اور بڑا نام: اقبال اللہ عسکری۔

چند روز بعد اسے معلوم ہوا کہ نیامت خان اور دو تین اور لڑکے پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ کسی نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ غدار تھے اس لیے خود طالبان میں سے ہی کسی نے ان کی مخبری کی تھی اور پولیس نے انھیں مار کر انعامات حاصل کر لیے تھے۔

کچھ روز بعد ایک مال بردار ٹرک کا کلینر بنا کر بالے کو راولپنڈی بھجوا دیا گیا۔

25

کارساز پر دھماکا نہ کر سکنے کے بعد بالے کو زندگی کچھ اچھی لگنے لگی تھی۔ ٹرک والے کے ساتھ سفر کرتے ہوئے جب وہ سندھ سے پنجاب میں داخل ہوئے تو اسے ہریالی بہت اچھی لگی۔ ٹرک والا اسے اپنے قصے سناتا رہا۔ وہ مردان میں رہتا تھا اور ایک زمانے میں جہاد کے لیے افغانستان بھی جا چکا تھا۔ راستے میں وہ بہاولپور میں ایک شخص کے گھر پر رکے تھے۔ وہ ٹرک والے کا دوست تھا۔ اس کی بارہ سال کی لڑکی انھیں روٹی دینے آئی تو بالے نے اسے دیکھا۔ اس نے سر پر چادر لے رکھی تھی اور سادہ سے

کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی دینے آئی تو بالے نے پھر اسے دیکھا۔ پھر وہ چلی گئی۔ کھانا کھا چکنے کے بعد بالے کا جی چاہا کہ وہ اسے پھر سے دیکھے۔ اس نے اپنے میزبان سے پانی کا تقاضا کیا۔ میزبان جو ٹرک والے سے باتوں میں مشغول تھا، اس نے آواز لگائی: "شائستہ! ذرا ایک گلاس پانی لے آنا۔" شائستہ پھر سے آئی تو اس کے باپ نے بالے کی طرف اشارہ کیا۔ بالے نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ جب وہ چلی گئی تو بالا اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اچھا نام ہے اس کا۔ شائستہ۔ شا۔ ایس۔ تا۔ تا تا تا۔ اچھا نام ہے۔ اچھی لڑکی ہے۔ سر پر چادر کرتی ہے۔ نماز بھی پڑھتی ہوگی۔ گھر کے کام کاج کرتی ہے۔ ابھی چھوٹی ہے مگر تین چار سال میں بڑی ہو جائے گی۔ اتنے میں میں مشہور کمانڈر بن چکا ہوں گا۔ حافظ شاہین کی اچھی سلام دعا ہے اس سارے حلقے میں۔ میں اس سے کہہ کر یہاں رشتہ بھجواؤں گا۔ ہم شادی کر لیں گے۔ مگر نہیں۔ مجھے تو کفر یہ نظام ختم کرنے کے لیے جہاد کرنا ہے۔ میرے بہت سارے بچے ہوں گے اور ان کو بھی میں جہادی بناؤں گا۔ جہاد کرتے ہوئے مجھے یہ اطمینان ہوگا کہ گھر میں میری ایک بیوی موجود ہے جو مجھے یاد کرتی ہے اور میری کامیابی کی دعا کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے کمانڈو مشن پر بھیجا جائے جہاں میں جا کر اپنی صلاحیتیں دکھاؤں۔ پھر اس کے ذہن میں متحرک تصویریں چلنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ اس نے ایک فوجی کیمپ پر حملہ کر دیا ہے اور ارد گرد گھومتے فوجیوں کو اپنی بندوق سے تاک تاک کر نشانہ بنا رہا ہے۔ کوئی فوجی اس کی طرف فائر کرتا ہے تو وہ لڑھکنی لگا کر دوسری طرف ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ زمین پر لیٹ کر فائر کرتا ہے، کبھی کسی دیوار کی اوٹ سے اور کبھی پھلانگ کر کسی چھت پر چڑھ جاتا ہے اور وہاں سے فائرنگ کرتا ہے۔ پھر اس کی شلوار سے بندھی بیلٹ میں وائرلیس کی بیپ بجتی ہے۔ وہ ہیلو کرتا ہے تو کمانڈر اسے کہتا ہے کہ مشن مکمل ہوا۔ وہ ایک اونچی سی چھت سے چھلانگ لگاتا ہے اور نیچے موجود اپنے ساتھی کی موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھ کر بندوق لہراتا ہوا وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ شہادت سے میٹھی تو چیز ہی کوئی نہیں۔ لیکن اس سے پہلے میں چاہوں گا کہ اسی طرح بہت سے کفر کے ساتھیوں کو مار ڈالوں۔ شائستہ سے شادی کروں اور پھر ایک دن شہید ہو جاؤں۔ شائستہ بہت روئے گی۔ اس نے شائستہ کو روتے ہوئے تصور کیا۔ ساتھ ہی ایک کا کا بھی رو رہا تھا۔ یہ اس کا بچہ تھا۔ مگر مجھے تحریک کے فیصلوں پر اختیار نہیں۔ یہ لوگ مجھے کبھی بھی کسی بھی مشن پر بھیج سکتے ہیں۔ جیسے مجھے پہلا ہی مشن کارساز پر خودکش دھماکے کا دیا، جس میں میں شہادت نہیں پا سکا۔

یہ لوگ کیوں ایسا کرتے ہیں؟ شہید ہونے سے پہلے ہمیں دوسرے مشن کیوں نہیں دیے جاتے؟ لیکن ہم تحریک کے فیصلوں میں بول بھی تو نہیں سکتے۔ بولیں گے تو وہ انجام ہوگا جو نیامت خان کا ہوا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ غدار کہلاؤں۔ وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر وہ یہ سوچتا رہا کہ دیوار کے اس طرف شائستہ شاید ابھی جاگ رہی ہوگی یا اپنی پلکیں موند کر سو گئی ہوگی۔ شائستہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ اگر وہ شہید ہو گیا تو شائستہ ایک اچھی زندگی سے محروم رہ جائے گی۔ لیکن میں اسے ایک اچھی زندگی دے بھی سکتا تھا، اگر میرا باپ مجھ سے اتنی نفرت نہ کرتا، کوئی ڈھنگ کا کام کاج کرتا اور مجھے اور ہم سب بہن بھائیوں کو اچھی طرح پڑھاتا لکھاتا۔ بہن بھائی؟ یہ سوچ کر اس کے دل میں ایک درد تیر کی طرح تیر گیا۔ باپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میری دشمن میری ماں ہے۔ مجھے نفرت بھی اسی سے ہونی چاہیے تھی۔ میں ضرور ایک دن اپنی پستول کی گولیاں اس کے سینے میں اتار دوں گا۔

26

توں مائیں، توں ڈین ایں۔ ایہہ گل تے من ہن پتا گئی اے کہ وَنے نال سروڑی تے تیری بھجنی چاہی دی آئی۔ نہ توں آپنے اوس چنے یار نال سوندی، ناں میں جمدا۔ ناں میں وردر کتے کھسی کردا۔ کیہڑی تھوڑ آئی اے کول؟ کھسر اتے نایا میرا پیو۔ کیوں توں ایہہ کمام کیتا؟ ہک حرام دا وجود ہن کے کرے؟ میں تے آپنے وجود ن حلال کر لیساں پر توں کے کریسیں؟ پر توں جو کج کرنا آہیا اوہ کر لیا۔ پر کیوں کیتا توں اوہ کمام؟ نی مجھ چاتمیں آہ من۔ نی کروی لیا آہیا تے کدائیں اُراں پراں رُڑھا دیویں آہ من۔ نی من مجھ چاتمیں آہ۔ نی من کیوں جمیا ای؟ نی من کیوں جمیا ای؟ نی کیہڑی لوڑ آہیا من جمنے دی؟

باب پنجم

چہارم یہ کہ فن کا کسی بھی حقیقت سے کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا اور فن صرف اپنے ہی مماثل ہوتا ہے...

ژاں بودریاغ

تحصیلدار اقبال محمد خاں

1

تحصیلدار اقبال محمد خاں شکار کھیلتے تھے۔ رسول بیراج میں سردیوں کے موسم میں بہت اچھا شکار ملتا تھا۔ بطخیں تو خیر بے شمار ہوتی تھیں لیکن اور بھی قسم قسم کے پرندے وہاں آیا کرتے تھے۔ وہ نومبر کا مہینہ تھا۔ وہ منہ اندھیرے شکار کے لیے نکلے تھے اور اپنے ساتھیوں کو رسول بیراج میں چھوڑ کر کچھ پرندوں کے پیچھے پیچھے چلتے شکار کی تلاش میں ساتھیوں سے بچھڑ کر کچھ دور آ گئے تھے۔ بیراج کی جھیل اور رسول قادر آباد لنک کینال کے درمیان ایک ویران قطعہ تھا جس کے بائیں جانب تھوڑی دور کو ٹھراکا گاؤں تھا۔ ان عجیب پرندوں کی ڈار اڑتی ہوئی اسی ویران قطعے کی طرف نکلی تھی اور ابھی تک ان کی نظر میں تھی۔ سردی کی اس صبح افق سے سورج ابھی بمشکل نکلنا ہی شروع ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ان کے گالوں کو چھو رہی تھی۔ اپنے ساتھیوں سے یوں بچھڑ جانا انھیں اچھا لگ رہا تھا اور وہ شاید ان سے جان بوجھ کر ہی بچھڑ گئے تھے۔ وہ اپنی بندوق سنبھالے جھاڑیوں میں ایسی احتیاط سے چلتے جا رہے تھے کہ انھیں خود اپنے قدموں کی آواز بھی سنائی نہ دے۔ پرندے اب ایک جگہ بیٹھنے لگے تھے۔ اقبال محمد خاں نے اپنی نظریں ان کے ساتھ ساتھ آسمان سے زمین کی طرف کر دیں۔ ایک پرندہ باقی پرندوں سے کافی دور بیٹھ رہا تھا۔ انھوں نے اپنی نظر اس کی طرف دوڑائی تو انھیں اسی جانب کوئی گلابی سی چیز دکھائی دی۔ پہلے تو انھیں کچھ سمجھ نہ آئی لیکن ساتھ ہی انھیں گیروے رنگ کی چادر نظر آئی تو وہ فوراً سمجھ گئے۔ وہ ایک سرخ و سفید ران تھی جو ایک ملگجی سے لاچے میں سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ اس سے تقریباً بیس قدموں

کے فاصلے پر تھے۔ ران کے درمیان سے پانی کی تیز دھار مٹی کے ایک نرم سے بٹنے میں سوراخ کر رہی تھی اور پانی بٹنے کے نیچے جمع ہوتا جا رہا تھا۔ عورت کا رخ لنک کینال کی جانب تھا۔ اگر وہ کینال کی جانب سے آ رہے ہوتے تو شاید وہ اس پانی کا منبع بھی دیکھ لیتے، لیکن زیادہ امکان یہ تھا کہ اس سے پہلے عورت خود انھیں دیکھ لیتی۔ وہ وہیں رک گئے اور مبہوت سے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ کچھ لمحوں بعد عورت اپنے لوٹے سے رانوں کے اندر چھپا کے مارنے لگی۔ اس کی ایک پنڈلی کے موٹے موٹے بال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اب موقع تھا کہ اقبال محمد خاں احتیاط کا دامن چھوڑ کر بلا تکان آگے چلے آتے۔

ان کے پہلے ہی بے احتیاط قدم سے زمین پر کوئی پتا چر چرایا تو ان کے سامنے ایک لم سلمی عورت تر بجک کر کھڑی ہو گئی اور اس کا لاچا اس کی ٹانگوں کو ڈھانپ گیا۔ اس نے اپنی چنی سے اپنا سر بھی ڈھانپ لیا۔ اتنے میں وہ یہ دیکھ چکی تھی کہ مداخلت کار گاؤں کا کوئی آوارہ گرد نہیں بلکہ کوئی معتبر آدمی ہے۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا لاچا سنبھالا اور اسے ٹخنوں تک درست کرنے کی فکر کرنے کے بجائے دوسرے ہاتھ سے سر پر چنی درست کرنے کی فکر کرنے لگی۔

"کون ایں توں؟" اقبال محمد خاں نے 'جارحیت بہترین دفاع ہے' کی حکمتِ عملی اپناتے ہوئے ذرا رعب سے پوچھا۔

"میں جی عالمگیر،" اس نے حیرت اور غصے سے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

"پیو داناں تئیں پچھیا، تیرا پچھیا اے،" وہ ذرا نرمی سے گویا ہوئے۔

وہ خاموش رہی اور ڈھنگروں کے گٹھے کی طرف متوجہ ہو کر اسے اٹھانے کو ہوئی۔

"کتھو دی ایں؟"

"نویں لوک دی جی،" اس نے منہ پھیرے ہوئے ہی جواب دیا۔

"ایہہ شکار آلا علاقہ اے۔ ویکھ کے آیا کر، کدی فیر شیر دی لگ جاندا اے،" انھوں نے شکار کی بہترین ترکیب آزمائی اور آنکھوں سے مسکراتے ہوئے، مگر سنجیدہ چہرے کے ساتھ اسے سرپرستانہ لہجے میں کہا اور پھر اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پسینے سے اس کی قمیض اس کی کمر سے چپکی ہوئی تھی اور صبح کے سورج کی روشنی میں اس کے لاچے کے اندر سے اس کی ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے ابھرے ہوئے کولھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک آدھ بچہ جن چکی ہے۔ اقبال محمد خاں نے کچھ دیر

بعد وہ جگہ دیکھی جہاں سے کچھ دیر پہلے وہ اٹھی تھی۔ پیشاب کی دھار پڑنے سے نرم نرم بٹنے میں نشان سا پڑ گیا تھا اور نیچے جمع ہونے والے پیشاب کی شفاف رنگت یہ بتاتی تھی کہ وہ ایک صحت مند عورت ہے۔

دفتر پہنچتے ہی انھوں نے اپنے خاص رازدار یارو گوندل کو بلوایا جو ان کے لیے مشروبات وغیرہ کا بندوبست کرتا تھا۔ یارو دریائے جہلم کے کنارے کے ہر ہر گاؤں کا واقف تھا۔ پانچ سال کی عمر سے آوارہ گردی شروع کر دینے کے باعث اس علاقے میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جس سے وہ آگاہ نہ ہو۔

"یارو یہ نویں لوک میں کوئی عالمگیر رہتا ہے؟"

"نئیں سر جی، عالمگیر تو کوئی نہیں رہتا۔" اس نے اپنے دیدے گھماتے ہوئے آہستگی سے عالمگیر کا لفظ ادا کیا جیسے اس کی ادائیگی کے دوران وہ اس گاؤں کے تمام مردوں کو اپنی چشمِ تصور میں لا کر ان کا جائزہ لے رہا ہو۔

"اچھی طرح یاد کرو،" انھوں نے اپنی آنکھیں باریک کر کے اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"ایک کڑی ہوتی تھی جی عالمگیر نام کی۔ لوک گیرو گیرو کہتے تھے اسے۔ بہت سال پہلے دیکھا تھا اسے،" یارو نے اپنی مسکراہٹ دبانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مونگ تھانے میں ایک کانسٹیبل ہے۔ اس کی بیوی ہے۔ پر بندہ تو کوئی نہیں رہتا جی اس نام کا۔"

اقبال محمد خاں اپنے کھلے منہ کے ساتھ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے۔ انھیں یاد آیا کہ پنجاب کے دیہاتوں میں لوگ کسی مردانہ نام کے آگے صرف بی بی لگا کر کسی لڑکی کا نام بھی رکھ لیتے تھے۔ اچھا... تو اس عورت کا نام عالمگیر تھا۔

اقبال محمد خاں کی اس سے جس جگہ ملاقات ہوئی تھی اس کے آگے رسول قادر آباد لنک کینال تھی۔ اس کے بالمقابل دریائے جہلم سے نکالی جانے والی ایک اور نہر بھی بہتی تھی۔ یہ مونگ کینال تھی۔ مونگ کینال کے آگے کوٹلی افغاناں کا گاؤں آتا تھا اور پھر مونگ۔ مونگ کے کنارے ایک چھوٹی سڑک ہے جو مونگ کو ماجھی اور کھیوہ جیسے بڑے قصبوں سے جوڑتی ہے۔ نواں لوک بھی اسی سڑک کے کنارے ایک گاؤں ہے۔ عالمگیر اسی گاؤں کی تھی اور کچھ دن کے لیے اپنے رشتہ داروں کے ہاں کو ٹھہرا آئی ہوئی تھی۔

2

اقبال محمد خاں نے دو بجے کھانے کے بعد اپنے دفتر میں سب کا داخلہ بند کر دیا اور باہر گارڈ بٹھا دیا۔ اب وہ اپنی نشست کے پیچھے بھورے رنگ کی پیٹیوں کی طرف متوجہ ہوے۔ یہ پیٹیاں بڑی بڑی تھیں جن کا بھورا رنگ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ ہر پیٹی کے درمیان میں ایک بڑی سی کنڈی میں ایک بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ اقبال محمد خاں نے اپنی میز کی دراز سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور ایک پیٹی کے تالے میں چابی لگانے لگے۔ چار پانچ چابیاں ٹرائی کرنے کے بعد ایک چابی تالے کو لگ گئی۔ پیٹی میں سرخ رنگ کی مہر بند تھیلیاں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ وہ ہر تھیلی باہر نکال کر دیکھتے رہے۔ انھیں جو تھیلی مطلوب تھی وہ پیٹی میں خاصی نیچے سے ملی۔ انھوں نے وہ تھیلی نکال کر پیٹی بند کر دی۔ انھوں نے قینچی سے تھیلی کی مہر والے حصے کو کاٹا اور اس کے اندر سے فائلیں اور مسلیں نکال نکال کر دیکھنے لگے۔ یہ مونگ گاؤں کی مسلیں تھیں۔

اس کے بعد وہ اپنی کرسی کے پیچھے الماری کی طرف متوجہ ہوے جس میں بہت سے رجسٹر رکھے ہوے تھے۔ ایک رجسٹر پر لکھا ہوا تھا "رجسٹر حق دارانِ زمین (مسل میعادی) موضع نواں لوک"۔ اس رجسٹر میں کافی دیر سر کھپانے کے بعد انھیں کانسٹیبل شوکت کا نام نظر آیا۔ وہ بہت تھوڑی سی زمین کا مالک تھا جس پر اس نے مکان بنایا ہوا تھا اور اس کی کوئی مزروعہ زمین نہیں تھی۔ اقبال محمد خاں نے نواں لوک کا نقشہ نکالا۔ نقشے کے درمیان میں ایک ایسی جگہ تھی جس پر کوئی نمبر نہیں لکھا ہوا تھا۔ گاؤں کے درمیان کا یہ حصہ 'کھیوٹ' کہلاتا تھا۔ انگریزوں کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ رہائشی اراضی پر کوئی نمبر شمار نہیں لگاتے تھے اور یہ رہائشی زمین بس باپ سے بیٹے اور اس کے بعد ان کے بیٹوں میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ ڈاکیا بھی ایسے مکانوں پر صرف نام کے سہارے پہنچ جاتا تھا۔ شوکت کی زمین 'کھتونی' کے رقبے میں تھی یعنی اس کا شمار مزروعہ اراضی میں ہوتا تھا جسے وہ رہائشی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ گاؤں کی بہت سی مزروعہ اراضی پر اب مکان بنے ہوے تھے۔ شوکت اور عالمگیر کے بارے میں تحقیق کرنے کے بعد اقبال محمد خاں نے دھول میں اٹے ہاتھ جھاڑے اور گارڈ کو چائے کا انتظام کرنے کا کہہ کر خود ہاتھ دھونے چلے گئے۔

یہ تحقیق وہ کسی سے پوچھ پاچھ کر بھی مکمل کر سکتے تھے مگر ان کا طریقہ یہی تھا کہ انھیں کسی عورت

سے دلچسپی ہوتی تو وہ اپنے دفتر میں موجود مسلوں اور فائلوں سے ہی اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتے تھے۔ اس سے انھیں یہ اندازہ بھی ہو جاتا تھا کہ ان کے پاس موجود مسلوں اور فائلوں میں کوئی نام غیر موجود تو نہیں۔ اور بلاشبہ انھیں اس بارے میں کبھی مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ ان مسلوں کو دیکھتے ہوے ان کی ایک عمر گزری تھی اور اس چکر میں انھیں منڈی بہاء الدین ضلع کے ہر ہر موضع، اس کی کھیوٹ، کھتونی اور ملکیتی تنازعات سے متعلق چھوٹی چھوٹی معلومات بھی ازبر تھیں اور یہ معلومات انھیں اتنی عزیز تھیں کہ وہ یہ ضلع چھوڑ کر کسی اور ضلع میں جانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ یہ وہ کام تھا جس سے انھیں عشق تھا۔ بعض عورتوں یا خاندانوں پر وہ مہربان ہوتے تو گاؤں کے اردگرد سے زمین کا کوئی قطعہ کاٹ کر انھیں دینے میں انھیں کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ پھر بیلے کی زمینیں بھی تو تھیں جو کسی کی بھی ملکیت نہ ہونے کے سبب سرکار کی ملکیت تھیں اور دریا کے پاس موجود بیلے سے کسی قطعے کو کاغذات میں دریا بُرد قرار دے کر اسے اصل میں کسی اور کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ وہ دریاے جہلم کے کنارے موجود بیلے کے رقبے میں سے ایک اچھا سا ٹکڑا عالمگیر کو دیں گے۔

عالمگیر کے لیے ان کی منصوبہ بندی کا یہ صرف پہلا مرحلہ تھا جو مکمل ہوا تھا۔

3

اقبال محمد خاں نے اگلے روز مونگ تھانے کے وزٹ کا پروگرام بنایا، اس کے ایس ایچ او سے بات کی اور صبح تھانے پہنچ گئے۔ تھانے میں وہ سب کانسٹیبلوں کی نیم پلیٹ پڑھتے گئے۔ کانسٹیبل شوکت کا نام ایک نیم پلیٹ پر دیکھ کر انھوں نے اسے اپنے قریب بلایا۔ لسوڑھا سا آدمی تھا اور اس کی باہر نکلی ہوئی بڑ باچھوں سے لگتا تھا کہ کوئی نشہ وشہ بھی کرتا ہے۔ اقبال محمد خاں نے تھانے دار سے کہہ کر اسے اپنے دفتر میں لگوا لیا۔ پھر اسے اپنے ہی بنگلے میں ایک کوارٹر بھی دے دیا۔

عالمگیر بھی سمجھ دار تھی۔ ظاہر ہے اسے اس روز والے واقعے کا ذکر اپنے جنے سے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ بہت روکھا تھا۔ لاچے میں سے نکال کر اس پر چڑھ جاتا اور بات بے بات لاتیں مُکے بھی چلاتا۔ اس کے منھ سے عجیب سی ہبکار بھی اٹھتی تھی۔ لگتا تھا کوئی نشہ وشہ بھی کرتا ہے، لیکن اس نے پوچھنے کی پروا کبھی نہیں کی تھی۔ اسے صفدر و یاد آتا جو اس سے لاڈ پیار کی باتیں کرتا تھا

اور کبھی کبھی اسے چونڈی بھرنے کی کوشش کرتا۔ پھر وہ باہر لے ملخ چلا گیا اور بھیس کے اسے پوچھا بھی نہیں۔ پوچھتا بھی کیسے؟ کوئی رشتہ تھا نہ ناتا۔ خط پتر کا تو سوال ہی نہیں تھا، البتہ رشتہ بھیج سکتا تھا جو اس نے کبھی نہ بھیجا۔ اس کے بھائی قمرو نے عالمگیر سے مشکری کرتے ہوئے کہا تھا کہ صفدرو باہر لے ملخ میں سٹیزن شپ کے چکر میں ہے جس کے لیے کسی گوری میم کو پھنسانا پڑتا ہے۔ ''دفع دور! میرے کھلے توں،'' عالمگیر نے قمرو کو بے اعتنائی سے کہا تھا لیکن اس کے دل میں درد کی ایک لکیر سی تیر گئی تھی۔

ایک دن اقبال محمد خاں کوارٹر کے پاس سے گزرے تو وہ باہر اپنی بچی کو کھلا رہی تھی۔

''کتنے بچے ہیں تمھارے؟'' اپنے افسرانہ وقار کا خیال رکھتے ہوئے اس مرتبہ انھیں اس سے بات کرنے کے لیے اردو ہی مناسب محسوس ہوئی۔

''یک ای ہے جی۔ دو دِھیاں ہور آہیاں۔ یک پر مر گئی، یک پرار،'' اس کے لفظوں میں افسوس کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ وہ ایسی کہہ رہی تھی جیسے کسی معمولی سی بات کا اظہار کر رہی ہو۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اسے اپنی دو بیٹیوں کی وفات پر کوئی افسوس تھا یا نہیں۔ اگر تھا بھی تو اس وقت اس کے اظہار کے بجائے وہ کچھ اور جاننے کی خواہش مند تھی اور منتظر تھی کہ اس کے دل میں جو اندیشہ تھا اس کی طرف کوئی پیش رفت ہو جائے تو پھر دیکھا جائے کہ کیا کیا جانا چاہیے۔

ایک دو روز کے بعد اس نے گھر کے باہر دو بڑی بڑی گاڑیاں آکر رکتے ہوئے دیکھیں۔ ان میں سے سات آٹھ شہری لڑکیاں اور عورتیں باہر نکلیں، جن کے ساتھ تین مرد بھی تھے۔ ادھر سے تحصیلدار صاحب باہر نکلے اور ان عورتوں نے ان سے ہاتھ ملانا شروع کر دیے۔ عالمگیر یہ سب دیکھ کر حیران رہ گئی اور اسے اپنے دل میں حسد کی ایک لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کے صاحب کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کا کوئی کال نہیں اور شہری عورتیں تو سب کے سامنے اس سے ہاتھ ملانے پر بھی تیار ہیں۔ اسے اپنے اس اندیشے پر شرمندگی ہوئی کہ صاحب کی اس پر نظر ہے اور وہ جلد ہی اسے چھونے والا ہے۔

صاحب کے گھر میں اور بھی عورتیں اور مرد کام کرتے تھے۔ کوئی ان کے باغ کی دیکھ بھال کرتا، کوئی ان کے پیغامات لاتا لے جاتا۔ ایک سائیس تھا جو ان کے گھوڑے کی خدمت کرتا تھا۔ عالمگیر نے خود ہی کوٹھی کے صحن میں جھاڑو لگانا اور پانی ترونکنا شروع کر دیا۔ ایک دن صاحب نے اسے

دیکھا تو اسے نہ صرف صحن میں بلکہ کوٹھی کے کمروں کے اندر بھی صفائی پر لگا لیا اور اس کام کے لیے پیسے بھی مقرر کر دیے جو تھوڑے سے انکار کے بعد عالمگیر نے قبول کر لیے۔

کانسٹیبل شوکت کے گھر میں انواع و اقسام کے فروٹ، اجناس، مٹھائیاں اور جوڑے آنے لگے۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو صاحب کے دفتر میں اپنی فائل یا ذاتی رسائی کا مرحلہ ایک سیڑھی آگے کرنے کے خواہش مند شوکت کو تھماتے تھے۔ صاحب خود رشوت نہیں لیتے تھے اور نہ کسی کو لینے دیتے تھے۔ لیکن تحفے تحائف کو کون انکار کر سکتا ہے! شوکت اور عالمگیر اپنے حالات میں اس خوشگوار تبدیلی پر دن رات صاحب کے نام کا کلمہ پڑھتے اور انھیں دعائیں دیتے۔

صاحب کی جانب سے کسی روز پیش رفت کا جو شک عالمگیر کو تھا، وہ دور ہو گیا تھا۔ عالمگیر ان کے ڈبل بیڈ پر چادر کو بڑے پیار سے بچھاتی اور اس کی ایک ایک شکن سیدھی کرتی۔ ایسے میں وہ خود بستر پر پیٹھ ٹکاتی تو اس کے کولھے فوم کی نرم تہہ میں ڈوب جاتے اور اسے حیا سی آ جاتی۔ کبھی کبھی اس صفائی ستھرائی کے دوران صاحب بھی آ دھمکتے، لیکن اپنی شرٹ درست کرنے، الماری میں اِدھر اُدھر جھانکنے اور فائلیں نکالنے میں مصروف رہتے۔

اس روز اس نے سرسوں جیسے پیلے رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی، جس پر کام ہوا ہوا تھا۔ صاحب اسے دیکھ کر ٹھٹکے اور پوچھا:

''یہ، یہ جوڑا کہاں سے لیا ہے؟''

''جی شوکت لبایا تھا۔ اسے کسی نے گفٹ دیا ہے،'' اس نے اپنے تئیں اردو میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اس پر یہ گوٹے کا کام بہت سوہنا ہے۔ یہ کس نے کیا ہے؟'' صاحب نے یہ کہتے ہوئے اس کے بازوؤں پر لگے ہوئے گوٹے کو چھوا۔ خوف اور خواہش کی ایک لہر عالمگیر کے بدن میں دوڑ گئی۔ صاحب نے اس کے دونوں بازوؤں کے گرد اپنے دو ہاتھ رکھے اور اسے بستر کے کنارے پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد وہ اس کی قمیض کے سینے پر بنا ہوا ڈیزائن دیکھ کر اس پر انگلی پھیرنے لگے۔ عالمگیر کا دوپٹہ گر چکا تھا اور اس کے سینے کا جوڑ قمیض کے گلے میں سے نمایاں ہو رہا تھا، لیکن وہ صاحب سے نظریں ملانے کی ہمت بھی خود میں نہیں پا رہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کا رخ موڑ کر دروازے کی جانب کر دیا جو

تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ صاحب نے اس کی گردن کے گرد قمیض کے گریبان کی کناری پر انگلی پھیری اور پھر اس کی کمر کی طرف متوجہ ہوے۔ قمیض کی زپ اس کے کولھوں تک جاتی تھی اور زپ کے دونوں کناروں پر گل بوٹے بنے ہوے تھے۔ صاحب نے اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے زپ پکڑی اور اسے یوں نیچے لانے لگے کہ ان کی شہادت کی انگلی زپ کے دائیں جانب اور انگوٹھا زپ کے بائیں جانب کے گل بوٹوں کو چھوتا چلا گیا۔

"صاحب جی، بوا کھلا ہوا ہے،" اس نے دروازے سے روشنی کی لکیر نکلتے دیکھ کر اپنی پوری ہمت جمع کر کے کہا۔ لیکن اس کے آواز میں احتجاج کے بجاے سرگوشی کا سا ذائقہ تھا جو کسی بھی مرد کو اور شیر کر دیتا۔

صاحب نے پیچھے سے اس کی بریزیئر کھول دی اور اپنا چہرہ اس کے سامنے کر دیا۔ اسے ان کے چہرے پر سنجیدگی اور ابروؤں پر بلا کا رعب نظر آیا۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی لیکن ڈر رہی تھی کہ کسی لفظ یا اس کے لہجے کی نامناسبت سے صاحب کو ناراض نہ کر ڈالے۔ اسے یقین تھا کہ اگر کچھ نامناسب ہوا تو صاحب خود ہی اس سے گریز کریں گے۔ انھیں برے بھلے کا اس سے زیادہ پتا ہوگا۔ انھوں نے دونوں ہاتھ اس کے کندھے پر جمائے اور وہ بستر پر ڈھے گئی۔ پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی قمیض کے اندر لے گئے اور اس کے سینے کو ٹٹولنے لگے۔ دروازے میں سے چھن کر آنے والی روشنی نے اس کا خوف بڑھا دیا، لیکن صاحب کے ہاتھ قمیض میں داخل ہوتے ہی اس خوف کے مقابلے میں خواہش کی ویسی ہی منھ زور لہر اس نے اپنے اندر اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ انھوں نے قمیض اوپر اٹھائی اور اس کی چوچیوں کو ہاتھ میں پکڑ لیا۔ بچے پیدا کرنے کے بعد چوچیاں پھیل گئی تھیں اور عالمگیر دیکھ سکتی تھی کہ صاحب نے انھیں زیادہ پسند نہیں کیا۔ اس پر اسے کچھ ہیکی سی محسوس ہوئی لیکن صاحب نے اپنی توجہ فی الفور ان سے ہٹا کر اس کا ناڑا کھول دیا۔ اب تک انھوں نے اس سے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا اور اب جبکہ وہ بڑی سنجیدگی سے اپنی پینٹ کھول رہے تھے اس نے آخری مرتبہ ہمت جمع کر کے کہا:

"صاحب جی، بوا؟"

لیکن صاحب نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ عالمگیر کے اندر ایک تجسس سا جاگا کہ دیکھیں کیسا ہو۔ ان کی سفید انڈرویئر اتری تو اس کا ترا و نکل گیا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے اپنا منھ پرے

کر کے آنکھیں کھول لیں اور اپنے زیریں حصے میں ان کی انگلیوں کو جگہ بناتا ہوا محسوس کیا۔ جب وہ اس پر چڑھ چکے تو انھوں نے اس کے گالوں کو اپنے ہاتھ سے قدرے درشتی سے سیدھا کر کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ جب وہ بالآخر اس سے مستفید ہو رہے تھے تو ان کے چہرے پر انتہائی کڑی سنجیدگی برقرار تھی۔ وہ خوف اور تشویش سے انھیں دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ گیلی ہو چکی تھی اور اسے خوف تھا کہ صاحب کو اس کی گیلاہٹ پسند نہیں آئی ہوگی۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھے تو عالمگیر نے اپنے ضارب کے گرد ایک نفیس زیر درختی ملاحظہ کی اور اسے ایک حیرت انگیز مسرت نے آن لیا۔ دو روز کی بڑھی ہوئی اس زیر درختی کا اس نے شوکت کے جھاڑ جھنکاڑ سے موازنہ کیا اور شاید اسی لمحے طے کر لیا کہ اس کا سامنا ایک ایسی خوش بختی سے ہوا ہے جسے وہ کسی بھی صورت اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتی تھی۔ اس زیر درختی کو وہ اپنے بعد کے برسوں میں اپنی نفیس ترین یادوں میں سے ایک کے طور پر سنبھالنے والی تھی۔

اقبال محمد خاں واش روم سے واپس آئے تو عالمگیر اپنے کپڑے پہن چکی تھی۔ انھوں نے الماری سے ایک گولی نکالی اور اسے پانی کے گلاس کے ساتھ تھماتے ہوے کہا:

"ایہہ کھا لے۔ تے کسے نوں ناں دسیں۔"

اِدھر عالمگیر نے گولی نگلی اور اُدھر اقبال محمد خاں اس کی طرف دیکھے بغیر دروازے سے باہر نکل گئے۔ دروازے کا ایک پٹ اب پورا کھلا تھا اور اس سے نکلنے والی روشنی سے کمرے میں جیومیٹری کی ایک شکل سی بن گئی تھی۔

4

اقبال محمد خاں یوپی کے ضلع مرادآباد میں پیدا ہوے تھے۔ وہاں ان کے والد کی چھوٹی موٹی زمینداری تھی۔ باپ نے ان کا نام علامہ اقبال کے نام پر رکھا تھا۔ جب پاکستان بن رہا تھا تو اقبال محمد خاں نو برس کے تھے، لیکن گلیوں، بازاروں میں 'لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان' کے نعرے لگاتے پھرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انھیں کلیم میں اوکاڑہ کے قریب زمین ملی تھی، لیکن بعد کے برسوں میں انھوں نے وہ زمین بیچ باچ کر لاہور اور منڈی بہاءالدین میں زمینیں خرید لی

تھیں۔ ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے ایک سال بے روزگاری کاٹی اور پھر کسی کے مشورے پر قانون پڑھنے لگے جس میں ان کا زیادہ جی نہیں لگ رہا تھا۔ سن ساٹھ کے عشرے کے لاہور میں وہ کبھی گانا سننے نکل جاتے، کبھی مال روڈ پر آوارہ گردی کرتے اور کبھی پاک ٹی ہاؤس میں ادیبوں کی بحثیں سنتے۔ اپنے کالج کے کئی دوستوں کی طرح انھیں بھی شاعری اور ادب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ انھی دنوں انھیں نائب تحصیلدار کے امتحان کا پتا چلا۔ انھوں نے امتحان دیا، پاس ہوئے اور دیہات کی فضا، نائب تحصیلدار کے لیے چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی آؤ بھگت اور وقتاً فوقتاً ملنے والی سادہ اور صحت مند عورتوں کی صحبت انھیں ایسی بھائی کہ وہ اپنے پیشے کو دل سے پسند کرنے لگے۔ ان کا شعر و ادب کا شوق ادبی محفلوں کی سرپرستی تک محدود ہو گیا تاہم سلطانہ سے عشق کے دنوں میں ان پر ایک بار پھر شاعری کا دورہ پڑا تھا۔

جب اقبال محمد خاں نے امتحان پاس کیا تھا تو انھوں نے طے کیا تھا کہ وہ رشوت نہیں لیں گے اور کبھی کوئی غیر قانونی کام نہیں کریں گے۔ شروع کے دنوں میں وہ اپنے اصولوں پر سختی کے ساتھ کاربند رہے۔ اُن دنوں ضلع میں پولیس، علاقائی عدلیہ، سیاست دان اور زمیندار سب ان سے کھنچے کھنچے رہتے۔ اقبال محمد خاں نے تنہائی کے خول سے نکلنے کے لیے اپنے علاقے میں ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینا شروع کیا۔ وہ اسکولوں میں چیف گیسٹ کی حیثیت سے بلائے جاتے، مشاعروں میں مہمانِ خصوصی بنتے اور لائبریریوں کا افتتاح کرتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ سماج میں شعور بیدار کر رہے ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع ہونے لگا تو انھیں معلوم ہوا کہ بعض زمیندار اور پولیس اور انتظامیہ کے عہدے دار بھی ان ثقافتی سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یوں وہ بھی چپکے سے ان کے حلقۂ احباب میں چلے آئے۔ جب کوئی ان سے یاری گانٹھ لیتا تو کسی نہ کسی دن ان سے اپنے کسی رشتہ دار یا دوست کے کام کا بھی کہہ دیتا اور ان کی مرادآبادی وضعداری انھیں مجبور کر دیتی کہ وہ اپنے دوست کا کہا نہ ٹالیں۔ شراب کا انھیں کوئی خاص شوق نہیں تھا لیکن دوستوں کی محفل میں ان کے اصرار پر ایک آدھ پیگ وہ بھی لگا لیتے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں یہ شوق کچھ ایسا بڑھا کہ وہ اپنے کمرے کی الماری میں رنگ برنگی بوتلیں جمع کرنے لگے۔ ان دنوں ان کی ایک ہی کمزوری تھی۔ بعض عورتوں کا حسن انھیں ایسا اپنی جانب کھینچتا تھا کہ ان کی طرف سے قربت کے امکان پر وہ اس سے گریز نہیں کر پاتے تھے۔ ان کی

مرادآبادی مروت اور عورتوں کے لیے خاص محبت نے ان کے اصولوں میں دراڑیں ڈالنا شروع کیں۔ دوستوں کے تحفے تحائف سے بھی انھوں نے گریز کی کوشش کی، لیکن ان کے حلقے میں تحفے تحائف کی قسمیں بھی تو بہت سی رائج تھیں۔ کوئی عہدے دار یا زمیندار اپنے ہاں ان کی شاندار دعوت کرتا، انھیں شکار پر لے جاتا یا اس کی بدولت وہ کسی خاتون سے قربت کا موقع ڈھونڈ لیتے تو وہ خود کو اس کا احسان مند محسوس کرتے۔ اسی احساس کے کونوں کھدروں سے ان کاموں کی راہیں نکلتی تھیں جنھیں وہ غیر قانونی سمجھتے آئے تھے۔ انھوں نے بہتیرا خود کو سمجھایا کہ اگر ان کے ماتحت تحفے تحائف اور رشوت لیتے ہیں، یا سرکاری عہدے دار اور زمیندار ان سے دوستی یاری گانٹھتے ہیں تو وہ ہر دم ہوشیار رہا کریں گے تا کہ یہ ماتحت اور دوست ان کے سرکاری کاموں پر اثر انداز نہ ہو سکیں، مگر کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں اس کی گنجائش نکل ہی آتی تھی۔ کوئی اور نہیں تو انھیں کہیں اوپر ہی سے فون یا پیغام آ جاتا تھا کہ وہ فلاں کا کام کر دیں۔ نظام کے رندے سے گھس گھسا کر وہ بھی اس نظام کا ایک عام سا پرزہ ہی بن کر رہ گئے تھے۔ اتنا ہی بہت تھا کہ لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ صاحب رشوت کے پیسے کو ہاتھ تک نہیں لگاتے اور رشوت دینے کی کوشش کرنے والے کا کام بننے کے بجائے بگڑ جاتا تھا۔ مگر ان کے قریبی لوگ جانتے تھے کہ ان سے کام نکلوانے کا کیا طریقہ ہے۔

یارو گوندل کئی برسوں سے ان کے ساتھ تھا۔ مشروبات اور عورت سے متعلق معاملات میں وہ ان کے اعتبار کا آدمی تھا۔ مقامی زمیندار انھیں عورتیں فراہم بھی کر سکتے تھے لیکن اقبال محمد خاں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ انھیں چھوٹی چھوٹی محبتوں کے کھیل کھیلنے میں مزہ آتا تھا۔ عورت کو رجھانے اور رفتہ رفتہ لبھا کر اپنے قریب لانے میں انھیں زیادہ تشفی ہوتی تھی۔ اس تعلق کے مختلف مراحل پر انھیں اپنی جوانی کے زمانے میں پڑھا ہوا کوئی اردو کا شعر اچانک یاد آتا تو وہ اسے اپنے ہونٹوں سے ادا کرتے ہوئے ایک ایسی خوشی محسوس کرتے جو انھیں اور کسی چیز سے حاصل نہیں ہوتی تھی۔ مقامی زمیندار، عہدے دار یا کوئی اور یارو گوندل سے مل کر اتفاقات کا ایسا جال بنتے جس کے نتائج کو اقبال محمد خاں اپنی ذاتی فتح سمجھ کر خوش ہوتے رہتے اور سائل بھی اپنا الو سیدھا کر لیتا۔

5

ہم جن دنوں کا ذکر کر رہے ہیں ان دنوں وہ اپنی دوسری بیوی کی یاد میں بے قرار رہتے تھے۔ جب سلطانہ انھیں ملی تھی تو وہ چار بچوں کے باپ تھے، لیکن سلطانہ کی اداؤں نے ان کا دل جیت لیا تھا۔ سلطانہ سے شادی کے بعد ان کے تعلقات بڑے بڑے افسروں اور سیاستدانوں سے بھی ہو گئے تھے کیونکہ سلطانہ کو محفل آرائی کا فن آتا تھا۔ وہ گھر میں پارٹیاں ترتیب دیتے تو سلطانہ جانِ محفل ہوتی۔ ہر بڑے آدمی اور اس کی اہلیہ سے اس کی دلچسپی کی بات کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے اقبال محمد خاں کے ساتھ ساتھ ان کے حلقۂ احباب کا دل بھی جیت لیا تھا۔

اس کے برعکس ان کی پہلی بیوی امۃ الکریم نہایت مذہبی تھی اور نامحرموں سے پردہ کرتی تھی۔ اقبال محمد خاں نے اس کے بھی حسن ہی سے متاثر ہو کر اس سے شادی کی تھی لیکن شادی کے بعد اس نے اپنی طبیعت اور عادات تبدیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی اور اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا سارا کام اس نے خود سنبھال رکھا تھا۔ اگر وہ ایک خاموش گھریلو زندگی گزارنا چاہتے تو امۃ الکریم اس کے لیے ایک مثالی عورت ہوتی۔ لیکن اقبال محمد خاں کی طبیعت کچھ مجلسی تھی اور امۃ الکریم کی روکھی طبیعت نے اقبال محمد خاں کا دل اس سے اچاٹ کر دیا تھا۔

سرکاری افسروں کو نوجوان اور خوبصورت عورتوں سے ملوانے کا بندوبست کرنے کا پورا ایک ریکٹ تھا۔ کچھ سال پہلے گجرات میں ایک پولیس افسر کی بیوی کی بڑی شہرت تھی جو ضلعی درجے کے افسروں سے لے کر ایوب خان کی فوج کے اعلیٰ ترین افسروں تک کو ان عورتوں سے ملواتی تھی جو دوستی یاری لگانے کے لیے دستیاب تھیں۔ اس کے بعد وہ افسر دوستی یاری کے کتنے مراحل طے کرتا تھا، یہ ان دونوں کی باہمی افہام و تفہیم پر منحصر ہوتا تھا۔ بعد میں اس عورت کا ایک کلائنٹ پاکستان کا صدر بن گیا اور وہ عورت اپنے دوستوں کی نجی محفلوں میں جنرل کہلانے لگی۔ ''جنرل رانی سے بات کروں گا... جنرل رانی یہ کر دے گی... جنرل رانی وہ کر دے گی...'' ایسی باتیں ہوا کرتی تھیں اس سے متعلق۔ اقبال محمد خاں اسی ضلع کے ایک سب ڈویژن میں ایک بہت چھوٹے سے افسر تھے، اس لیے ان کی رسائی اس ریکٹ کے نچلے درجے کے کل پرزوں تک ہی تھی۔ لڑکیوں اور عورتوں کے بے دریغ جنسی استعمال کے لیے 'بچیاں پاڑنا' کی اصطلاح معروف تھی، مگر اقبال محمد خاں اپنی شاعرانہ طبیعت اور مرادآبادی رکھ رکھاؤ

کے باعث عورتوں سے ہلکی آنچ پر پکتے ہوئے رومان کے طالب ہوتے تھے۔ اور پھر یہ رومان انھیں جہاں بھی لے جاتا، وہاں چلے جاتے۔ اسی ریکٹ کی ایک نچلے درجے کی کارکن ایک عورت کے طفیل سن ستر اور اکہتر میں ان کا رومانس کلثوم نام کی ایک عورت سے چل رہا تھا جو محکمۂ ورکس کے ایک بروقت نُن رہنے والے راشی افسر کی بیوی تھی۔

انھیں دسمبر سن اکہتر کی وہ رات اچھی طرح یاد تھی جب سارا پاکستان سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ گجرات میں آرمی کے نچلے درجے کے کچھ افسروں اور سپاہیوں نے بڑے افسروں کی بیرکوں کے سامنے جمع ہو کر نعرے لگائے تھے۔ انھوں نے مطالبہ کیا تھا کہ یحییٰ خان فوری طور پر اقتدار چھوڑ دے۔ پاکستان میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اور بھی تو بہت کچھ پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ بی بی سی نے بتایا تھا کہ مشرقی پاکستان پر بھارت نے قبضہ کر لیا ہے۔ ایک رات اس کے پڑوس کے مکان میں رہنے والا ایس پی اپنی شراب کی بوتل ہاتھ میں پکڑے اور صرف کچھا پہنے باہر نکل آیا تھا اور اس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے اور اگر بھارتی ٹینک اس طرف آئے تو وہ ان کی گاف میں گھس کر پھٹ جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی انھیں ایک اور رات یاد آئی تھی۔ وہ اپنے ذہن میں اس کی تاریخ گڈمڈ کر چکے تھے۔ شاید وہ دسمبر اکہتر کی کوئی رات تھی یا جنوری یا فروری سن بہتر کی۔ کلثوم کا شوہر رات کو شراب پی کر دھت سویا ہوا تھا اور اقبال محمد خاں اسی کے گھر، اسی کے صوفے پر کلثوم کو اپنے پہلو میں لٹائے وسکی کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہے تھے جس پر بھٹو قوم سے خطاب کر رہا تھا۔

بھٹو کا ہاتھ قوم کی نبض پر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈھاکا فال کے بعد قوم دکھی ہے۔ یحییٰ خان سے اقتدار وصول کرنے کے بعد وہ ٹی وی پر آیا تھا تو کرسی پر سیدھا بیٹھنے کے بجائے ترچھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا ایک بازو ترچھی کی ہوئی کرسی کے آر پار لٹک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ قوم سے نہیں بلکہ ڈرائنگ روم میں کیژول بیٹھا اپنے دوستوں یاروں سے گپ شپ کر رہا ہو۔ کبھی وہ میز پر رکھی اپنی عینک کو گھماتا، کبھی اپنی کرسی پر اِدھر اُدھر گھومتا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ وہ سوتے سے اٹھ کر بغیر کنگھی کیے اپنے دوستوں یاروں سے ملنے آ گیا ہو۔ کرسی پر ترچھا بیٹھ کر ایسا ہی ایک خطاب بھٹو نے اُن دنوں بھی کیا تھا جب سن ستتر کے انتخابات کے بعد اس کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ بھٹو نے یہ سارا

اہتمام اس لیے کیا تھا تا کہ قوم کو یاد آجائے کہ اندر سے کتنا دکھی ہے۔ اتنا دکھی کہ اسے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے یا اپنی کرسی پر سیدھا بیٹھنے یا میز پر رکھی عینک کو دائرے میں نہ گھمانے کا خیال بھی نہیں رہا۔

وسکی کا تلخ گھونٹ حلق میں اترتا اور اقبال محمد خاں آنکھیں میچتے تو آنکھیں کھلنے پر ان سے وسکی ہی جیسے تلخ آنسو اُمڈ آتے۔ کلثوم اپنی سرگوشیوں میں انھیں "بالی، بالی" پکارتی ان کے سینے میں سر دے دیتی اور وہ ایک ہاتھ سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتے۔ اس رات بھٹو کی تقریر ختم ہونے کے بعد سیکس کرتے ہوئے انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے ٹینک سمیت بھارت کی سرحدوں میں اندر، بہت اندر تک گھسے چلے جا رہے ہوں۔ اور بھارت ان سے رحم کی بھیک مانگتا رہا تھا۔ "بس، بالی بس! خدا کے لیے بس! خدا! خدا! خدا! خدا! خدا!..."

سلطانہ اسی کلثوم کی بھانجی تھی۔

6

سلطانہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب کی بیٹی تھی اور اس سے شادی کے بعد کے چھ سات سال اقبال محمد خاں کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ اقبال محمد خاں تو اس سے بہت مطمئن تھے لیکن سلطانہ کو جلد ہی ان کی اِدھر اُدھر منھ مارنے کی عادت کا پتا چل گیا تھا اور وہ اس پر سخت ناراض ہوئی تھی۔ اقبال محمد خاں نے بہتیرا کہا کہ ان کارروائیوں سے ان کی محبت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو انھیں سلطانہ سے تھی اور یقیناً تھی، لیکن سلطانہ مطمئن نہ ہوئی۔ سنی سنائی باتوں اور چھوٹے موٹے ثبوتوں پر دونوں کی کئی مرتبہ لڑائی بھی ہو چکی تھی لیکن آخر ایک روز اس نے انھیں ایک ایس پی کی بیوی کو چومتے چاٹتے ہوئے دیکھا تو اپنے بیٹے جاوید کو ساتھ لیا اور کراچی سدھار گئی۔ کراچی میں اسے اپنے باپ کے ترکے میں ایک مکان ملا ہوا تھا۔ اس کے باپ کی باقی ماندہ جائیداد پر اس کے بھائیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور جائیداد کا سب سے تھکا ہوا حصہ اسے عنایت فرما دیا تھا۔ بعد میں وہ اپنا مکان بیچ کر گلشن اقبال شفٹ ہو گئی۔ یہاں اسے اقبال محمد خاں کے ساتھ بتائے ہوئے پل اور محفلیں یاد تو بہت آتیں لیکن وہ اقبال محمد خاں کی یہ دلیل تسلیم کرنے پر کبھی خود کو آمادہ نہیں کر سکیں کہ وہ جہاں مرضی منھ مارتے رہیں لیکن محبت انھیں صرف سلطانہ ہی سے تھی۔

سلطانہ کے جانے کے بعد اقبال محمد خاں کو اس کی کمی کا شدت سے احساس ہوا۔ کوئی عورت انھیں ایسی مکمل نہ ملی جو سلطانہ کی یاد ان کے دل سے محو کر دیتی۔ اس کے جانے کے بعد انھوں نے کچھ ماہ تو اپنی رومانی مہم جوئی کی رفتار میں اضافہ کیے رکھا، لیکن جلد ہی انھیں احساس ہوا کہ یہ بھی ایک لایعنی کام تھا جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے تیس برس صرف کیے۔ اسی لایعنی کام کے سبب وہ اپنے بچوں کو اپنے سامنے بڑا ہوتا دیکھنے کی مسرت سے محروم ہو گئے تھے۔ آفتاب اقبال اب ایک پروفیسر تھا اور پچھلے اٹھارہ برسوں میں کبھی اس سے ملاقات ہو بھی جاتی تو چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ کوئی شکوہ تک نہ کرتا۔ انھیں پتا تھا کہ وہ بھی اپنی ماں کی طرح غیور ہے۔ اس نے اپنی ماں اور تین بہنوں کی دیکھ بھال میں پوری طرح حصہ لیا تھا اور بہنیں بھی اب اسی کو اپنا سب کچھ سمجھتی تھیں۔ اقبال محمد خاں چاہتے تھے کہ طلاق کے بعد امۃ الکریم اور اپنے بچوں کو نان و نفقہ دیتے رہیں لیکن ضدی اور غیور امۃ الکریم نے اس سے انکار کر دیا تھا۔

لیکن صحیح معنوں میں وہ مس اگر کسی کو کرتے تھے تو سلطانہ ہی کو کرتے تھے۔ وہ بیوی بھی تھی اور ایک اچھی دوست بھی۔ ادب، محفل آرائی، بحث مباحثہ، ان کی دلچسپی کے ہر کام میں بھرپور دلچسپی لینے والی اور پھر بستر پر نت نئی اختراعات کے لیے ہر دم آمادہ اور ایک ایسی ساتھی جو نہ ان سے دبتی تھی نہ ان پر حاوی ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ ان کی حقیقی متقابل۔ انھی کا فیمیل ورژن۔

انھوں نے جان لیا تھا کہ ان کی زندگی میں چاہے جتنی بھی عورتیں آئی ہوں، لیکن محبت انھیں صرف سلطانہ سے ہی ہو پائی تھی۔ انھوں نے سلطانہ کو پھر سے اپنے پاس بلانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن سلطانہ ان کی 'بے وفائیاں' بھولنے پر بالکل آمادہ نہیں ہوئی۔ تاہم اقبال محمد خاں نے اس کے بار بار کہنے کے باوجود اسے طلاق نہیں بھجوائی تھی، حالانکہ اسی کے کہنے پر انھوں نے اپنے چار بچوں کی ماں کو طلاق دینے سے گریز نہیں کیا تھا۔ دو مہینے پہلے ہی انھوں نے سلطانہ کے ساتھ ایک دن گزارا تھا۔ جاوید اقبال اے لیولز کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ سلطانہ کوئی بیالیس سال کی تھی اور اس کے جسم پر فربہی کے ابتدائی آثار کے باوجود انھیں اس کے حسن و جمال میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ رات کو وہ بہت گرمجوش ثابت ہوئی تھی اور اس کے بعد واپس ان کے ساتھ چلنے کا ذکر چھڑنے پر اس نے ان کی پیشانی پر پڑے بالوں میں انگلیاں گھماتے اور مسکراتے ہوئے انھیں بتایا تھا کہ صبح بات ہوگی۔ لیکن صبح

وہ پھر سے اپنے پرانے روپ میں نظر آئی۔ اس نے کہا کہ اب وہ اس لیے بھی ان کے ساتھ نہیں جا سکتی کیونکہ وہ جاوید کو کراچی ہی میں تعلیم دلانا چاہتی ہے اور اسی کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ سلطانہ کے ساتھ گزارے ہوئے اس ایک دن کا ذائقہ ان کی زبان پر تازہ تھا اور انھیں امید تھی کہ وہ جلد اس کے ساتھ رہ سکیں گے۔ اگر سلطانہ خود ان کے ساتھ رہنے نہ آئی تو وہ خود دو سال بعد ریٹائر ہوں گے تو کراچی چلے جائیں گے اور سلطانہ کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ اب وہ اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ رومانی مہم جوئی سے بھی ریٹائر ہو چکے ہیں، ایسا انھوں نے سوچا تھا۔

7

سلطانہ سے ان کی ملاقات ایک شادی کی تقریب میں ہوئی تھی۔ سلطانہ کی ماں کو کلثوم سے ان کی دوستی کا علم تھا مگر اس کی حدود کا اندازہ نہیں تھا۔ اقبال محمد خاں پہلے بھی سلطانہ کو دیکھ چکے تھے۔ ان دنوں وہ پورے قد کی ایک دبلی پتلی لڑکی تھی جو شاید دسویں میں پڑھتی تھی، مگر چھ برسوں میں اس کے حسن پر خوب نکھار آ چکا تھا۔ اب انھیں ملوایا کسی اور نے نہیں، خود سلطانہ کی ماں نے تھا۔ وہ 1978 کی ایک رات تھی۔ محفل میں ذوالفقار علی بھٹو کو لاہور ہائی کورٹ کی جانب سے پھانسی کی سزا دینے کے فیصلے پر بات ہو رہی تھی۔ اس فیصلے کو لوگ اہمیت تو بہت دے رہے تھے لیکن کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ بھٹو کو واقعی پھانسی دے دی جائے گی۔ اقبال محمد خاں کا خیال تھا کہ حکومت اس فیصلے کو بھٹو سے گفت و شنید میں بارگیننگ چپ کے طور پر استعمال کرے گی۔ انھی باتوں کے دوران سلطانہ کی ماں چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور اپنی بیٹی سے ملوایا۔ سلطانہ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور اقبال محمد خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔ اس کا انھیں یوں غور سے اور اعتماد سے دیکھنا اقبال محمد خاں کو بہت چیلنجنگ لگا۔ سلطانہ نے اس روز ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سلطانہ نے ساڑھی کا پیٹی کوٹ اپنی ناف سے اوپر ہی باندھا ہوگا لیکن سانس کے آنے جانے سے اس کی ناف پیٹی کوٹ سے باہر نکل آئی تھی جس پر اس کا آنچل پڑا تھا۔ اقبال محمد خاں اس کی پُر اعتماد نظروں کے مقابلے میں اپنی نظریں جھکا کر مودب ایلنڈر کا کردار ادا کرتے رہے لیکن اس دوران ان کی نظر سلطانہ کے پیٹی کوٹ کے کنارے پر ابھرتی ڈوبتی ناف پر رہی۔ اس کی ناف خالی سیپی کے منھ کے اندرونی حصے کی طرح تھی اور اس کے چوڑے اور

قدرے ابھرے ہوئے پیٹ میں اس کا اندر باہر ہونا بہت جادوئی لگ رہا تھا۔ لان میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور مصنوعی روشنیوں کی قوت اس کے مقابلے میں ماند پڑی جاتی تھی۔ اقبال محمد خاں اور سلطانہ چلتے ہوئے کچھ دور آ نکلے۔ سلطانہ لاہور میں ایم اے کر کے فارغ ہوئی تھی۔ انگریزی اخباروں میں مضامین بھی لکھتی تھی اور اسے فیض بھی پسند تھے۔ اقبال محمد خاں کی حوصلہ افزائی پر اس نے ہلکی سی آواز میں ''مجھ سے پہلی سی محبت...'' گنگنائی۔ اس کی ماں پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے بتایا کہ سلطانہ کو رقص کا بھی شوق ہے، جس پر سلطانہ کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور اس نے اپنی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ اس انکشاف پر احتجاج کیا۔

''آپ کی گلوکاری تو بہت خوب رہی۔ پتا نہیں ہم کبھی آپ کا رقص دیکھ سکیں گے یا نہیں،'' اقبال محمد خاں نے اپنی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اسے کہا تھا۔

''اس کے بجائے آپ بھالو ڈانس دیکھ لیں،'' سلطانہ نے شوخی سے کہا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ میں اتنی موٹی ہوں۔''

''نہیں۔ اتنی موٹی تو نہیں،'' اقبال محمد خاں نے اس کے پیٹ اور کولھوں پر سے نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

اس کے ہونٹوں سے زندگی سے ابلتا ہوا قہقہہ طلوع ہوا اور اقبال محمد خاں کو اندازہ ہو گیا کہ ان کی زندگی میں یہی وہ کمی تھی جسے وہ محسوس تو جانے کب سے کر رہے تھے لیکن جس کا نام انھیں آج ہی معلوم ہوا تھا: سلطانہ۔

8

عورتوں میں مردوں کو کیا نظر آتا ہے؟ ایک عورت سے دوسری عورت مختلف کیسے ہوتی ہے؟ ایک عورت میں ایسا کیا ہوتا ہے جو دوسری عورت میں نہیں ہوتا؟ یہ ایسے سوال ہیں جو امۃ الکریم اکثر اپنے آپ سے کرتی تھی۔ اگر اقبال محمد خاں انھیں بتا سکتے تو بتاتے کہ فرق واقعی بظاہر کوئی ایسا غیر معمولی نہیں ہوتا، لیکن آدمی بعض اوقات کسی معمولی وجہ نے بھی کسی معاملے میں گھٹنوں گھٹنوں ملوث ہو جاتا ہے۔

اب سلطانہ ہی کو لیجیے۔ شکل و صورت میں وہ امۃ الکریم سے زیادہ اچھی تو کسی طرف سے بھی نہیں تھی۔ امۃ الکریم سے عمر میں چودہ برس کم ہونے کے باوجود اگر دونوں کو تول کر دیکھا جاتا تو امۃ الکریم کا وزن اپنی رقیبہ سے کچھ کم ہی نکلتا۔ لیکن سلطانہ کے ترشے ہوئے بال، ان بالوں کو چہرے سے ہٹانے کا انداز، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا، اقبال محمد خاں کی دلچسپیوں میں دلچسپی لینا اسے امۃ الکریم پر سبقت دلا گیا تھا۔ اور ہاں، اس کا ساڑھی پہننا بھی تو۔

اقبال محمد خاں کو ساڑھی ویسے بھی بہت پسند تھی۔ ساڑھی کے بارے میں انھوں نے ایک پورا فلسفہ گھڑ رکھا تھا جس کا وہ مردوں کے علاوہ اپنی دوست قسم کی خواتین کے روبرو بھی بلا تکلف اظہار کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ساڑھی دنیا کا واحد ایسا لباس ہے جو نسوانی جسم کے ہر ہر حصے کو الگ الگ باب کی صورت میں سمجھاتا ہے۔ پیٹی کوٹ، کھلی ہوئی ٹانگوں کو سمیٹ کر جوڑ دیتا ہے۔ بلاؤز اور پیٹی کوٹ کے درمیان پیٹ باوقار طریقے سے کسی آنچل سے ڈھک جاتا ہے۔ بلاؤز کی کسی کسائی بانہوں میں بانہیں پھنس پھنسا جاتی ہیں۔ بائیں کہنی پر ساڑھی کا ایک پلو دھرا ہو تو وہ کیسی خوبصورت لگتی ہے اور دایاں ہاتھ اور کہنی چہرے سے بالوں کو ہٹانے کے کام آتی ہے۔ رہی کمر تو وہ اگر بدصورت ہو تو بلاؤز سے چھپا لیں اور خوبصورت اور بے داغ ہو تو بلاؤز کا پچھلا حصہ چھوٹا کرتے کرتے بس ایک ڈوری تک محدود کر دیں۔ اس پر جمال لباس میں سے نکلا ہوا چہرہ کسی تاج کی طرح سجا ہوا لگتا تھا۔

پچیس سالہ سلطانہ اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں سے زیادہ ہری بھری تھی۔ کبھی اس زمانے کی مشہور چوڑے پائنچوں والی پینٹ پہنتی تو اس کے نسبتاً بھاری کولھے تھوڑے سے وافر محسوس ہوتے، لیکن ساڑھی میں تو اس کے جسم کا یہ غیر متوازن حصہ بلا کا متوازن لگتا۔ رہا اس کا ذرا سا پھولا ہوا پیٹ، تو ساڑھی دنیا کا شاید واحد لباس ہے جو نسوانی پیٹ کو اتنے جمال آفریں انداز میں پیش کرتا ہے۔ سیاہ، ہری اور گلابی ساڑھیوں سے جب اس کا میدے جیسا رنگ نکھر کر نکلتا تو اقبال محمد خاں کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگتے تھے۔

9

امۃ الکریم کو رقص سے دلچسپی خاک ہوتی تھی، انھوں نے تو کبھی ساڑھی بھی زیب تن نہیں کی تھی۔

اقبال محمد خاں کے کہنے پر انھوں نے ان کی لائی ہوئی ساڑھی پہنی تو ضرور، لیکن گھر سے باہر اسے پہن کر جانے سے صاف انکار کر دیا۔ جب کہ اقبال محمد خاں کا خیال تھا کہ ساڑھی تو ہے ہی ایک مجلسی لباس۔ گھر کے اندر کسی نے ساڑھی پہنی تو کیا پہنی۔ امۃ الکریم تو گھر سے باہر حجاب کے بغیر بھی نہیں نکلتی تھیں، اور محفلوں سے بھی دور ہی رہتی تھیں۔

سلطانہ میں اقبال محمد خاں کی دلچسپی یک طرفہ ثابت نہ ہوئی۔ ویسے بھی انھوں نے آج تک کوئی یک طرفہ کھیل کھیلا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ انھیں ایک ایسی عورت لگی جس کے ساتھ وہ پوری زندگی بتا سکتے تھے۔ وہ بہت زندہ دل تھی اور اقبال محمد خاں جو زندگی کے بہت سے شعبوں میں دلچسپی رکھتے تھے، ان میں بہت دلچسپی لیتی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایک روز سلطانہ کی ماں نے انھیں اپنے گھر بلایا۔ اس کے والد اس روز 'اتفاقاً' گھر سے باہر تھے۔ سلطانہ نے انھیں اپنا رقص دکھانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ جب اس کی ماں کھانا بنانے کچن گئی تو اس نے کیسٹ پلیئر پر ''تھاڑے رہیو'' گانا لگایا اور اس پر ایسے سج سج کر رقص کیا کہ اقبال محمد خاں دیکھتے ہی رہ گئے۔ گانے کی موسیقی پر وہ ہولے ہولے کولھا مٹکاتی اور بول کی مناسبت سے آنکھوں سے اشارے کرتی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ شرما کر اپنا رقص روک دیتی اور ہنستے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اپنے منھ پر رکھ دیتی مگر اقبال محمد خاں کی حوصلہ افزائی پر پھر سے ناچنے لگتی۔ اقبال محمد خاں دم بخود دیکھتے رہے اور جب گانا ختم ہوا تو اٹھے تو داد کے بہانے سلطانہ سے بغل گیر ہو گئے۔

10

''میرا خیال ہے اب ہم زیادہ دن ساتھ نہیں رہ سکتے۔''

اقبال محمد خاں نے چھٹی کی ایک صبح امۃ الکریم سے بات چھیڑی تھی جب بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ ان کے ازدواجی تعلقات کئی روز سے منقطع تھے اور اقبال محمد خاں کو جب ضرورت پڑتی تو وہ چہرے پر سنجیدگی سجائے، بغیر کچھ کہے سنے امتل کو گرا لیا کرتے تھے اور وہ بڑی تابعداری سے اپنے حصے کا تعاون کرتیں اور چھت پر نظریں گاڑے وقت پورا ہونے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔

''میں نے اس سے آپ کے ملنے پر کبھی اعتراض تو نہیں کیا؟'' امتل نے اپنے کام میں مصروف، نظریں کہیں اور جمائے ہوئے کہا تھا۔

''کس سے؟''

''سلطانہ سے۔''

''ہوں۔'' اقبال محمد خاں کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے:

''لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ میری پوسٹنگ منڈی بہاء الدین ہو رہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اب تم یہیں راولپنڈی میں رہو۔''

''اور بچے؟'' امۃ الکریم کو ان کی بات پر پہلا خیال اپنے بچوں کا ہی آیا تھا۔

''ہاں، وہ بھی یہیں رہیں گے۔ یہاں پڑھائی اچھی ہے اسلام آباد میں۔''

اقبال محمد خاں یہ کہہ کر باہر نکل گئے تھے۔ بعد کے مراحل زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوئے تھے۔ دونوں کے ازدواجی تعلقات پہلے ہی سے منقطع تھے۔ امۃ الکریم کو پتا تھا کہ ایک روز یہ سب کچھ ہونا ہی تھا، اس لیے اس نے بڑے وقار کے ساتھ سب کچھ قبول کر لیا تھا۔ لیکن علیحدگی کے بعد اس نے اقبال محمد خاں کے کہنے کے باوجود ان سے جیب خرچ لینے سے انکار کر دیا۔ ان کے بچوں نے بھی اس موقف میں ان کا ساتھ دیا۔ آفتاب اقبال نے تو اپنے والد سے بول چال بھی بند کر دی۔ اگر کوئی سوال کیا جاتا تو اکھڑ کر جواب دیتا یا اٹھ کر باہر چلا جاتا۔ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہونے کے باوجود اس نے دوسرے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی تھی۔ امۃ الکریم بھی ایک اسکول میں ملازم ہو گئی۔ چھوٹی لڑکی عائشہ ان سے مانوس تھی۔ اپنی ماں کی جانب سے کوئی بات کرنا ہوتی تو پیغام رسانی وہی کرتی۔ انھیں فون بھی وہی کرتی اور وہ اس کے لیے چاکلیٹس اور دوسرے تحفے بھی بھیجتے تھے۔ لیکن پھر یہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ اقبال محمد خاں کے چار بچے بالآخر ان سے جذباتی طور پر کٹ کر رہ گئے۔ ان کی زندگی کے ستر و سال ان کے گھرانے کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے۔

11

اس روز جمعرات تھی اور ان دنوں جمعرات کو ہاف ڈے ہوا کرتا تھا۔ اقبال محمد خاں جلدی گھر آ گئے تھے۔ قیلولے کے بعد وہ نہا دھو کر غسل خانے سے نکلے تو عالمگیر ان کے بیڈ روم کے ایک جانب الماری کے ساتھ زمین پر بیٹھی تھی۔

''تم کب آئیں؟ زمین پر کیوں بیٹھی ہو؟ کتنی بار تمھیں کہا ہے کہ ایسے زمین پر نہ بیٹھا کرو، کرسی پر بیٹھا کرو۔''

ان کے ابتدائی دو سوالوں کے جواب شاید عالمگیر نے نامطلوب سمجھے اور بس مسکرا کر ہی رہ گئی۔

''شوکت کدھر ہے؟''

''وہ لیدھر گیا ہے۔ اپنے مامے کے پاس۔ اس کے مامے کی دھی کا وہاں کسی سے چکر چل رہا ہے۔''

''چکر چل رہا ہے؟ یہ محبت کرنے والوں سے تم لوگ اتنی نفرت کیوں کرتے ہو؟''

عالمگیر نے ان کے سوالوں کے جواب اس مرتبہ بھی نامطلوب سمجھے اور اقبال محمد خاں کی آنکھوں میں مسکراہٹ دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے بیڈ کی جانب لے گئے اور اس کی کمر ٹٹولنے لگے۔

وصال کے دوران انھوں نے اس سے کہا کہ تم کچھ موٹی ہوتی جا رہی ہو۔ اس پر عالمگیر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی شرما گئی۔

''وہ جی، میرا کاکا ہونے والا ہے،'' اس کے جواب پر اقبال محمد خاں کا ماتھا ٹھنکا لیکن انھوں نے کارروائی جاری رکھی۔

''کب پتا چلا تمھیں؟''

''اس بار میں بیمار نہیں ہوئی۔''

تمھیں جو گولیاں دی تھیں وہ تو استعمال کر رہی ہو نا؟''

عالمگیر نے سر مزید جھکا لیا اور بولی، ''ان سے میری طبیعت بھاری ہو جاتی تھی، اس لیے چھوڑ دیں جی۔''

اقبال محمد خاں اسے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھتے رہے۔

12

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ انھوں نے سگریٹ سلگایا، الماری سے وسکی کی بوتل نکالی اور ایک پیگ بنایا۔ وہ عالمگیر کی اس تازہ مصیبت کا کوئی حل سوچنے لگے۔ فوری حل یہی سمجھ میں آتا تھا کہ بچہ

ضائع کرا دیا جائے، لیکن اس میں امکان تھا کہ شوکت کو شک ہو سکتا تھا۔ لیکن کیا وہ ایک ایسے بچے کی جان لے سکتے تھے جس میں جان پڑ چکی تھی؟ اقبال محمد خاں کو اپنے بچے یاد آئے اور انھوں نے فوری طور پر یہی سوچا کہ عالمگیر کا ابورشن کرانا ان کے لیے کوئی آسان فیصلہ نہیں ہوگا۔ مگر اب ان کی سوچ کا دھارا کسی اور طرف بہنے لگا اور انھوں نے اس، شاید فوری طور پر حل طلب، مسئلے کو فی الوقت حل کیے بغیر ہی چھوڑ دیا۔

انھیں اپنے بچے یاد آنے لگے۔ امۃ الکریم سے ان کے چار بچے اور سلطانہ سے ایک، جاوید اقبال۔ میں نے بچوں کی پرورش کا حق ادا نہیں کیا، وسکی کے ہلکے ہلکے سرور کو اپنے سر کی مہین رگوں میں محسوس کرتے ہوئے انھوں نے سوچا۔ پھر انھیں اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ مرادآباد کی ریلوے کالونی میں ان کا گھر تھا۔ لیکن ابا پولیس میں تھے۔ ایک عیدگاہ تھی جس میں وہ لوگ عید کے دن نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ سر پر نئی ٹوپیاں رکھے وہ ابا کے ساتھ نکلتے تھے۔ دونوں چوڑی دار پاجامے اور کڑھائی والے کرتے میں ملبوس ہوتے اور ابا کے بہت سارے جاننے والوں سے عید ملتے۔ ابا کے جاننے والے کتنے زیادہ تھے۔ عیدگاہ کے باہر دکانیں سجی ہوئی ہوتیں۔ وہاں بدایوں کے پیڑے بھی بکتے تھے۔ وہ ابا سے ان کی خاص طور پر ضد کیا کرتے تھے۔ ریلوے کالونی کے پیچھے ریل کی پٹڑی تھی جس کے قریب کھڑے ہو کر اقبال محمد خاں آتی جاتی ریل گاڑیوں کو دیکھا کرتے تھے۔ پاں ں ں ں ں... پاں پاں پاں پاں... چھک چھک چھکا چھک... کتنی سہانی آوازیں تھیں ان کی۔ اور دریا پر لوہے کے پل سے گزرتے ہوئے کڑرم رم کڑرم، کڑرم رم کڑرم، کڑرم رم کڑرم... ٹرین کی آواز میں اتنی موسیقیت کیوں ہوتی ہے؟ انھوں نے سوچا اور انھیں مہدی حسن کا خیال آ گیا۔ انھوں نے ٹیپ ریکارڈر میز پر رکھا اور اس میں مہدی حسن کا کیسٹ لگا دیا۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے... چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے...

خیال سے دوسرے خیال تک سفر کرتے ہوئے اب انھیں سلطانہ یاد آنے لگی۔

"سلطانہ، میں سیکس کا آدمی نہیں ہوں۔ محبت کا آدمی ہوں،" انھیں سلطانہ سے آخری بار کراچی میں ہونے والی اپنی بات یاد آ گئی۔ سلطانہ نے ان کی بات کا اب بھی یقین نہیں کیا تھا۔ انھوں نے سلطانہ سے شادی کے بعد بس دو تین ہی شرارتیں کی تھیں۔ امۃ الکریم سے شادی کے دوران انھوں نے

بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے، لیکن سلطانہ سے محبت کی شادی کے بعد انھوں نے یہ معرکہ آرائیاں ترک کر دی تھیں اور بس کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر ایک سرد آہ ہی بھر لیا کرتے تھے۔ اور اس ایس پی کی بیوی سے تو ان کا کوئی خاص تعلق تھا بھی نہیں۔ وہ خود ہی ملتفت تھی اور اس روز جب وہ اسے اپنی کتابیں دکھا رہے تھے تو ان کے بہت قریب ہو رہی تھی۔ آخر جب اس کا ہاتھ ان کے زانو سے ٹکرائے ہوئے اتنی دیر ہو گئی کہ انھیں اس کی نیت پر اعتبار آ گیا تو وہ پلٹے تھے اور انھوں نے اسے بانہوں میں بھر کر گال پر چٹاخ سے بوسہ دے دیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب سلطانہ کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اقبال محمد خاں ہکا بکا رہ گئے تھے۔ وہ عورت تو فوراً چلتی بنی تھی اور اقبال محمد خاں بہت دیر تک سلطانہ کو دلاسا دینے کی کوشش کرتے رہے تھے جو کچھ بولے بغیر بے تحاشا روئے چلی جا رہی تھی۔

کیسٹ کی دوسری غزل میں مہدی حسن گا رہے تھے:

چارہ گری بیماریِ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں... رسمِ شہرِ حسن نہیں...

ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے...

ان کے دل میں درد کی ایک لہر تیرتی چلی گئی۔ وہ کئی مرتبہ یہ شعر ریوائنڈ کر کے سنتے رہے اور پھر کیسٹ بند کر دی۔ انھوں نے وسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور ایک تلخی انھیں اندر تک کاٹتی چلی گئی۔

سلطانہ، تم نے مجھے مکمل کر دیا تھا۔ تمھارے بعد مجھے کہیں اور منھ مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو اس دن بس ایسے ہی موقع لگا تو میں نے... یار، اس کی اہمیت ہی کیا ہے! محبت تو تمھی سے کرتا تھا، اور کرتا ہوں۔ تمھارے لیے میں نے اپنی پوری پچھلی زندگی چھوڑ دی تھی۔ بیوی اور چار بچے۔ بیوی جیسی بھی لگتی ہو، بچے تو مجھے بہت پیارے تھے، اور ہیں۔ اور تم کہتی ہو کہ جیسے میں نے دوسری شادی کی ویسے ہی تیسری شادی بھی کر سکتا ہوں؟ سلطانہ I am not a fucking bastard، جب تم چلی گئیں تو اس کے بعد بھی میں نے جو کچھ کیا تمھاری جدائی کے درد سے بے قرار ہو کر ہی کیا... اقبال محمد خاں وسکی کے سرور میں سوچے چلے جا رہے تھے۔ پھر وہ اپنی الماری کی جانب بڑھے اور اپنی پرانی ڈائریاں کھنگالنے لگے۔ سن پچھتر، چھہتر، ستتر کی ڈائریوں سے انھیں زیادہ ہی محبت تھی۔ کیلنڈر والی ان ڈائریوں میں ان کے مختلف اندراجات تھے۔ انھوں نے اور سلطانہ نے مل کر جو فلمیں دیکھی تھیں ان کے نام اور ان پر چھوٹے چھوٹے تبصرے ان میں لکھے تھے۔ سلطانہ کے ساتھ فلم دیکھنے کا مزہ ہی الگ تھا۔ وہ

مختلف کرداروں پر ایسا شوخ تبصرہ کرتی تھی کہ اقبال محمد خاں کو ان میں سے کچھ فلمیں اب ان تبصروں کی وجہ سے یاد تھیں۔ فلم کلیوپیٹرا دیکھ کر سلطانہ نے کہا تھا کہ اس میں کلیوپیٹرا کا کردار الزبتھ ٹیلر کو نہیں صوفیہ لورین کو ادا کرنا چاہیے تھا۔ سلطانہ نے شیکسپیئر کا ڈراما پڑھا ہوا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ صوفیہ لورین کے تیکھے نین نقش کلیوپیٹرا کے کردار کے لیے زیادہ مناسب تھے۔ اقبال محمد خاں کو خود بھی صوفیہ لورین بہت پسند تھی مگر سلطانہ نے ایک نئی بات کر دی تھی جس کی طرف بڑے بڑے فلمی نقادوں کا ذہن نہیں گیا تھا۔ ڈائری میں جہاں کلیوپیٹرا فلم کا تذکرہ تھا وہاں انگریزی کے دو مصرعے بھی لکھے ہوئے تھے۔ وہ سلطانہ کی ہینڈ رائٹنگ تھی۔ وہ بہت نزاکت کے ساتھ حرفوں کو پھولوں سے بھری بیلوں کی طرح بنا بنا کر لکھتی تھی۔ اس نے لکھا ہوا تھا:

Age cannot wither her, nor custom stale
Her infinite variety

ان کی سالگرہ کے دن بھی وہ انھیں ایک شعر نذر کرتی تھی۔ ڈائری میں جا بجا فیض کے شعر بھی لکھے ہوئے تھے۔ یہ انگریزی والی لائنیں لکھنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ اقبال محمد خاں سلطانہ کو 'بہت سی سلطانہ' کہا کرتے تھے۔ سلطانہ پوچھتی تھی کہ وہ انھیں 'بہت سی' کیوں کہتے ہیں، تو وہ بتاتے تھے کہ اس میں بہت سی پیاری پیاری عادتیں ہیں، اس لیے وہ ایک نہیں، بہت سی ہے۔ جس روز انھوں نے کلیوپیٹرا والی فلم دیکھی تھی اس رات سلطانہ کو یاد آیا تھا کہ شیکسپیئر نے بھی کلیوپیٹرا کے لیے ایسا ہی کچھ کہا ہوا ہے۔ اگلے دن اس نے شہر کی لائبریری سے شیکسپیئر کا ڈراما نکلوایا اور اس میں سے یہ لائنیں نکال کر اقبال محمد خاں کو سنائیں اور پھر ڈائری میں اپنی خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں تحریر کر دیں۔ Her infinite variety۔ ہاں اقبال محمد خاں بھی سلطانہ کو یہی کہنا چاہتے تھے کہ اس کے حسن و جمال میں ایک تنوّع، ایک ویرائٹی ہے جس کا شمار ممکن نہیں اور اسی لیے وہ 'بہت سی سلطانہ' ہے۔

مگر سلطانہ انھیں پہلے پہل کیوں پسند آئی تھی؟ وہ یاد کرنے لگے۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی کائنڈنیس تھی۔ ایک خاص قسم کی پر اعتماد کائنڈنیس۔ وہ سلطانہ کو بتایا کرتے تھے کہ اگر کوئی عورت خوبصورت نہ بھی ہو مگر اس کے چہرے پر ایسی رحم دلی اور دریا دلی ہو تو مرد اس سے ضرور متاثر ہو سکتا ہے۔ سلطانہ انھیں صرف عاشقہ کی نظروں سے نہیں دیکھتی تھی بلکہ عمر میں بہت چھوٹی ہونے کے

باوجود اس کی نظروں میں کچھ ماتا سی تھی۔ انھیں ایک اور فلم یاد آئی: تُرستانا۔ جس میں کیتھرین ڈنیو نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ فلم کے آخر میں وہ گھر کی بالکنی پر کھڑی ہوتی ہے اور نیچے سے ایک کسان لڑکا اسے دیکھتا ہے اور اس کے حسن سے سحر زدہ ہو کر اپنی جیکٹ کھول کر اس سے ایک معصومانہ سی فرمائش کرتا ہے۔ کیتھرین ڈنیو کے چہرے پر ایک الوہی قسم کی رحم دلی امڈ آتی ہے اور وہ اس کی فرمائش پوری کر دیتی ہے۔ لیکن اس امیج میں ایک عنصر طاقت کا بھی تھا۔ عورت کے حسن کی طاقت کا۔ رحم دلی مگر ساتھ ہی طاقت کا احساس۔ شاید ماتا اسی کو کہتے ہیں۔ طاقتور رحم دلی۔ ایسے آدمی کی رحم دلی جس کے بارے میں پتا ہو کہ وہ ظلم بھی کر سکتا ہے، قہر بھی برسا سکتا ہے۔ جیسے دیوتا ہوتے ہیں۔ جیسے خدا ہوتا ہے۔ ماتا بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ رحم دل مگر طاقتور۔ بیک وقت رحیم اور قہار۔ سلطانہ 'بہت سی' تھی اور اس 'بہت سی' میں ویسی ہی ماتا بھری رحم دلی بھی تھی اور ویسا ہی ماتا بھرا اعتماد اور طاقت بھی۔ سلطانا، تُرستانا، تُرستانا، سلطانا... وہ کچھ دیر دہراتے رہے۔ ہاں ہاں۔ سلطانا نے رحم دلی والی ماتا کے ذریعے مجھے جیتا اور پھر طاقت والی ماتا کے ذریعے مجھے چھوڑ گئی۔ مجھے کبھی نہیں لگتا تھا کہ سلطانہ کبھی مجھے ہرا پائے گی یا میں اسے اتنا مس کروں گا۔ محبت طاقت کا کھیل ہے جس میں بس ایک ایکٹ آف ریجیکشن سے ایک فریق دوسرے فریق پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ سلطانہ جب مجھے چھوڑ گئی تب مجھے معلوم ہوا کہ میں اسے کتنا چاہتا ہوں۔ امتل کی کمی ایسے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ بے چاری خود مجھے چھوڑ کر ایکٹ آف ریجیکشن نہیں کر سکی تھی۔ طاقت کے کھیل میں سلطانہ بازی مار گئی۔ اوہ یو سلطانا۔ Sultana the slut، اقبال محمد خاں نے اپنے ذہن میں یہ آخری فقرہ دو تین مرتبہ دہرایا۔ لیکن تھی مزے کی... وہ سوچتے رہے اور سگریٹ پھونکتے رہے۔ لیکن سلطانہ کی شکل ڈنیو سے مختلف تھی۔ ڈنیو کے رخساروں کی ہڈیاں ذرا باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور جی چاہتا تھا کہ ان کو انگلیوں سے محسوس کیا جائے اور ان پر ہلکی ہلکی ٹکیاں لگائی جائیں۔ ہاں کلثوم کے رخساروں کی ہڈیاں کچھ کچھ اسی طرح کی تھیں۔ ایک رات جب بھٹو قوم سے خطاب کر رہا تھا تو وہ صوفے پر لیٹے کلثوم کو اپنے پہلو میں لٹائے اس کے رخساروں کی ہڈیوں پر اسی طرح اپنی انگلی پھیر رہے تھے۔ کچھ امیج کیسے انسان کے ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ کلثوم ڈنیو کا امیج تھی۔ ہے نا؟ ویسے نہ بھی ہوتی تو میں نے کون سا اسے چھوڑ دینا تھا! اقبال محمد خاں سگریٹ پھونکتے ہوئے مسکرا دیے۔ بہت سی سلطانہ تو بہت سے امیجز کا مجموعہ تھی۔ اس کی آنکھیں ٹینا منیم کی آنکھوں

جیسی تھیں۔ آنکھوں میں اس کے قرنیوں کی پوزیشن اوپر کی سمت تھی اور اس کی آنکھیں ہر وقت کوئی سوال پوچھتی نظر آتی تھیں۔ سوال بھی کوئی معمولی قسم کا نہیں بلکہ اس قسم کا کہ ہے کوئی ارادہ؟' اقبال محمد خاں پھر سے مسکرانے لگے اور اگلی سگریٹ سلگائی۔ لیکن عالمگیر کی شکل کس سے ملتی تھی؟ انھوں نے ذہن پر زور ڈالا کہ کس سے؟ شاید کسی فلم میں آنے والی کسی عورت سے، یا شاید ان کے بچپن کی کسی یاد سے۔ انھیں ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا۔ مگر اتنا طے تھا کہ کسی نہ کسی سے ملتی ضرور تھی۔ عالمگیر اچھی تھی مگر اس نے ایک بڑی بے وقوفی کر دی تھی۔ اس بے وقوفی کے تدارک کے لیے اب انھیں جلد ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ شاید یہ بہتر رہے گا کہ وہ شوکت کا تبادلہ کہیں اور کرا دیں اور عالمگیر کے لیے بیلے کا کوئی قطعہ اس کے نام کر دیں۔ مگر بچے کا کیا کریں؟ یکا یک ٹیپ ریکارڈر رک گیا۔ ان کے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ کی ایک سائیڈ ختم ہو جاتی تو ٹیپ ریکارڈر خود دوسری سائیڈ لگا دیتا تھا مگر اب کیسٹ کی ریل پھنس گئی تھی اس لیے ٹیپ ریکارڈر رک گیا تھا۔ اقبال محمد خاں نے کیسٹ نکالی اور ایک بال پوائنٹ پین کو کیسٹ میں پھنسا کر ریل درست کرنے لگے۔ مہدی حسن کی غزلوں، یادوں، سگریٹوں اور وہسکی کے سرور نے ان کی اداسی اور بڑھا دی تھی۔ انھوں نے چاہا کہ وہ ان سوچوں سے بچنے کے لیے کسی گہری نیند کی آغوش میں چلے جائیں۔ انھیں غنودگی محسوس ہو رہی تھی۔ رات کے نو بجے تھے اور اس چھوٹے سے شہر میں زیادہ تر لوگ بتیاں بند کر کے سو چکے تھے یا سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میز پر رکھی ایش ٹرے میں بہت سی سگریٹوں کے بٹ پڑے تھے اور بہت سی راکھ جمع تھی۔ میز پر وہسکی کا گلاس رکھتے ہوئے ان کی نظر وہیں رکھی ہوئی ڈائری پر پڑی۔ پین ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے ڈائری کھولی اور 18 نومبر 1992 کی تاریخ میں جا کر اس میں لکھا:

Why you had to do this Alamgir?

باب ششم

ستائیس دسمبر اور اس کے بعد

1

آفتاب اقبال

وقت کتنی تیزی سے تبدیل ہوتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یونیورسٹی کی لیکچررشپ سے میرا استعفیٰ اور پھر وکالت شروع کرنا ہی میری زندگی کا سب سے بڑا انقلاب ہوگا، لیکن زندگی نے میرے لیے کچھ اور حیرتیں بھی لکھ رکھی ہیں۔ دو مہینے پہلے سلمیٰ کا ایک ای میل آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے سلمان تاثیر کے قتل پر اخبار میں میرا مضمون پڑھا اور اسی پر درج ای میل ایڈریس نوٹ کر لیا۔ سلمیٰ کی یہ ای میل میرے لیے ایک خوشگوار سرپرائز تھا۔ اتنا خوشگوار کہ میں ایک لمحے کے لیے وہ سب بھول گیا جو اس نے میرے ساتھ کیا تھا۔ میرے اس مضمون کے بعد میرے ای میل ایڈریس پر ان ای میلز کا سیلاب آ گیا تھا جن میں کوئی گالی ایسی نہیں تھی جو مجھے نہ دی گئی ہو۔ میرے وہ وکیل دوست جن کے ساتھ مل کر ابھی تین سال پہلے میں پرویز مشرف کے خلاف جلوس نکالا کرتا تھا، مجھے دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ میں نے انھیں صرف یہ دلیل دی تھی کہ اگر کوئی وکیل توہینِ مذہب کے کسی کیس میں ملزم کی بریت کے لیے اس کی وکالت کرے تو کیا وہ وکیل خود بھی توہینِ مذہب کا مرتکب ہو جاتا ہے؟ سلمان تاثیر نے ایک ملزمہ کی وکالت ہی تو کی تھی، خود تو نہیں کی تھی مذہب کی توہین۔ پھر کسی مولوی نے اس کے قتل کا فتویٰ دینا تو درکنار، اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے مارنے کے بعد قاتل کو ہیرو بنا لینا کہاں کا انصاف ہے؟ لیکن کوئی میری بات سننے پر تیار نہ ہوا۔ ایک مرتبہ پھر میری مری ہوئی ماں کا مذہب ڈھونڈ نکالا گیا اور اسے میری فیس بک وال پر تھوک دیا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو اپنے ملک کے حساس معاملات پر تبصرے کا حق ہی نہیں رکھتا۔ میں تو کوئی غیر ہوں، کوئی پرایا ہوں، کوئی غیر ملکی ہوں۔ شناختی کارڈ بنوا کر ملک میں گھومنے والے افغانی مجھ سے بڑے پاکستانی ہیں۔ میں تو کوئی گھس

بیٹھیا ہوں جو اپنے ہی ملک میں نامطلوب ہے۔ جسے اس کے اپنے ہی لوگوں نے پرسونا نان گراٹا قرار دے دیا ہے اور جسے کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اپنی دھرتی کی صورت گری کے بارے میں اپنے خیالات پیش کر سکے۔ میں اپنے بھرے ہوئے میل باکس کو ہلکا کرنے کے لیے کئی میلو پرنگ کر رہا تھا جنھیں بلاک میں ڈیلیٹ کر سکوں۔ اچانک مجھے ایک ای میل پر "فرام سلمیٰ" لکھا نظر آیا۔ یہ نام پڑھتے ہی دل میں درد کی ایک ٹیس سی اٹھی اور میں نے وہ ای میل کھول لیا۔ اس ای میل کا پرنٹ آوٹ نکال کر میں اسے نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ یہ پرنٹ آوٹ اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے رکھا ہے:

Respected sir,

I have got your email address from your article about Taseer. I know you cannot forgive me after what I have done with you. But please bear with me till the end of this email at least.

First, let me congratulate you on your courageous stance on Taseer's murder. My understanding of Islam suggests that the Holy Prophet (PBUH) would have abhorred this act. You know about the woman who used to put garbage on him, but he forgave her.

I have gone through much introspection in the last five years. I couldn't forgive myself about what I did to you and I know I would not be able to remove this scar of remorse from my heart until you forgive me. I want to talk hours and hours to you but right now I don't know if you would read my email to the end or not. So for now I just want to tell you that I am doing a job as a lecturer in Lahore and am living at a hostel. I chose to live in Lahore so that I could live alone and struggle against my pain. This pain was better than living with my parents because this pain had your name engraved onto it.

Now I am financially independent and can take decisions on my own. I have refused to get married and my only wish is that someday I would be able to explain all the situation to you, talk to you, talk to you and.... talk to you.

I cannot write more sir, my eyes, my hands do not allow me to.

I wonder if you would send me your mobile number, as the previous number wont answer.

Your na farmaan shagird,
Umme Salma

ای میل پڑھتے ہوئے میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ای میل پڑھنے کے بعد میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سلمیٰ سے کبھی نفرت کر ہی نہیں سکا تھا۔

2

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مجھے آج سینٹ پیٹر کی کہانی یاد آئی جس کا ان دونوں معاملات سے بیک وقت تعلق ہے جن پر سے ایک پر میں نے کافی سوچ بچار کیا ہے اور دوسرا وہ جسے اس روز ہم کلاس میں ڈسکس کر رہے تھے جس روز سلمیٰ سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات ہوئی تھی۔ ایک تو تقدیر اور دوسرے حقیقت کی نمائندگی یا میمیسس۔ ہوا یوں کہ لاسٹ سپر کے موقع پر حضرت عیسیٰ کے تمام حواری جمع تھے کہ انھوں نے کہا کہ صبح مرغ کی بانگ دینے سے پہلے پہلے تم، پیٹر، مجھ سے تعلق کی تین مرتبہ تردید کر چکے ہو گے۔ پیٹر یہ سن کر حیران رہ گیا اور بولا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ حضرت عیسیٰ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ اسی رات حضرت عیسیٰ کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب انھیں بڑے پروہت کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا تو پیٹر بھی قریب ہی موجود تھا۔ ایک لڑکی اس کی سمت اشارہ کر کے بولی کہ یہ آدمی بھی عیسیٰ کے ساتھ تھا۔ ہڑبڑائے ہوئے پیٹر نے فوراً تردید کر دی۔ لڑکی نے پھر کہا، پیٹر نے پھر تردید کر دی۔ اس سے ایک بار اور پوچھا گیا تو اس نے تیسری مرتبہ تردید کی اور اس کے ساتھ ہی پیٹر کو مرغ کی بانگ سنائی دی۔ اسے یاد آ گیا کہ ابھی کل ہی حضرت عیسیٰ نے اس سے کیا کہا تھا۔ حضرت عیسیٰ سے پیٹر کا تعلق بہت قریبی تھا اور یہ ایک حقیقت تھی، لیکن پیٹر جیسا نیک بزرگ اس حقیقت کی تردید کرتے ہوئے حقیقت کی کون سی نمائندگی کر رہا تھا؟ شاید وہ عیسیٰ سے 'عدم تعلق' کو ایک نئی حقیقت بنانا چاہتا تھا تا کہ خود گرفتاری اور پھر حضرت عیسیٰ جیسے انجام سے بچ سکے۔ یہ جو لوگ ادھار مانگتے وقت کہہ رہے ہوتے ہیں کہ وہ اگلی تنخواہ ملنے پر واپس کر دیں گے تو وہ ایک ایسی حقیقت کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں جو اُس وقت کی حقیقت ہوتی ہے۔ لیکن جب تنخواہ مل جاتی ہے تو ان کے سامنے ایک نئی حقیقت کھڑی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اگر اس تنخواہ میں سے وہ ادھار کی رقم واپس کر دیں تو باقی مہینہ چلانا مشکل ہو جائے گا۔ سلمیٰ بھی جب مجھ سے دلچسپی کا اظہار

کر رہی تھی تو وہ اس میں سچی تھی۔ تب تک میری جو حقیقت اس کے سامنے آئی تھی اس کے ہوتے ہوئے اس کی محبت بھی سچی تھی؛ لیکن میرے بارے میں اچانک ایک اور حقیقت سامنے آنے پر اس کے اندر کی سچائی ایک اور سچائی میں تبدیل ہو گئی اور وہ جس آدمی کے ساتھ زندگی بتانا چاہتی تھی اب اس کے ساتھ زندگی گزارنا اسے ناممکن لگنے لگا۔ جب ایک اچانک افتاد پڑنے پر سینٹ پیٹر جیسا آدمی ڈگمگا گیا تو سلمٰی کیا چیز تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ نے پہلے ہی سے پیٹر کو بتا دیا کہ تقدیر میں کیا لکھا ہوا ہے۔ مجھے بھی یہ بات پہلے ہی سے معلوم تھی کہ ایک دن سلمٰی کو میرے بارے میں پتا چل جائے گا اور وہ مجھے کسی اور نظر سے دیکھے گی۔ اس بات کا مجھے احساس بھی تھا اور میں نے سوچا ہوا تھا کہ مناسب وقت پر اسے اپنی ای کے بارے میں بتاؤں گا۔ میرے اپنے خیالات کے بارے میں تو وہ جانتی ہی تھی، لیکن مجھے معلوم تھا کہ اپنے پس منظر سے اسے آگاہ کروں گا تو یہ کام بہت آسان نہیں ہوگا۔ میں نے یہ بھی طے کر رکھا تھا کہ اسے صاف کہہ دوں گا کہ یہ میرا ایس منظر ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ بس اچھے دوست رہیں اور اس سے آگے کی بات نہ سوچیں۔ زندگی بہت بڑی ہے۔ ہم باقی زندگی میں ایک دوسرے کا اور بھی بہت سے طریقوں سے خیال رکھ سکتے ہیں۔ یہ تھے میرے خیالات، لیکن وہ تقدیر جو میرے پس منظر کے باعث مجھ سے وابستہ ہے، پہلے ہی اپنا وار چل گئی۔ انسان زندگی میں جو کچھ حاصل کرتا ہے اپنی کوشش سے حاصل کرتا ہے، لیکن کچھ لوگ کسی نہ کسی ہینڈی کیپ کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ یہی ان کی تقدیر ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ ایک باشعور زندگی گزاریں، یا اقبال کے خیال کے مطابق اپنی 'خودی' کو شناخت کر لیں، تو وہ اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔ لیکن کچھ چیزوں کی مجھے اب بھی سمجھ نہیں آ رہی۔ سلمٰی مجھ سے بات تو کر سکتی تھی۔ لیکن میرے بارے میں ایک انکشاف کے بعد اسے مجھ سے ایسی نفرت ہوئی کہ وہ مجھ سے کوئی بات بھی نہ کرے؟ ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

3

آفتاب اقبال نے سلمٰی کو جوابی ای میل بھی کیا اور اسے اپنا موبائل نمبر بھی دیا۔ سلمٰی نے انھیں بتایا کہ ان کے بارے میں انکشاف اتنا عجیب تھا کہ اس نے پہلے اس امکان کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا، اس لیے وہ حیران رہ گئی تھی۔ آفتاب کے بار بار پوچھنے پر اس نے تسلیم کیا تھا کہ اسے اس

انکشاف کے بعد آفتاب کے بارے میں اپنے رومانی خیالات پر بے انتہا شرمندگی ہوئی تھی اور اسی لیے اس نے اپنے ابا کا فیصلہ تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں جب آفتاب نے اس کے ابو کی صرف زبانی دھمکی پر استعفیٰ دے دیا تھا تو اس کے دل میں آفتاب کی جگہ پھر سے پیدا ہو گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آفتاب نے استعفیٰ بزدلی کی وجہ سے نہیں دیا بلکہ اسے شرمندہ کرنے کے لیے دیا ہے۔ وہ شرمندہ تھی مگر پھر بھی آفتاب سے فوری نفرت پیدا ہو جانے سے اسے ایک بار پھر سمجھنے تک اسے کئی ماہ اپنے آپ سے مکالمہ کرنا پڑا تھا۔ اپنے گھر میں آفتاب اقبال سے اپنے والد کے سامنے کے دوران وہ خاموش تو رہی تھی لیکن اس پر وہ خود کو معاف کر سکی تھی نہ اپنے والد کو۔ بہر حال، سلمٰی اور آفتاب نے کچھ روز کی بات چیت میں ہی اپنی اپنی تشفی کر لی تھی۔ وہ دونوں ایک بار پھر موبائل پر لمبی لمبی باتیں کرنے لگے۔ سلمٰی گرمی کی چھٹیوں میں بھی پڑھنے یا پڑھانے کے لیے لاہور ہی میں کوئی کورس ڈھونڈ لیا کرتی تھی تا کہ اسے اسلام آباد میں اپنے والدین کے پاس کم سے کم آنا پڑے۔ اس نے لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کیا اور پہلے دو سال شیخوپورہ کے ایک کالج میں پڑھانے کے بعد لاہور آ گئی جہاں وہ ایک کالج میں پڑھاتی تھی اور ہوسٹل میں رہتی تھی۔ اس نے آفتاب کو بتایا کہ وہ ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد آ رہی ہے اور وہاں اس سے ملاقات کرنا چاہے گی۔ مقررہ وقت پر وہ مری چوک کے شمع ہوٹل پہنچی تو آفتاب وہاں موجود تھا۔ ساتھ کی کرسی پر اس کا کالا کوٹ ٹنگا تھا اور وہ اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹکائے بظاہر اپنی چائے کی پیالی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سلمٰی کے آنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سلمٰی نے اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ آفتاب نے اپنی انگلیوں سے اس کی ہتھیلی کو دبایا اور وہ سامنے بیٹھ گئی۔ دونوں نے محسوس کیا کہ موبائل پر ہونے والی گفتگو سے دونوں کی باتوں کی پیاس بڑی حد تک بجھ چکی ہے اور وہ دونوں اب بس ایک دوسرے کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی چوری پکڑتے تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی اور سلمٰی کبھی کبھار کھلکھلا کر ہنس دیتی۔

سلمٰی نے اپنے بال ترشوائے ہوئے تھے اور اس نے بیچ کی مانگ کے بجائے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف سے مانگ نکالی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی ویسی ہی تھیں، سوال کرنے والی۔ لیکن آنکھوں کے زیریں کنارے کے نیچے کچھ سلوٹیں بھی تھیں جن میں درد تہہ در تہہ بچھا ہوا تھا۔

4

"میرے والد فوت ہوئے تو ان کی عمر چوّن سال تھی۔ میری والدہ فوت ہوئیں تو ان کی عمر باسٹھ سال تھی۔ ان دونوں کا ایوریج نکالا جائے تو اٹھاون بنتا ہے۔ میری عمر سینتالیس سال ہو چکی ہے۔ تم مجھ سے کیوں شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"ایسی باتیں مت کیجیے۔ زندگی جتنی بھی ہے، تھوڑی ہے یا زیادہ ہے، اب مل جل کر گزارنی ہے۔ آپ کی کیئر میں کروں گی۔ آپ سو سال جییں گے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

"تم اپنی عمر کا کوئی آدمی کیوں نہیں ڈھونڈتیں؟ میرے سر کے بال سفید ہو رہے ہیں۔ اس عمر میں میں اچھا لگوں گا شادی کرتا ہوا؟"

"کوئی پرابلم نہیں۔"

"میں رومانٹک بھی نہیں۔ برڈیز، ویلنٹائن، گفٹس، آؤٹنگز، کسی چیز کا کچھ پتا نہیں مجھے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں ہوں نا۔"

"دیکھو، میری لائف اب ویسی کمفرٹ ایبل نہیں رہی۔ وکیل ہوں اور میری وکالت نہ چلی ہے نہ اس کے چلنے کا امکان ہے۔"

"کوئی پرابلم نہیں۔"

"یار، میں تو لڑتا آیا ہوں اور آگے بھی مجھے لڑنا ہے۔"

"مل کر لڑیں گے۔"

"اور اگر ہار گئے تو؟"

"تو ہماری اگلی نسلیں لڑیں گی۔"

اس آخری فقرے پر غور کرتے ہوئے دونوں مسکرا دیتے ہیں اور پھر سلمٰی کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہے۔

5

کچھ روز پہلے ہم لاہور میں ملے اور سلمٰی نے مجھے شادی کے بارے میں اپنے منصوبے کا بتایا۔ اس کا منصوبہ اس مرتبہ بھی اتنا انوکھا تھا کہ اس کی داد دینے کے لیے مجھے اس پر عملدرآمد کرنا ہی تھا۔ اس

نے ایک ایسی شادی کی تجویز پیش کی تھی جس میں صرف ہم دونوں کے کچھ مشترکہ دوست شریک ہوں۔ نہ دھوم ہو نہ دھڑکا۔ باقی معاملات طے ہو گئے تو وہ بولی:

"مگر میری ایک شرط ہے..." اس نے یہ کہتے ہوئے میز پر رکھے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"وہ کیا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"مولوی صاحب کا انتظام میں کروں گی،" اس نے کہا اور اس کی آنکھیں بڑی تشویش کے ساتھ میری آنکھوں میں جواب تلاش کرنے لگیں۔ میں کچھ سمجھ نہ پایا کہ فوری طور پر کیسے ری ایکٹ کروں اور بس کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ مجھے امی کی بات یاد آ گئی جو بتایا کرتی تھیں کہ ان کے والد صاحب نے میرے ابا کے والدین کے سامنے بھی یہی شرط رکھی تھی۔ "مولوی ہمارا ہوگا۔"

"لیکن پروپوز تو آپ نے کیا ہے ناں! شرط تو مجھے لگانی چاہیے۔ مولوی ہمارا کیوں نہ ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے مولوی سے آپ کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ آپ ان چیزوں سے بہت دور نکل آئے ہیں، مجھے پتا ہے۔ میں بھی پوری کوشش کروں گی کہ ایسی چیزیں اپنے ذہن سے نکال دوں،" وہ ملتجیانہ لہجے میں بول رہی تھی۔ "دیکھیے، آپ مائنڈ مت کیجیے گا۔ آپ کہیں گے تو میں آپ کے مولوی سے بھی نکاح پڑھوا لوں گی لیکن آپ جانتے ہیں کہ کوئی چیز میرے دماغ سے چپک جائے تو پھر چپکی ہی رہتی ہے۔ مجھے وسواس سا ہوتا رہے گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگی جو اس وقت یقیناً ناراضی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"میرا تو خیال تھا کہ ہم سول میرج کر رہے ہیں۔ اور اس میں کسی مولوی وولوی کی ضرورت بھی نہیں پڑتی؟"

"پھر بھی، جو بات میں سوچ رہی ہوں وہ اس وقت آپ نہیں سوچ رہے۔"

"میں تو سمجھتا تھا کہ ہم چرچ میں بھی شادی کریں تب بھی تمھیں قبول ہوگا،" میں نے اس سے کہا اور وہ چند لمحوں تک ویسے ہی ملتجیانہ انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتی رہی اور پھر اس کی ایک آنکھ سے بڑا سا آنسو ٹپکا اور اس کے رخسار کو بھگوتا چلا گیا۔ وہ اپنے پرس کی جانب متوجہ ہوئی اور اس میں سے ٹشو پیپر تلاش کرنے لگی۔

''لیکن تم کیا سوچ رہی ہو؟ یو نو آئی ایم اے ویری لوجیکل مین۔ گو می ریزنز!''
میں دیکھ سکتا تھا کہ اس نے بہت سے آنسو بڑی کوشش سے اپنی آنکھوں میں روک رکھے
تھے۔ اس کے بعد وہ رک رک کر ایسے بولنے لگی جیسے اسے اپنے مفہوم کے بیان میں جسمانی قوت بھی
صرف کرنی پڑ رہی ہو۔

''دیکھیے، ایک عورت جب گھر بساتی ہے تو اسے اپنے اردگرد کے لوگوں سے ایک ایکسپٹنس
چاہیے ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس نئے رول میں سب لوگ اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ میں نے
اپنے گھر والوں سے کٹ کر بہت بڑا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن میں نے ساری زندگی ان کے ساتھ گزاری
ہے۔ آئی نو فور شیور کہ وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ امی بھی، اور... ابو سخت ہیں لیکن وہ بھی۔ کبھی نہ کبھی،
کبھی نہ کبھی تو ایسا ہوگا کہ وہ ہمارے ساتھ ری کونسائل کر لیں گے۔ ان کے لیے کوئی نہ کوئی ایسا راستہ ہونا
چاہیے کہ وہ میری نئی زندگی کو ایکسیپٹ کر سکیں۔ آپ بہت سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ اینڈ آئی لو یو سو مچ
کہ اگر آپ شادی کے بغیر بھی مجھے رکھنا چاہتے تو میں انکار نہ کرتی۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے جوش اور جلال
سے اس کے گال تمتما اٹھے اور پیشانی پر بل سا پڑ گیا۔

''بٹ شادی کی بات کچھ ڈفرنٹ ہے۔ آپ سے یہ بات میں اس لیے کہہ پائی کیونکہ مجھے پتا
تھا کہ آپ چاہے ناراض بھی ہو جائیں لیکن آپ میرے وہموں کو، میری ان سینس فیکشن کو سمجھنے کی
کوشش کریں گے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ اون اے تھیوریٹیکل لیول ایسی بات کرنا مناسب نہیں تھی۔
اینڈ آئی ایم سوری فور دیٹ۔ رئیلی سوری فور دیٹ...'' اس کے بعد وہ کچھ لمحے خاموش رہی اور ٹشو پیپر
سے ان مزید آنسوؤں کو پونچھتی رہی جو اب اس کی آنکھوں میں رک نہیں پا رہے تھے۔ اس کے بعد اس
نے فیصلہ کن انداز میں ایک ٹھنڈی سانس بھری اور مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا:

''شاید میں ہی اپنے بیک لاگ سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہی۔ شاید آگے کی زندگی کے لیے جتنی
طاقت کی ضرورت ہے وہ مجھ میں ہے نہیں،'' وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔ وہ ایک عجیب سی تکلیف میں
تھی جسے دیکھ کر مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ میں اسے کمزور نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے دلاسا
دینے کے لیے اس کے ہاتھ تھامے تو اس کے بہت مشکل سے روکے ہوئے آنسو چھلک پڑیں گے۔ کچھ
نہ کرنے کے سبب وہ مجھے کچھ لاتعلق سا سمجھ رہی ہوگی۔ سو بولی:

''ٹھیک ہے۔ اس بارے میں آپ جو بھی فیصلہ کریں گے، مجھے قبول ہوگا۔''
میں نے اسے غور سے دیکھا اور پھر خاموشی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے اندر
ایک گہری اداسی کو محسوس کیا جس نے مجھے کوئی بھی بات کرنے سے روک دیا۔ مجھے قائداعظم یاد آ گئے۔
ان کی بیٹی دینا نے قائداعظم کے کہنے پر اپنے دوست کو مسلمان ہونے کا کہا تو اس نے انکار کر دیا تھا۔
میرے ابا اقبال محمد خاں تو حسن کے کھونٹے سے بندھ جاتے تھے۔ پھر یہ کھونٹا انھیں چاہے کہیں بھی لے
جاتا، چلے جاتے۔ وہ نانا کی شرط فوراً مان گئے تھے۔ ان کا نکاح احمدی مولوی نے پڑھایا تھا اور کچھ دیگر
شرائط بھی پوری کروائی تھیں۔

''وی ال تھنک اباؤٹ دیٹ،'' میں نے اسی اداسی میں کہا۔
میرے اس جواب کو اس نے جانے کیا سمجھا۔ ''اوہ تھینکس'' کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں
ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا اور اپنا چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپانے لگی۔ اس کے ہاتھ تپ رہے تھے۔
جب اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں چھلکی ہوئی تھیں۔

6

میں خود کو مسلمان سمجھتا ہوں، لیکن میرا فرقہ کون سا ہے؟ سلمیٰ کی جانب سے ''مولوی ہمارا ہوگا''
کے مطالبے نے یہ سوال میرے سامنے ایک مرتبہ پھر کھڑا کر دیا تھا۔ اس سوال کے جواب کو ٹالتے
ٹالتے میرے پچیس سال گزر چکے ہیں۔ جب ہر مذہب اکوئلی گڈ اور بیڈ ہے تو پھر میں مسلمان ہی
کیوں نہ رہوں، اپنے ماں باپ کے دین پر؟ لیکن میں کون سا مسلمان ہوں؟ سنی، شیعہ یا احمدی جو
مسلمانوں کا جنازہ نہیں پڑھتے اور جنھیں دوسرے مسلمان کافر قرار دیتے ہیں۔ میرے والد صاحب
نے مذہب کے معاملے میں ہم پر کوئی شے نہیں تھوپی۔ میری امی مذہبی تھیں اور ہم سب کو قرآن بھی
انھوں نے ہی پڑھایا۔ میرا بچپن خود کو احمدی سمجھتے ہوئے گزرا۔ جب احمدیوں کو کافر قرار دیا گیا تو میری
عمر گیارہ سال تھی۔ اس کے بعد اسکول میں میرے ساتھ جو سلوک ہوا اس کے بعد میں کسی کو سینہ تان کر
یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میں احمدی ہوں۔ اس کے بعد زندگی نارمل نہیں رہی تھی۔ لڑکے لڑکیوں میں دلچسپی
لیتے، ان کے بارے میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ مجھے بھی کوئی لڑکی پسند آتی مگر میرے ذہن

میں فوراً یہ خیال آتا کہ مگر میں تو احمدی ہوں۔ یہ کوئی اطمینان بخش چیز نہیں تھی۔
میرا فرقہ کون سا ہے؟ میں کس فرقے سے منسلک رہنا چاہتا ہوں؟ یہ سوال میرے سامنے کوئی پہلی مرتبہ کھڑا نہیں ہوا۔ دس سال پہلے جب کینسر امی کے جسم و جاں میں پوری طرح پھیل چکا تھا، انھوں نے مجھ سے پوچھا تھا:

"پتر، تم نے جو اتنی کتابیں پڑھی ہیں۔ کچھ تم ہی بتاؤ کہ کون سا فرقہ تمھیں ٹھیک لگا؟"

"امی، مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا۔ کاش مرزا صاحب میٹافزیکل قسم کے دعوے نہ کرتے۔ یہ امپری سزم کی دنیا ہے امی، اب لوگ ہر چیز کا تجربے اور تجزیے سے ثبوت مانگتے ہیں۔ مجھے تو جو چیز لاجک سے سمجھ میں آجائے وہ مان لیتا ہوں، باقی کو ڈیفر کر دیتا ہوں،" میں نے انھیں بتایا تھا۔

"پتر، مذہب تو چیز ہی میٹافزیکل ہے۔ کیا دنیا کی ہر چیز لاجک ہی کے انڈر آتی ہے؟" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور ان کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔ انھیں اپنے فرقے سے متعلق اپنے بیٹے کے اعتراضات پر خوشی تو نہیں ہوتی تھی لیکن اس روز وہ کافی اچھے موڈ میں تھیں اور ان کی آنکھوں میں وہ چمک تھی جو ایک ماں کی آنکھوں میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کا پوت کوئی ذہانت سے بھرپور بات کرتا ہے۔

"جی امی، انگریزوں نے بھی میٹافزیکل فینامینا پر کتابوں کا ایک طومار مرتب کر رکھا ہے۔ مگر امی، آپ نتیجہ بھی تو دیکھیں نا مذہب کا۔ یہ اتنی ساری جو نفرتیں ہیں دنیا میں، ان میں سے کتنی زیادہ مذہب کی وجہ سے ہیں۔ اپنے پاکستان کا حال دیکھیں نا۔" میں نے بھرپور جوش کے ساتھ انھیں وہی دلائل دیے تھے جو میں نہ جانے پہلے کتنی مرتبہ دے چکا تھا۔

امی کی آنکھیں مند گئیں تو بہنیں ہمارے ہی ہاں تھیں۔ امی نے جماعت کے ذریعے ان کے رشتے احمدی گھرانوں میں کرائے تھے۔ جنازے پر جماعت والے بھی آئے تھے۔ ہم نے اپنے علاقے میں نماز جنازہ نہیں کرائی۔ بس یہ بتا دیا کہ میت کو گجرات لے جا رہے ہیں۔ تاہم ہمارا رخ چنیوٹ کے قریب ربوہ کی طرف تھا۔ امی کی تدفین کے بعد میں نے بہت جذباتی ہو کر قبرستان کے منتظم سے کہا کہ ان کی قبر کے ساتھ والی جگہ چھوڑ دے کیونکہ میں مرنے کے بعد امی کے پہلو میں ہی سونا چاہتا ہوں۔ شاید اسی جذباتی عالم میں میں نے اپنے فرقے سے متعلق فیصلہ بھی کر دیا تھا۔ میں تہذیبی لحاظ

سے خود کو ایک مسلمان ہی کہلانا چاہتا تھا لیکن شاید مجھے اب ایک مرتبہ پھر کسی نہ کسی فرقے کو آپٹ کرنا تھا، چاہے میں اس سے ذہنی طور پر وابستہ ہوتا یا نہیں۔

میرے ابا کہا کرتے تھے کہ انھوں نے میری امی کے حسن کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو میں کوئی اصول طے کر کے اس پر ڈٹ جاتا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ سلمٰی کی توقع بہت طاقتور تھی جبکہ میرے ڈھلمل یقین قسم کے خیالات بہت کمزور۔ اس نے بہت دلیرانہ فیصلہ کیا تھا اور میرا یہ خیال تھا کہ اس کا یہ حق ہے کہ میں بھی اس کی خاطر یہ قربانی دوں۔ وہ ایک عورت تھی اور اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ ہماری شادی سے متعلق اپنے والدین کو راضی کر لے گی۔ اس نے مجھ سے کہا تو نہیں تھا لیکن اپنے بلائے ہوئے مولوی سے نکاح پڑھوانے کی صورت میں وہ اپنے والدین سے یہ کہہ سکتی تھی کہ اس نے مجھے مسلمان کر کے مجھ سے شادی کی ہے۔ یہ بات میرے لیے بہت تکلیف دہ بھی تھی کہ میں جس لڑکی سے شادی کرنے والا ہوں وہ مجھے 'مسلمان' کرنا چاہتی ہے۔ اس کی جانب سے یہ ایک خود غرضی بھی کہی جا سکتی تھی مگر میں اس معاملے پر اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس پر اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ میں احتیاط کا دامن چھوڑ بیٹھوں گا اور اسے دکھی کر دوں گا۔ رات کو سلمٰی نے فون کر کے پھر سے پوچھا تو میں نے نحیف اور اداس سی آواز میں اسے ہاں کہہ دی۔ اپنی زندگی میں کچھ باتیں ایسی تھیں جن کے بارے میں میں کوئی فیصلہ کن رائے قائم نہیں کر سکا تھا، ان معاملات میں میرے اِن ڈیسیژن کا لامحالہ نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ میں خود کو کسی بہت چاہنے والے کی سپرداری میں دے دیتا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے شادی کے بعد ہم نے لاہور میں رینٹ اے کار سے ایک گاڑی لی اور سلمٰی کی یہ پیشکش قبول کر لی کہ گاڑی وہ خود چلائے گی۔ ابو کی ڈائری میں لکھا ہوا ایک فقرہ یاد آگیا:

It was always interesting being led away by a woman of charms.

7

فلم ہش کا ایک منظر جاوید اقبال کے پسندیدہ ترین فلمی مناظر میں تھا۔ گوینتھ پالٹرو کا محبوب اسے اپنی والدہ سے ملوانے اپنے شہر لایا ہوا ہے۔ چونکہ ان کی ابھی شادی نہیں ہوئی اور محبوب کے دل میں والدہ کی کافی تعظیم ہے، اس لیے وہ گوینتھ کو ایک الگ کمرے میں سلاتا ہے۔ رات کے کسی وقت

گوینتھ اس کے کمرے میں چلی آتی ہے۔ صبح گوینتھ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھتی ہے تو اتفاقاً محبوب کی ماں بھی کمرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ گوینتھ اور محبوب کی ماں دونوں کے ہونٹوں سے 'اوہ مائی گاڈ!' کا فقرہ طلوع ہوتا ہے، کیونکہ گوینتھ اپنی ہونے والی ساس کے سامنے ننگ دھڑنگ کھڑی ہے۔ فلم کا اگلا شاٹ اس جانب سے ہے جس جانب محبوب کی والدہ کھڑی ہے۔ اس رخ سے گوینتھ کو دوڑ کر اپنے بستر کی جانب بڑھتے اور خود پر کمبل کھینچتے دکھایا گیا ہے۔ اگلا شاٹ بستر کے سامنے سے ہے جس میں گوینتھ کا چہرہ ایک مرتبہ پھر نظر آتا ہے۔ اس مرتبہ اس کا جسم کمبل میں لپٹا ہوا ہے۔

جاوید اقبال کا خیال یہ تھا کہ گوینتھ کے بستر کی جانب دوڑ کر جانے کا منظر بہت مختصر تھا۔ اس نے سی ڈی پر روک روک کر یہ منظر دیکھنے کی کوشش کی اور یوں گوینتھ کی تشریف کے دو تین لمحے اپنی آنکھوں میں قید کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کے بعد اس نے یہ تصویر گوگل سرچ میں تلاش کی اور اپنی ڈیسک ٹاپ پر محفوظ کر لی۔ ایک مرتبہ گوگل سرچ میں گوینتھ ہی کے نام سے کچھ اور تلاش کرتے ہوئے اسے معلوم ہوا کہ فلم بش میں اس مخصوص شاٹ کے لیے گوینتھ کے بجائے اس کی کسی 'باڈی ڈبل' کو استعمال کیا گیا تھا۔ چونکہ باڈی ڈبل کا چہرہ دوسری جانب تھا اس لیے کوئی بھی یہ پہچان نہیں سکا ہوگا کہ وہ خود گوینتھ نہیں تھی۔ پس ثابت ہوا کہ وہ تشریف گوینتھ کی تھی ہی نہیں جس کا جاوید اتنے عرصے سے مداح رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی جاوید اقبال کے لیے اس تشریف نے اپنی ساری کشش کھو دی۔

پاپارازی پہلے ڈیانا کی تصویریں اتارنے کے لیے مرتے تھے اور اب اس کی بہو کیٹ مڈلٹن کی برہنگی کو اپنے کیمرے میں قید کرنے کے لیے مرتے ہیں۔ لیکن کسی عام عورت کے شائق کے لیے بھی اس عورت کی برہنگی، جو اس کے لیے ایک خاص عورت بن چکی ہے، کسی سلیبرٹی کی برہنگی سے کم نہیں ہوتی۔ لیکن ہر برہنگی کی قدر و قیمت مختلف ہوتی ہے۔ یہ قدر و قیمت گھٹ جائے تو Eroticism یا ہوس کی چنگاری بھی بجھنے لگتی ہے۔ طلب اور رسد کے قانون کے مطابق برہنگی جتنی دستیاب ہوگی اتنی ہی ارزاں ہوتی جائے گی۔

زرینہ بھی جاوید اقبال کے لیے ایک ایسی عورت تھی جو اُسرار سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ اس کی متوقع برہنگی میں اس کے لیے ایک چیلنج تھا جو اس کے لیے بے حد پر معنی تھا۔ کھڑکی میں سے اس کے شلوار بدلنے کے منظر نے جاوید کو سحر زدہ کر دیا تھا اور پھر زرینہ کی جانب سے مسلسل انکار نے اس کی

آتش شوق اور بھی تیز کر دی تھی۔ لیکن اب اس کی برہنگی نے سب معنی کھو دیے تھے۔ وہ ایک پراسرار عورت کی برہنگی تھی، اور یہ اس کی کسی باڈی ڈبل کی برہنگی، جس میں کسی بھی قسم کے چیلنج اور چنوتی کا فقدان تھا۔

جاوید اقبال نے اپنی کم فرصتی کے باوجود صادق بھائی سے دوستی گانٹھنے کے لیے بھی کافی وقت صرف کیا تھا۔ ایک مرد کو شکست دینے کی توقع میں اس کے لیے وہ خوراک موجود تھی جس سے پیٹ بھر کر اس کی مردانگی اطمینان کا ڈکار مار سکتی تھی۔ صادق بھائی کے پاس جنات بھی نہیں پائے گئے تھے، اس لیے انھیں شکست دینا بھی اپنے معنی کھو بیٹھا تھا۔

اب اس کے سامنے ایک نا مطمئن عورت تھی، ایک ضرورت مند عورت۔ یہ ایک اور امیج تھا، ایک ایسا امیج جس میں کوئی اُسرار رہا تھا نہ کشش۔ اسے لگا کہ وہ ایک خالی تجوری میں اپنے پلے سے پیسے ڈالتا رہا ہے۔ 'اپنے پلے سے...' اس نے اس فقرے پر مزید غور کیا اور سوچا کہ زرینہ کو اس کی ضرورت اُس ضرورت سے زیادہ ہے جو جاوید کو زرینہ سے ہے۔ ان کے دل میں زرینہ کے لیے جو جذبہ تھا، وہ ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا۔ صادق بھائی ایک عام سے آدمی نکلے تھے اور زرینہ ایک عام سی بیوی۔ ایک ایسا جسم جو صادق بھائی جیسے عام سے آدمی کی نظروں میں رہتا تھا۔ ایک عام سادہانہ جسے صادق بھائی کا، متوقع طور پر، بد ہیئت عضو استعمال کرتا تھا۔ جاوید کو سوچ سوچ کر متلی سی ہونے لگی۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی بند رکھنا شروع کر دی اور کچھ روز بعد بڑی دلجوئی سے زرینہ کو موبائل پر کہا کہ اسے اپنے میاں سے بے وفائی نہیں کرنی چاہیے اور یہ کہ وہ خود بھی دوسروں کا مال اڑا کر اپنے ضمیر کی خلش محسوس کرتا رہا ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے شروع کے دنوں میں زرینہ نے اسے نماز پڑھنے کی تلقین کی تھی۔

عورت اور مرد کا تعلق اوز بہت سی چیزوں کے ساتھ ساتھ طاقت اور اختیار کا ایک کھیل بھی تو ہے۔ Dominance کی ایک جدوجہد۔ انسان کی کسی دوسرے انسان پر غلبہ پانے کی قدیم خواہش شطرنج کی اس بساط پر بڑے شاندار طریقے سے کھیلی جاتی ہے، جسے عرف عام میں محبت کہا جاتا ہے۔ اور محبت کرنے والے انسان کیا ہیں؟ کچھ پٹے ہوئے مہرے، کچھ بچی ہوئی گوٹیاں۔

ہم جس سے محبت کرتے ہیں اسے زندہ کر دیتے ہیں۔ اس کی پور پور کو نئے سرے سے تخلیق کرتے ہیں۔ اس کے روئیں روئیں میں اپنی پسندیدہ خوشبوئیں اگا دیتے ہیں۔

جاوید اقبال نے زرینہ کو ایک فن پارے کی طرح تخلیق کیا تھا اور پھر کسی نہ پسند آئی ہوئی ذاتی تحریر کی طرح پھاڑ کر پھینک دیا۔

8

جاوید اقبال

بھائی آفتاب کے بارے میں ہم یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنا سارا وقت کتابیں پڑھنے اور سوچ بچار کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ اسمارٹ تو وہ ہیں ہی اور خاصے پروقار بھی لیکن انھوں نے اپنی شادی کی عمر نکال دی تھی اور ان کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ لیکن پھر پتا چلا کہ وہ اپنی ایک شاگرد میں انوالو ہو گئے ہیں اور اسی کی وجہ سے انھیں یونیورسٹی کی جاب بھی چھوڑنا پڑی ہے۔ اس کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ وہ کہانی آئی گئی ہو گئی ہے۔ لیکن چھ مہینے پہلے انھوں نے سلمٰی بھابھی سے کورٹ میرج کر لی۔ شادی کے بعد انھوں نے ہمیں اپنی تصویریں بھیجیں۔ ماشاء اللہ جوڑی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ بھابھی بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور بھائی صرف مسکرا رہے تھے۔ لیکن ان کے چہرے پر اتنی مسکراہٹ بھی غنیمت تھی۔ ہم نے بھائی سے شکوہ بھی کیا کہ انھوں نے ہمیں شادی پر کیوں نہیں بلایا، لیکن ظاہر ہے کہ کورٹ میرج تو کورٹ میرج ہی ہوتی ہے۔

بھابھی کا تعلق ایک مذہبی خاندان سے ہے اور بھابھی نے اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر شادی کر لی تھی۔ وہ کالج میں پڑھاتی ہیں اور انھوں نے کالج سے گھر جانے کا کہہ کر تین دن کی چھٹی لی تھی اور بھائی کے ایک دوست کے ہاں شادی کے بعد کے دو دن گزار کر واپس ہوسٹل آ گئی تھیں۔ اس کے بعد دونوں نے لکشمی چوک میں کرائے پر ایک چھوٹا سا گھر لے لیا تھا اور اس میں رہنے لگے تھے۔ سلمٰی بھابھی کے گھر والوں کو ان کے کالج میں سے کسی نے بتا دیا ہو گا۔ بھابھی کے ابا نے فون کر کے انھیں طلاق لینے کو کہا اور وہ اس پر آمادہ نہ ہوئیں تو انھوں نے انھیں اور بھائی کو مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ کچھ روز بعد وہ ایک جلوس کی شکل میں ان کے لکشمی چوک کے گھر کے باہر جمع ہو گئے۔ اس روز اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی گھر سے باہر نکلتا تو ہجوم اس کی تکہ بوٹی کر دیتا۔ خوش قسمتی سے ان کے گھر سے ایک سیڑھی چھت پر جاتی تھی۔ دونوں چھت پر گئے اور دوسرے گھروں کی چھتیں پھلانگتے ہوئے وہاں سے

نکل گئے۔ ہجوم بہت دیر تک ان کے گھر کے باہر نعرے لگاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کھڑکیوں اور دروازوں پر پتھر برسانا شروع کر دیے۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ مالک مکان بھی انھیں روکنے کے لیے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ جب سب کھڑکیاں ٹوٹ چکیں تو ہجوم اندر داخل ہوا اور گھر کا سارا سامان توڑ پھوڑ ڈالا۔ بھائی اور بھابھی تب تک وہاں سے نکل چکے تھے۔ ہجوم نے ان کی قیمتی اشیا اور کپڑے لوٹ لیے اور وہاں تا دیر جشن کا سماں رہا۔ قریب تھا کہ وہ گھر کو آگ لگا دیتے کہ مالک مکان نے محلے داروں کو بھجوا کر انھیں اس سے روکا۔

میں اپنے آفس میں ہی تھا جب میں نے یہ خبر سنی تھی اور بھائی کا نام سن کر بہت پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے لاہور بیورو میں بات کر کے بھائی کے لیے پولیس پروٹیکشن کا کہا تھا لیکن خود پولیس کو پتا نہیں تھا کہ وہ اب کہاں ہیں۔ بھائی اور بھابھی کے موبائل نمبر پر بھی کوئی کال نہیں اٹھا رہا تھا۔ کچھ دن اسی پریشانی میں کٹے۔ میں نے امی کو بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن اسی رات انھیں میری سوتیلی بہن کا فون آیا تو وہ بھی بہت پریشان ہو گئیں۔ دو تین روز بعد بھائی نے عائشہ باجی کو فون کیا تو اس نے انھیں ہماری پریشانی سے آگاہ کیا۔ تب بھائی نے مجھے فون کیا اور مجھے اطمینان ہوا۔ وہ جس پریشانی میں لاہور سے نکلے تھے اس میں ان کا موبائل وہیں گر گیا تھا۔ بھابھی کے موبائل میں صرف عائشہ باجی کا نمبر تھا جس پر انھوں نے ان سے بات کر لی تھی۔

بھائی لاہور میں ہی اپنے ایک دوست کے ہاں رہ رہے تھے، مگر وہ لاہور سے نکلنا چاہ رہے تھے۔ بھائی نے مجھ سے بات کی تو میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ کراچی یا ٹنڈو والہ یار آ جائیں لیکن ان کا کہنا تھا کہ اس سے ان کی مصیبت ہم پر بھی آ سکتی تھی۔ مگر وہ پنجاب میں کسی بھی جگہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر امی نے کسی سے کہلوا کر سانگھڑ کے قریب ایک گوٹھ کے اسکول میں دونوں کو نوکری دلوا دی۔ بھائی پہلے کبھی کسی بھی سلسلے میں امی کی مدد لینے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ مگر اس مرتبہ معاملہ مختلف تھا۔ ابا کی مشترکہ محبت اور پچھلے چند ماہ کے دوران فون پر بات چیت نے دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے جگہ پیدا کی تھی۔ اس سلسلے میں پہلا قدم امی نے ہی بڑھایا تھا لیکن بھائی نے بھی اس کے راستے میں کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ ورنہ امی کی جانب سے پہلے اس بارے میں کی جانے والی کوششوں پر بھائی اور خصوصاً ان کی بہنیں کوئی اچھا رسپانس نہیں دیتے تھے۔

ایک ہفتہ پہلے میں اور امی ان سے ملنے گئے تھے۔ نیچی چھتوں والے ایک منزلہ مکانوں پر مشتمل اس گلی میں ان کا مکان الگ نظر آتا تھا کیونکہ انھوں نے اپنے دروازے کے باہر آم کا ایک پودا لگایا ہوا تھا اور موتیے کے تین گملے بھی اگا رکھے تھے۔ بوگن ویلیا کی ایک بیل کھڑکی سے اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ امی شام کو ہی ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی گئیں لیکن میری اور آفتاب بھائی کی ڈسکشن اتنی دلچسپ چل رہی تھی کہ انھوں نے مجھے وہاں رکنے کی دعوت دی اور میں رک بھی گیا۔ بھائی نے چند ہی مہینوں میں اچھی خاصی سندھی سیکھ لی ہے اور وہ گھر سے باہر سندھی میں ہی گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے ایک کمرے کے سادہ سے گھر میں سوائے اٹھارہ انچ کے ایک ٹی وی کے کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں۔ چھوٹے سے صحن میں ایک بکری بھی ہے جس کے دودھ سے بہت مزے دار چائے بنتی ہے۔ ان کے گھر میں فریج تک نہیں۔ ایک طرف تین گھڑے رکھے ہیں اور ایک امیر گھرانے میں پیدا ہونے والی بھابھی اتنی صابر ہیں کہ گھڑے کا پانی پی کر بھی مطمئن ہو جاتی ہیں۔ بھابھی پریگننٹ ہیں اور ان کے خوبصورت چہرے پر ایک عجیب سا نور ہے۔ پتا نہیں یہ ان کے حاملہ ہونے کی وجہ سے ہے یا اس وجہ سے کہ وہ بہت دکھ اٹھانے کے بعد بالآخر اپنی محبت کو پانے میں کامیاب رہی ہیں۔ وہ اپنی محبت کے اظہار میں بہت ایکسپریسو ہیں جبکہ بھائی اس کا اظہار نہیں کرتے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ بھی بھابھی کو بہت چاہتے ہیں۔ بھابھی کی عمر مجھ سے بھی کم ہے اس لیے ہم تھوڑی سی بات چیت کے بعد ہی دوست بن گئے۔ بھابھی نے مجھے لاہور کا واقعہ سنایا اور اس سے پہلے ان مصیبتوں کا جو انھیں اٹھانا پڑی تھیں۔ مگر اب جبکہ انھیں اپنی محبت مل گئی تھی تو وہ ان مصیبتوں کا احوال سناتے ہوئے ہنس ہنس پڑتی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے میری لو لائف کے بارے میں پوچھا تو میں نے مناسب یہ سمجھا کہ انھیں بھی مشعال کے بارے میں بتا دوں۔ انھوں نے میری بات پوری ہمدردی سے سنی اور مجھے لگا جیسے وہ مشعال کے سلسلے میں میری مدد کر سکیں گی۔

بھائی پہلے ہی بہت سادہ مزاج تھے۔ لاہور والے واقعے سے وہ پریشان تو بہت ہوئے ہوں گے لیکن سانگھڑ کے اس گوشے میں وہ اتنے مطمئن نظر آتے ہیں جیسے یہیں پلے بڑھے ہوں۔ انھوں نے لاہور والے واقعے کے بارے میں زیادہ بات نہیں کی، نہ انھیں ان چیزوں کے وہیں رہ جانے کا غم ہے جو انھوں نے اپنی تھوڑی سی کمائی سے بنائی تھیں اور جو لاہور کے اسی مکان میں رہ گئیں۔ اس کے

بجائے وہ تو بس خدا کا شکر ادا کرتے رہے کہ ان کی کتابوں کا ذخیرہ راولپنڈی میں تھا اس لیے بچ گیا۔ انھوں نے یہ ذخیرہ اپنے پاس منگوا لیا ہے اور یہ کتابیں ان کے بستر کے نیچے اور آس پاس جمی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انھیں میں ابا کی ڈائریاں بھی ہیں جو بھائی نے مجھے دکھائیں اور کچھ شراب کی بوتلیں بھی جنھیں بھائی نے ابا کی نشانی سمجھ کر سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ میں ان ڈائریوں کو دیکھ رہا تھا مگر آفتاب بھائی بے چین ہو رہے تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا تو انھوں نے بتایا کہ وفات سے کچھ ماہ پہلے ابا کے کسی عالمگیر نامی خاتون سے تعلقات تھے۔ انھوں نے مجھے سختی کے ساتھ منع کیا کہ یہ بات امی کو نہ بتاؤں۔ مجھے ابا کے بارے میں یہ معلومات بہت دلچسپ لگیں۔ امی بھی ان کی رومانٹک طبیعت کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ ابا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا اور مجھے اپنی امی کا کئی بار دہرایا ہوا یہ فقرہ یاد آنے لگا کہ "تم بالکل اپنے ابا پر گئے ہو۔"

رات ہونے والی تھی۔ بھابھی اندر کمرے میں سو گئی تھیں اور بھائی اور میں باہر صحن میں پکے فرش پر چادر بچھا کر لیٹ رہے تھے۔ ہمارے سامنے اندھیرا تھا اور ہم اس اندھیرے میں بکری کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ سکتے تھے جو اس ماحول کو ایک عجیب پراسرار سا بنا رہی تھیں۔ میں بھائی سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے بارے میں، ان کے بارے میں، ابا کے بارے میں۔ مجھے ابا کی شراب کی بوتلوں کا خیال آیا۔ میں نے بھائی سے پوچھا، "بھائی، ہیو یو ٹرائیڈ اینی آف دیم؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔ پتا نہیں ابو نے کیوں رکھی ہوئی تھیں یہ۔ میں نے امی سے بھی پوچھا تھا تو انھوں نے یہی کہا تھا کہ وہ تو کسی اور کی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان بوتلوں کو ضائع کر دوں مگر پتا نہیں کیوں میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"اگر آپ میری وجہ سے جھجک رہے ہیں تو مجھے کوئی پرابلم نہیں۔ آپ چاہیں تو میں لے آؤں آپ کے لیے؟"

انھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو میں جھٹ کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا اور بھابھی آنکھیں میچے لیٹی ہوئی تھیں۔ نیلی روشنی میں پائینچوں سے نکلے ہوئے ان کے سفید پیروں کے شفاف تلوے روشن نظر آ رہے تھے۔ میں کتابوں کی طرف گیا اور موبائل کی روشنی آن کر کے شراب کی بوتلوں کی جانب بڑھا۔

''کون ہے؟ کیا کر رہے ہو؟'' بھابھی کی آواز آئی۔

ان کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''بھابھی، ایک کتاب چاہیے تھی،'' میں نے کہا اور وسکی کی بوتل اپنی کمر کے پیچھے چھپا کر دوسرے ہاتھ سے ایک کتاب اٹھا کر باہر آ گیا۔ وہ کیوں رو رہی تھیں، یہ پوچھنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔ میں نے فرج سے ٹھنڈا پانی نکال کر بھائی کے لیے ایک پیگ بنایا۔ بھائی نے وہ پیگ پینے کے بعد مجھے ابو کے بارے میں بڑی دلچسپ سی باتیں بتائیں۔

9

آفتاب اقبال نے جو قصہ سنایا، اس کی تفصیل بتانے سے پہلے لازمی ہے کہ جاوید اقبال کے بیان کی کچھ تصحیح کر لی جائے۔

جاوید نے بھائی سے پوچھا، ''بھائی، ہیو یو ٹرائیڈ اینی آف دیم؟''

''نہیں، مجھے کبھی اس کا خیال نہیں آیا،'' انھوں نے کہا۔

''کیا آج اس کا موقع نہیں؟''

''تم ڈرنک کرتے ہو تو لے آؤ۔''

''جی میں کبھی کبھار کر لیتا ہوں۔ ڈُو یو مائنڈ اگر میں ابو کی ڈرنکس میں سے کچھ ٹرائی کر لوں؟'' جاوید نے کہا۔

آفتاب نے اثبات میں سر ہلایا تو جاوید جھٹ کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا اور بھابھی آنکھیں میچے لیٹی ہوئی تھیں۔ نیلی روشنی میں پائینچوں سے نکلے ہوئے ان کے سفید پیروں کے شفاف تلوے روشن نظر آ رہے تھے۔ جاوید کتابوں کی طرف گیا اور موبائل کی روشنی آن کر کے شراب کی بوتلوں کی جانب بڑھا۔

''کون ہے؟ کیا کر رہے ہو؟'' بھابھی کی آواز آئی۔

ان کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''بھابھی، ایک کتاب چاہیے تھی،'' جاوید نے کہا اور وسکی کی بوتل اپنی کمر کے پیچھے چھپا کر دوسرے ہاتھ سے ایک کتاب اٹھا کر باہر آ گیا۔ وہ کیوں رو رہی تھیں، یہ پوچھنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔ جاوید نے فرج سے ٹھنڈا پانی نکال کر ایک پیگ بنایا۔ اس کے کہنے پر آفتاب نے بھی ایک پیگ لینے کی ہامی بھر لی۔

10

''تو بھائی، ابو کے بارے میں آپ کی تحقیق کہاں تک پہنچی؟''

''ہاں۔ ابو کی ڈائری میں آخری رات جو اندراج ملتا ہے، اس میں کسی 'عالمگیر' کا تذکرہ تھا۔

''ہاں میں نے بھی دیکھی تھی وہ ڈائری، اور وہ اینٹری بھی۔''

''میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ بادشاہ اورنگزیب عالمگیر ہوگا۔ مگر وہ ایک عورت کا ذکر تھا۔''

''یعنی عالمگیر کوئی عورت تھی؟''

''ہاں۔''

''عالمگیر؟ یہ عجیب نام نہیں ہے عورت کے لیے؟''

''گاؤں دیہات میں لوگ ہر نام کے آگے 'بی بی' لگا کر اسے نسوانی بنا لیتے ہیں۔ اس کا پورا نام عالمگیر بی بی تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟ وہ عورت اب کہاں ہے؟ اب تو کافی عمر کی ہو گئی ہوگی؟''

''وہیں رہتی ہے، منڈی بہاء الدین میں۔''

''واہ۔ پھر تو اس سے ملنا چاہیے۔''

''پتا نہیں اس کا شوہر یہ بات پسند کرے یا نہ کرے۔ لیکن میں اس سے مل چکا ہوں۔''

''وہ کیسے؟ آپ کیسے مل چکے ہیں اس سے؟''

''میں تمھیں بتا تو دوں، لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ساری کہانی تمھارے لیے کچھ خوشگوار ثابت نہ ہو۔''

''زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ ابو اسے پسند کرتے ہوں گے؟ اور کیا ہو سکتا ہے؟''

''ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ خیر۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب تم نے اپنا ایک دوست

میرے پاس بھیجا تھا۔ جن دنوں بے نظیر کا قتل ہوا تھا۔ وہ ایک دن میرا پتا تلاش کرتی ہوئی آئی تھی۔ اس کے بعد ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔"

"وہ کیوں آسکتی ہے آپ سے ملنے؟ کیا یہ بتانے کہ ابو کی اس کے ساتھ دوستی تھی؟"

"نہیں، وہ اپنے بچے کی تلاش میں آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔"

"پھر؟ آپ نے اس کی مدد کی؟"

"ظاہر ہے میں اس کی مدد تو کوئی خاص نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس کا نام معلوم کرتے ہی مجھے ابو کی ڈائری میں لکھا ہوا وہ آخری جملہ یاد آ گیا تھا کہ وائے یو ہیڈ ٹو ڈو دس عالمگیر۔"

"یعنی ابو اپنی زندگی کے آخری دن اس کے بارے میں سوچ رہے تھے؟ مگر عالمگیر نے ایسا کیا کیا تھا کہ ابو نے اس کے بارے میں یہ فقرہ لکھا؟"

"پتا نہیں۔ وہ ہمارے گھر کا کام بھی کرتی تھی۔ شاید اسی میں کوئی غلطی کر دی ہو اس نے۔ مگر ابو پھر اتنی معمولی سی چیز کا تذکرہ اپنی ڈائری میں کیوں کرتے؟"

جاوید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آفتاب کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا رہے تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں کی۔

11

راوی

آفتاب کو یاد آیا کہ عالمگیر پہلی مرتبہ اسے تب ملی تھی جب وہ لوگ ابو کی وفات پر منڈی بہاء الدین پہنچے تھے۔ سلطانہ آنٹی بھی کراچی سے آئی ہوئی تھیں۔ عالمگیر کافی دیر ان سب کے ساتھ بیٹھی رہی تھی اور بہت زیادہ روئے جا رہی تھی۔ سب اس کی باتیں بہت دلچسپی سے سن رہے تھے کیونکہ وہ ابو کے آخری دنوں کی باتیں کر رہی تھی۔ بہت خیال رکھتے تھے میرا۔ شوکت بھی بہت خوش تھا ان سے۔ ان کے ہوتے ہوئے ہمیں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی، وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ اپنی کہی ہوئی باتیں دہرانے لگی اور آفتاب سوچنے لگے کہ اسے یہ سینس نہیں کہ گفتگو کس مرحلے پر ختم کر دینی چاہیے اور اپنے کام میں لگ جانا چاہیے۔ مگر وہ ایک دیہاتی عورت تھی اور اسے اس کا خیال نہیں آ سکتا تھا۔ سلطانہ آنٹی بھی ابو کی کہانی سننے

کے شوق میں ان کے ساتھ آن بیٹھی تھیں، ورنہ آفتاب کو علم تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھنے پر بے قراری محسوس کر رہی ہیں۔ آفتاب کی امی تو اللہ لوک تھیں۔ انھوں نے سلطانہ آنٹی کا منھ ایسے پیار سے چوما تھا جیسے وہ آنٹی کو نہیں بلکہ ابو کی محبوبہ کو پیار کر رہی ہوں۔ آفتاب نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں صرف پیار تھا اور سلطانہ آنٹی ان سے آنکھیں نہیں ملا پا رہی تھیں۔ تو عالمگیر تب بھی وہاں بیٹھی رہی تھی جب سلطانہ آنٹی اٹھ کر کہیں اور چلی گئی تھیں اور آفتاب بھی اِدھر اُدھر نکل گیا تھا۔ آفتاب واپس آیا تو وہ تب بھی وہیں موجود تھی۔ زمین پر پیڑھ رکھے، ایک ٹانگ کھولے اور ایک کو تہہ کیے بیٹھی وہ عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ایک بازو کی کہنی اس کی کھلی ہوئی ٹانگ کے گھٹنے پر تھی اور اسی بازو سے وابستہ ہاتھ سے وہ ایک صدمے کے عالم میں اپنا ماتھا پکڑے ہوئے تھی۔ وہ بھرے بھرے جسم کی ایک جوان عورت تھی اور اپنی چادر سے بے خبر ہو رہی تھی جو اس کے کشادہ گریبان سے ڈھلک رہی تھی۔ یہ ایک بڑی واضح تصویر تھی جو عالمگیر سے دوبارہ ملاقات کے موقع پر آفتاب کے ذہن میں پھر سے اجاگر ہو گئی تھی۔

یہ عالمگیر اس سے بہت مختلف تھی۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں البتہ بال سیاہ اور تیل سے چپڑے ہوئے تھے۔ وہ کافی موٹی تھی اور ہر طرف سے بدہیئت سے انداز میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ساتھ دو بچے بھی لگائے ہوئے تھے۔ ان کے سر کے بالوں میں تیل چپڑا ہوا تھا۔ دونوں گندے مندے تھے اور ان کی ناکیں مسلسل بہہ رہی تھیں جنھیں وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی چادر سے ہی پونچھ دیتی تھی۔ دونوں کے چہرے سہمے ہوئے تھے، جیسے وہ کسی بھی وقت رو دیں گے۔ آفتاب نے عالمگیر کو کھانے کے لیے روک لیا اور چاہا کہ اس سے ابو کی ڈائری کی آخری اینٹری کے بارے میں کچھ پوچھا جائے۔ آفتاب نے اس سے پوچھا کہ وہ بالے کی تلاش میں اسی کے پاس کیوں آئی ہے، تو اس نے بتایا کہ چونکہ اقبال محمد خاں سے زیادہ اس کی زندگی میں کسی نے ان کی مدد نہیں کی اس لیے اس نے یہ سمجھا کہ ان کا بیٹا ہی اس معاملے میں ان کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ ابو کی کرم فرمائیوں کا تذکرہ کرتی رہی تو آفتاب نے اس سے پوچھ لیا کہ ابو اسے ذاتی طور پر کتنا پسند کرتے تھے۔ حیا کی ایک لہر سی اس کے چہرے پر دوڑی جس سے اس کے بے رونق چہرے پر اُس عالمگیر کا رنگ سا دوڑ گیا جو وہ آج سے چودہ پندرہ سال پہلے تھی۔ "ہاں جی۔ وہ کہتے تھے تم بڑی 'خوبصورت' ہو،" وہ مسکرا کر بولی۔

"دیکھیں، برا نہ منائیے گا۔ میں اپنے ابو کو جانتا ہوں۔ وہ بہت رومانٹک، میرا مطلب ہے کہ

عورتوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔"

عالمگیر سر جھکائے مسکراتی رہی۔

"تو کبھی ایسا ہوا کہ انھوں نے آپ کے لیے اُس طرح کی کسی دلچسپی کا اظہار کیا ہو؟"

"چھوڑیں جی یہ باتیں۔ اب تو وہ عالمگیر رہی ہی نہیں۔ سارا گراں کہتا تھا کہ جوانی تو عالمگیر پر آئی ہے۔ اب کیا رہ گیا ہے؟ بچوں کا اجڑو ہے۔ ہر وقت کا چیخ چہاڑا۔ میں تو اسی وقت مر گئی ہوتی تو اچھا ہوتا۔" اور اس کے ساتھ ہی عالمگیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آفتاب نے دیہاتیوں کے اسٹائل میں اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس نے ممنونیت کے جذبے کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیوں کے درمیان سے اس کی آواز بلند ہوئی۔

"یہ جو بالا ہے ناں، یہ بالکل اقبال صاحب پر گیا ہے۔"

آفتاب یہ سن کر حیران سا رہ گیا اور اس کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپک کر رہ گیا۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ اس کے ذہن میں جو خیال آ رہا ہے اس کے بارے میں اس سے کیسے پوچھے۔

"بالا اقبال صاحب پر گیا ہے؟ وہ کیسے؟"

"بس جی، وہ فوت ہوئے ہیں تو میں اور شوکت بس انھی کو یاد کرتے رہتے تھے۔ کچھ ہی مہینوں بعد بالا پیدا ہوا۔ پتا نہیں کیسے جی۔ یہ تو اللہ کے کام ہیں۔ مجھے تو خود سمجھ نہیں آتی جی۔"

"تو بالا کب پیدا ہوا؟" اب تک آفتاب کو بالے کی عمر کا کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا۔

"بس جی، بے نظیر جب دوبارہ آئی تھی، انھی دنوں وٹو نے منڈی بہاء الدین کو ضلع بنایا تھا۔ اس کے بعد ہی پیدا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے۔ اب چودہ ایک سال کا ہوگا۔"

آفتاب کو محسوس ہوا جیسے اس کے حلق میں نمک سا جمع ہو رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ عالمگیر واضح طور پر اس بات کی تردید کر رہی ہے کہ ابو سے اس کا کوئی جنسی تعلق تھا۔ لیکن اس کے اندر ایک طوفان سا امڈ رہا تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، اب اسے وہ سوال پوچھ ہی لینا چاہیے جو اس کے سینے میں پھانس بن کر اٹکا ہوا تھا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ یہ سوال کس انداز میں کیا جائے کہ عالمگیر کو برا نہ لگے۔ آفتاب نے بالآخر وہ سوال کیا تو اس کے حلق سے آواز بہت بھاری اور جذبے میں رندھی ہوئی نکلی۔

"کیا بالا میرا بھائی ہے؟"

عالمگیر اس سوال پر چونکی۔ اس کے آنسو تھم گئے اور وہ سنجیدہ ہو کر آفتاب کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس نے آفتاب کی آنکھوں میں نمی دیکھی ہوگی اور ایک التجا۔ اس نے نظریں جھکائیں اور پھر سر۔ پھر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اثبات میں سر ہلایا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک ریلا امڈ پڑا۔ وہ بستر سے اٹھی اور فرش پر بیٹھ کر اپنی کمر دیوار سے ٹکا دی۔ اس نے اُس روز کی طرح اپنی ایک ٹانگ باہر کو پھیلائی۔ اپنی دائیں کہنی اس کے گھٹنے پر ٹکائی اور ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر بہ آواز بلند رونے لگی۔ بالا آفتاب کا بھائی تھا اور ان سب بہن بھائیوں سے دور، اور ان کے برعکس، گاؤں کے ماحول میں انتہائی غربت میں بڑا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر اور کچھ عالمگیر کی حالت دیکھ کر آفتاب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

وہ بالے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانا چاہتا تھا مگر معلوم ہوا کہ تھانے میں تو اس کا نام پہلے ہی سے درج ہے۔ بالا منڈی بہاء الدین میں گاؤں کے ایک لڑکے کو قتل کر کے فرار ہوا تھا۔ آفتاب قدرت کے اس کھیل پر حیران تھا کہ اس کا اور جاوید اقبال کا ایک بھائی خونی تھا اور اب قانون سے بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ جاوید ایک دن آفتاب سے ملنے آیا تو آفتاب نے اسے عالمگیر سے ابو کی دوستی کا ذکر کیا لیکن دونوں کے تعلقات کی نوعیت اور بالے کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ بیچارہ خواہ مخواہ پریشان ہوتا۔ آفتاب نے اپنے ایک بھائی کا دکھ صرف اپنے تک ہی محدود رکھا۔ مگر اسے ابھی اس سے بھی بڑی حیرت اور دکھ سے ابھی گزرنا تھا۔ کچھ مہینوں بعد عالمگیر کے گھر پر ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ بالا افغانستان میں شہید ہو گیا۔

عالمگیر نے پھر آفتاب کو فون کیا۔ وہ اس کی تصدیق کر سکتا تھا نہ تردید۔ بس اتنا جانتا تھا کہ اگر بالا طالبان کے پاس پہنچ گیا تھا تو اسے جلد یا بدیر مرنا ہی تھا۔ لاہور میں لوگ آفتاب کے گھر کے باہر جمع ہوئے تو اسے جلدی میں اپنا موبائل نہیں ملا۔ وہ اور سلمٰی اس کے بغیر ہی چھتیں پھلانگتے وہاں سے نکل آئے۔ عالمگیر نے اس کے نمبر پر دوبارہ فون کیا بھی ہوگا تو اس کے نہ اٹھانے پر سمجھی ہوگی کہ آفتاب شاید اس سے رابطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ شاید کبھی ملک کے اور ہمارے حالات بہتر ہوں تو میں دوبارہ منڈی بہاء الدین جاؤں اور عالمگیر سے جا کر ملوں۔ تب تک مجھے اپنے بھائی کا دکھ اکیلے ہی جھیلنا ہے، آفتاب اکثر سوچتا۔

12

جاوید اقبال

شام کو بھائی نے مجھے اپنے ساتھ حمزاؤ کینال لے جانے کی تجویز پیش کی۔ حمزاؤ کینال گوٹھ کے پچھلی جانب تھی۔ ہم کھیتوں سے گزرتے ہوئے جا رہے تھے جن میں سبزیاں بوئی گئی تھیں۔ ان سے پرے آموں کے باغات بھی نظر آ رہے تھے۔ کافی دیر چلنے کے بعد ہم نہر پر پہنچ گئے۔ شاید بھائی گفتگو کے لیے کوئی موضوع نہیں سوجھ رہا تھا۔

"ابو کی ڈیتھ بھی تو ایک جھیل کے کنارے پر ہوئی تھی،" جاوید نے کینال میں ایک پتھر پھینکتے ہوئے کہا۔ پتھر کے جھیل میں گرنے سے غڑپ کی آواز آئی اور کینال میں نیچے تک روشنی کی لہر تیر گئی۔ کینال کی سطح پر گرداب بن بن کر ٹوٹنے لگے۔

"ہاں۔ ابو اس سے پچھلی رات دیر تک بہت کچھ سوچتے رہے تھے۔ اس رات وہ بہت اداس تھے۔ اگر کوئی ان کے پاس ہوتا، جس سے وہ کچھ باتیں شیئر کر سکتے تو شاید وہ ہمیں اتنی جلدی چھوڑ کر نہ جاتے۔"

"لیکن اگر وہ ہمیں چھوڑ کر نہ جاتے، تب بھی ہم نے تو انھیں چھوڑا ہی ہوا تھا نا۔"

"وہ دو سال بعد ریٹائر ہونے والے تھے اور شاید وہ تم لوگوں کے پاس کراچی آ جاتے۔"

"امی بتاتی ہیں کہ انھیں کراچی بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ ان دنوں ویسے بھی کراچی آپریشن چل رہا تھا اور امی خود اسلام آباد شفٹ ہونے کا سوچ رہی تھیں۔ پھر یہ سب کچھ بیچ ہی میں رہ گیا۔"

"پھر تم لوگ کیوں چھوڑ کر نہیں گئے کراچی؟"

"بس آج کل پر ہی بات ٹلتی رہی۔ اسلام آباد میں کون سا فری میں رہائش مل رہی تھی؟"

"بس یار، ہمارے بہت سے پروگرام آج کل کرتے ہی ٹلتے رہتے ہیں اور پھر ان کا وقت ہی نکل جاتا ہے۔ ابو بھی کچھ اور کرنا چاہتے تھے۔ بندہ اداسی سے نکلنے کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈتا ہے نا۔ وہ بھی اس رات کوئی حل سوچ رہے ہوں گے اپنی تنہا زندگی سے نکلنے کا۔"

"مجھے خود اب افسوس ہوتا ہے کہ امی انھیں کیوں چھوڑ کر چلی آئیں۔"

"تمھیں وجہ نہیں معلوم؟"

"معلوم تو ہے،" میں نے ہنس کر کہا۔ "امی کہتی تھیں کہ ابو دوسری خواتین میں دلچسپی رکھتے تھے۔ میں امی سے کہتا تھا کہ کم آن، یہ تو اتنی بڑی بات نہیں!"

"کیوں؟ کیا تمھارے خیال میں یہ بے وفائی نہیں؟ ان گریٹی چیوڈ نہیں؟ پہلے انھوں نے امی کے ساتھ یہی کیا اور پھر آنٹی کے ساتھ؟"

"آپ نہیں سمجھیں گے بھائی۔ آپ میں وہ چیز نہیں ہے۔ وہ جسے رومانٹک اسٹریک کہتے ہیں۔ ایسے آدمی کو بہت سی عورتیں، بہت سی لڑکیاں پیاری لگتی ہیں۔ وہ پتا نہیں کیسے ان میں انوالو ہو جاتا ہے۔ شروع میں لگتا ہے کہ بس ہیلو ہائے تک بات رہے گی۔ مگر پھر بڑے عجیب طریقے سے انوالومنٹ بڑھنے لگتی ہے۔ پتا نہیں کیسے۔"

"تم محبت کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں ں ں ں، مگر یہ کافی اخلاقی قسم کا نام ہے۔ اس کے پیچھے ڈرائیونگ فورس جو ہوتی ہے وہ تو کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن آدمی میں امپتھی ہو، اور جو عورت اسے اچھی لگ رہی ہو، اسے انڈرسٹینڈ کرنے کی کوشش بھی کرے تو پھر محبت ہی ہے جو آپ کو آگے راستے پر چلاتی ہے۔"

"پتا نہیں۔ محبت تو بہت قربانی وغیرہ مانگتی ہے۔ میں نے تو یہ محسوس کیا ہے کہ جب مجھے کوئی لڑکی چاہیے ہوتی ہے تو بس چاہیے ہوتی ہے۔ وہ مل جاتی ہے تو ہمیں جلد ہی پتا چل جاتا ہے کہ ہمیں دوستی کو آگے لے کر چلنا چاہیے یا نہیں۔ اور جب وہ نہیں ملتی تو میں اس کے لیے محبت تو نہیں فیل کرتا۔ بس یہ جی چاہتا ہے کہ اس کی ساری مزاحمت ٹوٹ جائے، اسے شکست ہو جائے۔ لیکن جب اسے شکست ہو جاتی ہے، تب میرا جذبہ بھی کم ہونے لگتا ہے۔"

"ابو میں بھی ایڈونچر کی ایسی ہی لہر تھی۔ مگر وہ اس لہر کو رومانٹی سائز بہت کرتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ تھوڑے مختلف تھے تم سے۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں وہ عورتوں کی طرف ایک معصومانہ سی شرارت کے ساتھ بڑھتے تھے اور ان کے دل و دماغ میں اس کی حیثیت اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی جتنی انھیں باہر سے دیکھنے والے شخص ان معاملات کو دیتے تھے۔"

"آپ کہنا یہ چاہ رہے ہیں کہ وہ عورتوں کے ساتھ سیریس نہیں ہوتے تھے؟"

"ان کے لیے یہ ایک ایڈونچر تھا، مگر وہ اسے رومانٹی سائز بہت کرتے تھے۔ جیسا کہ تم نے کہا کہ تم عورت کو شکست دینا چاہتے ہو، تو وہ شاید ایسا نہیں سوچتے تھے۔ وہ بڑا پوئٹک طریقے سے ڈیل کرتے تھے معاملات کو۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"ان کی ڈائریوں میں بہت سی عورتوں کا ذکر ہے۔ مگر ان کے نام انھوں نے عجیب عجیب لکھے ہوئے ہیں۔ پھر ان کے لیے کہیں شعر لکھے ہوئے ہیں کہیں اردو اور انگریزی میں فقرے۔ ان کی پڑھی ہوئی کتابوں کے حاشیوں میں بھی ایسی بہت سی باتیں انھوں نے لکھ رکھی ہیں۔" یہ بات سن کر میرے ذہن میں اپنی ڈائریاں اور تصویروں کے البم آ گئے۔ میں نے چاہا کہ اپنے ایڈونچرز کے بارے میں آفتاب بھائی کی رائے کو زیادہ ہمدردانہ بنانے کے لیے ان ڈائریوں اور البموں کے بارے میں بتادوں مگر میں خاموش رہا۔

"تو کیا ان کا ایڈونچر کبھی محبت کے مرحلے میں داخل نہیں ہوا؟"

"امی کو انھوں نے گاؤں میں دیکھا تھا تو وہ انھیں بہت خوبصورت لگنے کے ساتھ ساتھ بہت سگھڑ بھی لگی تھیں۔ انھوں نے فوراً ان کے ساتھ پوری زندگی بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ پھر ان کی زندگی آگے بڑھتی گئی تو انھیں اپنی اور ضرورتوں کا بھی احساس ہوا۔ عورتوں سے ایڈونچر وہ کرتے رہتے تھے، لیکن محبت اور میچور محبت انھیں شاید آنٹی سے ہی ہوئی۔ آنٹی سے، اور ہم سب بچوں سے بھی۔ امی سے بھی کرتے ہی ہوں گے مگر امی بہت اسٹرکٹ تھیں رہن سہن کے بارے میں۔ وہ تھوڑی آزاد زندگی چاہتے تھے۔"

"وہ بہت سی عورتوں میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور پھر امی سے پیار کا بھی دعویٰ کرتے تھے۔ عجیب بات ہے نا؟"

"محبت کا مل جانا بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ لیکن محبت مل جانے کے بعد کیا کیا جائے؟ میرا خیال ہے کہ ابو یہی بات طے نہیں کر پائے۔"

"محبت مل جانے کے بعد کیا کرنا چاہیے؟ وہ کہتے نہیں ہیں کہ دے لوڈ ہیپیلی ایور آفٹر؟"

"یہ کہانیوں کی باتیں ہیں۔ آدمی کو محبت مل جانے کے بعد بھی ایک بے قراری لگی رہتی ہے۔

اس لیے کہ محبت آپ میں ایک بہت بڑی انرجی بھر دیتی ہے۔ آپ اس انرجی کو حاصل کرنے کے بعد صرف ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر اور دن میں ایک دو بار سیکس کر کے بہت زیادہ مطمئن نہیں رہ سکتے۔ اسی لیے محبت کرنے والے کچھ ہی مہینوں بعد ایک دوسرے سے لڑنے لگتے ہیں۔"

"تو پھر محبت کرنے والوں کو محبت پانے کے بعد اور کیا کرنا چاہیے؟"

"ان کے سامنے کوئی مقصد، کوئی سمت ہونی چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ اپنی انرجی کو کسی پوزیٹو سمت میں ڈائریکٹ کر دیں۔ کچھ انرجی آپس کی محبت میں صرف کریں اور بہت ساری انرجی جو بچ جائے اس سے مل جل کر کوئی کام کریں۔"

"مثلاً کون سا کام؟"

"میں نے غلط کہا کہ پازیٹو سمت میں ڈائریکٹ کریں۔ تم دیکھو کہ بعض جرائم پیشہ لوگوں سے بھی خواتین محبت کر رہی ہوتی ہیں۔ کرپٹ سیاست دانوں سے بھی محبت کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ خواتین ان کے برے کاموں میں پوری طرح انوالو ہوتی ہیں اور اپنے ساتھی کی کامیابی کو خود بھی پوری طرح فیل کرتی ہیں، محسوس کرتی ہیں۔ مقصد یہ کہ محبت حاصل کر لینے کے بعد کسی نہ کسی ایکٹیویٹی میں انوالو ہونا چاہیے۔"

"چاہے وہ نگیٹو ایکٹیویٹی ہی ہو؟"

"نہیں، پازیٹو ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ زیادہ فل فلنگ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابو اور آنٹی کی زندگی میں یہی کمی رہ گئی تھی۔"

"یعنی ان کی محبت کی کوئی ڈائریکشن نہیں تھی؟"

"ہاں۔ دونوں نے محبت کی۔ ابو نے اپنی بیوی اور چار بچوں کو چھوڑ دیا۔ آنٹی سے شادی کر لی۔ پھر تم پیدا ہو گئے۔ بس۔ اس کے بعد دونوں کو کوئی ڈائریکشن ملی؟ نہیں ملی۔"

"تو کون سی ڈائریکشن مل سکتی تھی انھیں؟ ابو رومین کا ایک کام کر رہے تھے، وہی نہ کرتے رہتے تو اور کیا کرتے؟"

"ابو کو جوانی میں شاعری سے دلچسپی تھی، وہ دونوں مل کر کوئی لٹریری ایکٹیویٹی کر سکتے تھے۔ یا پھر آنٹی آثار قدیمہ میں ابو کی دلچسپی میں شریک ہو سکتی تھیں۔ یا پھر ابو ہی آنٹی کی کسی دلچسپی میں شریک ہو جاتے۔ شادی کے بعد دونوں کی دلچسپیاں الگ الگ ہی رہیں۔ جب مینٹل انرجی کو کوئی آؤٹ لیٹ

نہ مل رہا ہو تو وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو ابو کرتے تھے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً پارٹیز کرنا۔ عورتوں سے ملنا۔ انھیں رومانٹی سائز کرنا۔ یہ سب فیک ایکٹیویٹی ہے بھائی۔"

"یعنی اگر انھیں کوئی سمت مل جاتی تو کیا ان کی رومانٹک اسٹریک بھی ختم ہو جاتی؟"

"نہیں، ختم نہیں ہو جاتی۔ اسے کوئی اچھا سا آؤٹ لیٹ مل جاتا۔ مگر یہ گارنٹی نہیں دی جا سکتی کہ وہ پھر کسی عورت کو پسند ہی نہ کرتے۔" بھائی یہ آخری جملہ بولتے ہوئے ہنس دیے۔

"آپ نے جو آؤٹ لیٹ کی بات کی، اس سے مجھے ایک لڑکی کی بات یاد آ رہی ہے جو اس نے مجھ سے کہی تھی۔"

"وہ کیا؟"

"اس نے کہا تھا نماز پڑھا کرو، نماز برے کاموں سے روکتی ہے۔"

بھائی نے جواب میں صرف ہلکا سا ہنسنے پر اکتفا کیا۔

"آپ دونوں نے محبت حاصل کر لی۔ اب آپ ایک چھوٹے سے گوٹھ میں بیٹھے ہیں۔ آپ ابھی تو بہت مطمئن نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا دو سال بعد، چار سال بعد جب یہ رومانس دھیما پڑ چکا ہوگا تو آپ اس لائف سے بور نہیں ہو جائیں گے؟"

"ابھی بھی بہت سی نامطمئن کر دینے والی چیزیں ہیں۔ تمھاری بھابھی کو اپنی امی کی بہت یاد آتی ہے۔ وہ مجھ سے تو نہیں کہتی لیکن اکیلی ہوتی ہے تو چھپ کر رو لیتی ہے۔ اتنے خطرے کے باوجود وہ اپنی امی سے فون پر بات بھی کر چکی ہے۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جو پریشان کن ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم اس گوٹھ میں کتنا عرصہ رہیں گے۔ دنیا چھوٹی سی ہے۔ ہمارے شکاری کسی بھی وقت ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔ نہ بھی پہنچیں تو شاید ہم یہاں ساری عمر نہ رہیں۔ میں اخبارات میں آرٹیکلز لکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس طرح اپنے معاشرے کی بہتری کے لیے کچھ کنٹری بیوٹ کر رہا ہوں۔ سلمیٰ گوٹھ کی بچیوں کو پڑھاتی ہے اور سمجھتی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کنٹری بیوٹ کر رہی ہے۔"

"لیکن بھائی اس سے کیا فرق پڑے گا۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ جس انگریزی اخبار میں لکھتے ہیں اس کی پبلی کیشن کتنی ہے؟ صرف چھ سات ہزار۔ اور بھابھی اور آپ جس اسکول میں پڑھاتے ہیں

وہاں سے دس سال میں ایک ہزار بچے بھی پڑھ لیں تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟"

"اصل میں ہر آدمی کو بس اپنا کام کرنا ہے۔ سوسائٹی کو اس سے زیادہ فائدہ ہو رہا ہوتا اگر میں ایدھی سینٹر میں لگ جاتا۔ مگر آئی ڈونٹ فیل لائک ڈوئنگ دیٹ۔ میں غریبوں کی لمم بی سی قطار کو دیگ سے نکال نکال کر بریانی نہیں کھلا سکتا ہر روز۔ دیٹ مے بی آ گڈ تھنگ، بٹ آئی ایم ناٹ میڈ فور دیٹ۔ ہم میں سے ہر ایک کو انفرادی طور پر یہ طے کرنا ہے کہ وہ اپنی انرجی کو کیا پوزیٹو سمت دے سکتا ہے۔"

"بٹ ہم اپنی انرجی دوسروں کے لیے ویسٹ ہی کیوں کریں؟"

"دیکھو۔ یہ کینال دیکھ رہے ہو۔ اس کے پار، وہ دیکھو کھیت ہیں۔ اور ان کے بھی پار آموں کے باغ ہیں۔ اور باغ کے پیچھے چلتے جائیں تو دور ایک اور گوٹھ ہے۔ اور اوپر یہ دیکھو آسمان ہے۔ اور وہ دیکھو لوگ چلتے ہوئے آ رہے ہیں۔ تو یہ سارا فطرت کا کارخانہ ہے۔ ہم نے اس بہو ووت بڑے کارخانے میں تھوڑی سی بہت تھوڑی سی دیر وقت گزارنا ہے اور پھر چلے جانا ہے۔ ہمیں یہ کارخانہ اس سے بہتر حالت میں ملا تھا جس حالت میں ہم اسے اپنے بچوں کے لیے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یہ ہے ہماری ناکامی۔ ہر نسل کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ دنیا کو ایک بہتر دنیا کی صورت میں اپنے بچوں کے لیے چھوڑے۔ ہمیں دنیا کے، اور کائنات کے اور فطرت کے اس بڑے سے کارخانے سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ جیل ہونا چاہیے۔ اسی طرح ہم فطرت کو، اس خوبصورت فطرت کو فیل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس کی بہتری میں کنٹری بیوٹ کریں تو ہمیں اس کے ساتھ یگانگت کا احساس ہوگا۔"

"ہوں۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ شاید..."

"تم نے ہمارے گھر کے باہر آم کا پودا دیکھا ہے؟ پتا نہیں ہم یہاں رہیں یا نہ رہیں۔ یہ آم کا پودا بڑا ہوگا، اس پر آم آئیں گے اور یہ درخت لوگوں کی خدمت کرے گا۔ ابھی ہم اس کی سیوا کر رہے ہیں۔ اس کو پانی اور کھاد دیتے ہیں، پھر یہ ہماری سیوا کرے گا، ہمیں میوہ دے گا۔ فطرت کے ساتھ انسان کا تعلق یہی ہونا چاہیے۔"

"تو ہم شہر والے کیسے کنٹری بیوٹ کریں؟"

"شہر بھی اب فطرت یعنی لارجر فطرت کا ہی حصہ ہیں۔ شہر کے ساتھ بھی دوستی کی جا سکتی ہے۔ اس کی بہتری کے لیے کنٹری بیوٹ کیا جا سکتا ہے۔"

''اچھا بھائی۔ یہ تو بڑا مشکل کام بتا دیا آپ نے!''

''میں نے تمھیں سمت بتا دی ہے۔ اب بس تمھیں اپنی محبت کو حاصل کرنا ہے۔''

''اور اس کے بعد کیا کروں؟ کوئی سوشل ایکٹیویٹی شروع کر دوں؟'' میرے لہجے میں تھوڑا سا طنز بھی تھا۔

''نہیں۔ محبت خود تمھیں بتائے گی کہ تمھیں کیا کرنا ہے۔ اور آئی ہوپ سو۔ دیکھو محبت ہمیں اپنے سے باہر کی کسی چیز، کسی سیلف کو اون کرنا سکھاتی ہے۔ ہم کسی عورت سے محبت کرتے ہیں۔ یا اپنی اولاد سے، اپنے والدین سے، بہن بھائیوں سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے دکھوں پر دکھی ہوتے ہیں اور انھیں سکھی دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ لیکن عورت سے محبت کرنا ایک مختلف معاملہ ہے۔ یہ محبت اگر کسی مقام پر آ کر رک جائے تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ عورت سے محبت کی کامیابی یہ نہیں کہ اس سے شادی ہو جائے۔ بلکہ اس محبت کو پھر ایکس پینڈ ہونا چاہیے۔ ہمیں پھر اس کے بچے سے محبت ہونی چاہیے۔ اس کے گھر سے محبت ہونی چاہیے۔ اپنے محلے سے، اپنی دھرتی سے، اپنے لوگوں سے محبت ہونی چاہیے۔ ان سب کو بھی ویسے ہی اون کرنا چاہیے جیسے ہم اپنی محبوبہ کو کرتے ہیں۔''

''میں آج یہاں رہتا ہوں۔ کل کہیں اور رہنے لگوں گا۔ میرے ابو منڈی بہاء الدین میں رہتے تھے۔ امی ٹنڈو الہ یار میں رہتی ہیں۔ میں کراچی میں رہتا ہوں۔ آخر میں کس جگہ کو اون کروں؟''

''اون تو کسی بھی جگہ کو کیا جا سکتا ہے۔ الف لیلہ والے رچرڈ برٹن کو جانتے ہو تم؟''

''میں صرف الزبتھ ٹیلر والے رچرڈ برٹن کو جانتا ہوں۔''

''ہاں تو الف لیلہ جمع کرنے والا رچرڈ برٹن اپنی نوجوانی میں سندھ آیا تھا۔ وہ اس وقت سندھ کے اری گیشن سروے ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھا۔ اس نے پورے سندھ میں گھوم پھر کر یہاں کے لوگوں، ان کے رسم و رواج اور طرزِ زندگی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ تم سوچو، کتنا دلچسپ لگا ہوگا اسے یہ کام۔''

''مگر مجھے تو ان سندھیوں میں کوئی دلچسپی نہیں محسوس ہوتی۔ یہاں کی خواتین بھی سوکھی سڑی ہوتی ہیں۔''

''نہیں۔ ایسے جنرلائزیشن مت کرو۔ جنگل سے گزرے بغیر جنگل کو بے کار کہہ دینا بہت آسان ہے۔ لیکن اسے ایک نیچرلسٹ کی نظر سے دیکھو تو وہ پوری ایک کائنات ہے۔ جنگل تو جنگل، ویرانہ بھی

ایک پوری دنیا ہوتا ہے،'' انھوں نے کہا اور اپنے آگے بہت دور تک دیکھنے لگے۔

''دیکھو، تم یہ علاقہ دیکھ رہے ہو نا، کیسا ہرا بھرا ہے؟ لوگ پنجاب میں اور کراچی میں یہ سمجھتے ہیں کہ سارا سندھ ویران اور غیر آباد ہے۔ تمھیں پتا ہے اس علاقے کو ہرا بھرا کرنے میں کس کا کردار ہے؟''

''نہیں؟''

''ایک آدمی تھا جے جی فائف۔ اس کا نام سنا ہے تم نے؟ انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا تو وہ یہاں برطانوی فوج کی رائل انجینئرنگ کور میں ہوتا تھا۔ ان دنوں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے کا ایک سروے کیا گیا تو پتا چلا کہ یہاں ایک بہت بڑا دریا ہوا کرتا تھا، دریائے ہاکڑا، جو تھل کے ریگستان سے یہاں نارا کے صحرا تک پھیلا ہوا تھا۔ تو بھئی یہ جے جی فائف جو تھا، اس نے اپنی زندگی کے کوئی تیس سال ایک جدوجہد میں صرف کر دیے کہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر نہریں نکالی جائیں۔ تو پھر انگریزوں نے یہ نارا کینال نکالی اور اس سے اور بھی چھوٹی نہریں نکالی گئی ہیں جن میں جمراؤ کینال بھی ہے جس کے کنارے پر ہم اس وقت بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا مزہ لے رہے ہیں۔ اب دیکھو، فائف تو سندھی نہیں تھا لیکن یہاں کے لوگوں کو سب سے زیادہ فائدہ اسی نے پہنچایا۔ اور زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ اس نے یہ کام کوئی ثواب کا کام سمجھ کر نہیں کیا ہوگا۔ بس وہ یہاں بسا، اسے اس زمین سے، اس کے لوگوں سے محبت ہوئی ہوگی اور وہ چاہتا ہوگا کہ یہاں کا بیابان علاقہ کبھی سرسبز و شاداب ہو سکے۔ آج تم دیکھو، یہاں سے میرپور خاص تک اور ٹنڈو الہ یار تک صرف آموں کے ہی کتنے باغات ہیں۔ یہ سب اس ایک آدمی کی محبت کی وجہ سے ہی تو ممکن ہوا جو سندھ کا باشندہ تھا بھی نہیں۔''

''ہوں۔ اور اگر محبت کو ایکس پینڈ نہ کریں تو؟ تو پھر کیا ہوگا؟''

''تو جو محبت ایکس پینڈ نہیں ہوگی، وہ رک جائے گی۔ اور صرف رکی نہیں رہے گی، وہ پیچھے کی طرف سفر شروع کر دے گی۔ یوزلیس ہو کر رہ جائے گی۔ پھر دو محبت کرنے والے ایک دوسرے سے بور ہونا شروع ہو جائیں گے، اور...''

''تو جو لوگ محبت کرتے ہیں اور ان کی محبت ایکس پینڈ بھی ہوتی ہے، وہ کیا کبھی بور نہیں ہوتے؟''

''ہر چیز کا انجام موت اور فنا ہے۔ کسی کا پہلے، کسی کا بعد میں۔ خود یہاں کے لوگوں میں سے زیادہ تر کو جے جی فائف کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوگا۔ لیکن اس نے جو باغات لگوائے تھے وہ اب

بھی موجود ہیں۔ یہ سامنے دور تک جو پیڑ نظر آ رہے ہیں ان میں سے بہت سے ہمارے بعد بھی باقی رہیں گے۔ جب سے یہ کائنات بنی ہے، لاکھوں انواع فنا ہو چکی ہیں۔ زمین کو بھی ایک دن فنا ہو جانا ہے، اور زمین پر فنا ہونے والی آخری نوع انسان کی نہیں ہوگی۔ بہت سے حقیر کیڑے مکوڑے اور خشکی اور پانی کے بہت سے عجیب و غریب جانور، یہ ہمارے بعد بھی باقی رہ جائیں گے اور سوچا کریں گے کہ اس زمین پر ایک عجیب سی مخلوق رہتی تھی جو دو پیروں پر چلتی تھی اور جس نے اپنے کاموں کے لیے عجیب عجیب مشینیں بنائی تھیں۔"

13

میں بھائی کے احترام میں خاموش تھا لیکن ان کی باتیں مجھے قائل نہیں کر سکی تھیں۔ عورتوں سے ملنا، انھیں رومانٹی سائز کرنا فیک ایکٹوٹی کیسے ہو سکتی ہے؟ آفتاب بھائی بھی بس ایویں ہی ہیں۔ بھابھی اتنی خوبصورت ہیں اور بھائی نے لو میرج کی ہے تب بھی ان کے ایسے خیالات ہیں۔ اس دن بھابھی رات کو اکیلے میں جو رو رہی تھیں اس کی وجہ بھی شاید ایسی ہی کوئی بات ہو۔ پتا نہیں بھائی جیسے اَن رومانٹک آدمی کے ساتھ وہ خوش بھی ہیں یا نہیں۔ ہر آدمی اپنی بیوی کے ساتھ سانگھڑ کے کسی چھوٹے سے گوٹھ میں زندگی گزار کر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ ہو بھی جائے تو اس کی بیوی تو بالکل نہیں ہو سکتی۔ کم از کم میں تو بالکل مطمئن نہیں رہ سکتا تھا۔

بھائی سوچتے ہوئے جانے کہاں جا نکلے تھے۔ میں بس بیچ بیچ میں 'ہوں ہوں' کی آواز سے ہنکارا بھرتا رہا۔ وہ ایک دلچسپی چھوڑ کر کسی اور دلچسپی میں کھو سکتے تھے، بہت سی دلچسپیاں اپنا سکتے تھے۔ لیکن میں ان بہت ساری چیزوں میں دلچسپی محسوس نہیں کر پا رہا تھا جن میں دلچسپی لینے کی وہ مجھے دعوت دے رہے تھے۔ پھر بھی ان کی باتیں سننا اچھا لگ رہا تھا۔ پھر بھائی کھڑے ہو کر اپنی پینٹ کی پشت جھاڑنے لگے۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور ہم کھیتوں سے گزرتے ہوئے واپس ان کے گھر کی طرف چلنے لگے۔ سڑک پر ایک بیل گاڑی جا رہی تھی جس کی گردن میں بندھی گھنٹی کی ٹن ٹن شام کے دھندلکے اور خاموشی میں دور تک سنائی دے رہی تھی۔ مجھے کراچی یاد آیا جہاں شام کے اس وقت سڑکوں پر کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور لوگ دفاتر سے گھر واپسی کے لیے مرے جا رہے ہوتے ہیں، جہاں واپس آ کر

انھیں روٹیاں یا پلنگ توڑنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کرنا ہوتا۔ ہم گھر پہنچے تو وہاں لائٹ گئی ہوئی تھی۔ بھابھی نے لالٹین جلائی اور ہم نے اسے بیچ میں رکھ کر کھانا کھایا۔ بکری جگالی کر رہی تھی اور ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ فطرت کی پیدا کردہ اس ہوشیار نوع کو اپنی ہی طرح منھ چلاتے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ اس کے لیے زندگی میں شاید کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ کھاتی تھی اور اپنی نسل آگے بڑھاتی تھی۔ انسان کو دنیا میں بہت سے مسائل حل کرنا تھے۔ لیکن انھی مسائل نے تو اسے انسانیت کے شرف پر فائز کیا تھا۔ تو کیا مسائل کا ہونا ان کے نہ ہونے سے بہتر نہیں تھا؟ بھابھی نے مسالے ڈال کر بہت اچھی گوبھی بنائی تھی۔ لال آٹے سے بنی ہوئی روٹی کے ساتھ اس گوبھی کے نوالے چباتے ہوئے یہ سب سوچنے میں مجھے لطف آ رہا تھا۔

14

ہم جانے کون سی باتیں کر رہے تھے کہ بھابھی نے میرے راز میں بھائی کو شریک کرتے ہوئے کہا:

"اب جاوید کی شادی بھی کر دینی چاہیے۔ اس نے لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔"

میں نے کھسیانا سا ہو کر بھابھی کی طرف دیکھا اور تھوڑا سا احتجاج کیا لیکن انھوں نے کہا کہ ان کے اور بھائی کے درمیان کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔

"تو بھئی تم نے لڑکی کو پسند کر لیا تو اب آگے کیا مسئلہ رہ گیا ہے؟ کر ڈالو شادی!" وہ بولے۔

"وہ بہت نخرے والی ہے۔ پہلے اس نے ایگری کر لیا تھا، لیکن اب وہ پکڑائی میں ہی نہیں آتی۔"

"پر وہ ہے کون؟ کچھ پتا بھی تو چلے۔"

"آپ نے مشعال کو دیکھا ہے؟ وہ جو زندگی ٹی وی کی اینکر ہے؟"

"اچھا، ہاں!" وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولے۔ "اچھی ہے۔ اسمارٹ ہے۔ ذہین بھی ہے۔"

"تو اس سے میری اچھی بات چیت چل رہی تھی۔ لیکن جب سے وہ اینکر بنی ہے، اس کے نخرے ہی ہائی فائی ہو گئے ہیں۔"

"کیوں؟ کیا کہتی ہے؟"

''بس اسے تبدیلی کا جنون چڑھا ہوا ہے۔ کہتی ہے اسے بہت سا کام کرنا ہے تا کہ پاکستان میں رئیل چینج لا سکے۔''

''دیکھو جاوید، ورکنگ ویمن کو تھوڑا روم چاہیے ہوتا ہے۔ اگر تم اسے پسند کرتے ہو تو تمھیں اسے یہ روم دینا پڑے گا۔ اسے سپورٹ کرنا پڑے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اس سے محبت کا دعویٰ کرو اور پھر شادی کے بعد اسے گھر بٹھا دو۔''

15

جاوید نے بھابھی کو مشعال کا نمبر دیا تھا۔ بھابھی نے مشعال سے بات کی تو وہ جلدی میں تھی، لیکن اپنی چھٹی والے دن مشعال نے خود انھیں فون کیا اور انھوں نے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ اس فون کال کے نتیجے میں مشعال جاوید سے ایک ملاقات کرنے پر راضی بھی ہو گئی۔ وہ دونوں کراچی کے ایک شاپنگ مال کے کیفے ٹیریا میں ملے۔ مشعال نے آنکھوں پر کالا چشمہ لگا رکھا تھا تا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے، پھر بھی جاوید کو لگا جیسے بہت سے لوگ اسے بار بار دیکھ رہے ہیں۔ مشعال نے ہرے رنگ کی قمیض اور سیاہ شلوار پہن رکھی تھی اور اس نے جاوید کو بولنے کا موقع بہت کم دیا تھا۔ وہ اپنے پروگرام پر بہت خوش تھی اور جاوید اس کی باتوں کے بجائے اسے دیکھنے میں مگن تھا۔ وہ بہت پر اعتماد اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس نے دکان پر جا کر آرڈر بھی خود دیا تھا اور جاوید نے محسوس کیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان طاقت کا توازن مشعال کے حق میں ہو چکا ہے۔ آخر مشعال نے پوچھا کہ اس نے اسے وہاں کیوں بلایا ہے۔

''ہم نے جو بات سوچی تھی وہ بہت پہلے سے میں تم سے کہہ چکا ہوں۔ میرا خیال ہے اب اسے آگے بڑھانا چاہیے۔''

''دیکھو جاوید،'' اس نے اپنا چشمہ بالوں پر چڑھایا اور جاوید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی، ''میں تمھیں لائک کرتی ہوں، لیکن مجھے جو یہ ایک نئی زندگی ملی ہے، میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔ اب یہ تمھیں ڈیسائڈ کرنا ہے کہ تم اسے کہاں تک الاؤ کر سکو گے۔''

''میرا خیال ہے کہ مجھے اس میں کوئی پرابلم نظر نہیں آتی۔''

''دیکھو، میں لیٹ آورز میں گھر آتی ہوں، آؤٹ سٹیشن جانا پڑتا ہے مجھے، وہاں کئی کئی دن رہنا

پڑتا ہے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں۔ سنبھال لیں گے،'' جاوید اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولا

''آؤٹ آف کنٹری بھی جا چکی ہوں، اور اس میں اضافہ ہی ہو گا۔ جاؤں گی بھی اکیلی!''

اس بات پر جاوید کچھ بے چین ہوا لیکن اس نے اپنے ہونٹوں سے غیر اختیاری طور پر ''نو پرابلم'' ہی نکلتے ہوئے پایا۔ مشعال اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی:

''یو نو واٹ یو آر سے اِنگ؟''

''آئی نو فور شیور!''

''تمھیں مجھ میں کیا چیز اچھی لگتی ہے؟''

''تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو!''

''اوہ کم آن۔ یہ بات تو مجھے روز دس لوگ کہتے ہیں۔ آئی ایم فیڈ اپ ود دس کریپ۔''

''مگر میں نے تو یہ بات ان سب سے پہلے کہی تھی،'' جاوید نے اپنے اندر امڈتے حسد کو دباتے ہوئے کہا۔

''اور؟ اس کے علاوہ؟ واٹ ایلس؟''

''اور ذہین ہو۔ آئی تھنک وی کین گیٹ الانگ ویری ویل ٹو گیدر۔''

''تم میرے پروگریمز دیکھتے ہو؟''

''ہاں دیکھتا ہوں۔ تم بہت خوبصورت لگ رہی ہوتی ہو۔ لوگوں سے لڑتی ہوئی۔ خواتین کے حقوق پر زیادہ ہی جوش میں آ جاتی ہو۔ تمھاری ڈریسنگ بھی اچھی ہوتی ہے۔''

مشعال مسکرا دی اور اپنے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔ ''تم ویسے ہی ہو۔ آئی لائک دس۔ بٹ زندگی صرف پسند کرنے سے نہیں کٹ سکتی۔ یو ہیو ٹو انڈرسٹینڈ مائی کنوکشنز۔ میں جو کچھ سوچتی ہوں اس میں شریک ہونا پڑے گا تمھیں۔''

مشعال کے جسم سے ایک والہانہ قسم کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ اپنی گردن پر پڑے بالوں کو بار بار اپنی ہتھیلی سے اٹھا کر درست کرتی تو لگتا کہ وہ خوشبو کو اپنے چاروں اور چھڑک رہی ہے۔ پھر وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اپنی گود میں رکھ لیتی جس سے اس کی گود میں ان کی جگہ سی بن گئی تھی۔ وہاں سے ان ہتھیلیوں

کے اٹھنے، بالوں کو چھونے اور پھر ایک دوسری میں اکٹھی ہو کر پھر سے گود میں جا گرنے نے ایک موسیقی سی پیدا کر دی تھی۔ گود کے نیچے اس کی سیاہ شلوار بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کے دونوں گھٹنے ملے ہوئے تھے اور اس کی نسبتاً چوڑی پشت کے بالمقابل ایک اہرام جیسا مثلث بنا رہے تھے۔ گھٹنوں کے نیچے اس کی ٹانگیں ایک دوسری سے جڑی ہوئی تھیں اور یوں وہ کسی نہایت متوازن پینٹنگ کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ جب وہ ہتھیلیاں اس گود سے نکلیں تو ان کی جگہ وہاں پر وہ اپنا سر رکھ دے۔ ایک مکھی جانے کدھر سے ان کی ٹیبل کی طرف آ گئی تھی۔ جاوید نے اسے اڑانے کے لیے وہ ہاتھ ہلایا جس میں اس نے کانٹا پکڑ رکھا تھا اور اپنے کانٹے کو مشعال کی جانب زمین پر گرا دیا۔ وہ فوراً اٹھا اور مشعال کی کرسی کے نیچے سے کانٹا اٹھانے لگا۔ خوشبو کی ایک لہر اس کے نتھنوں سے ٹکرائی جو مشعال کے جسم سے آنے والی خوشبو سے کہیں زیادہ زوردار تھی۔ جاوید کو محسوس ہوا کہ اس خوشبو کا منبع مشعال کی پشت اور گود ہی ہے۔ کانٹا اٹھا تو مشعال کا منہ غصے سے سرخ تھا اور وہ کاؤنٹر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جاوید نے اس کی گود کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کی خوشبو سے ایک بھرپور سانس بھرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

مشعال ویٹر کو بلانا چاہتی تھی مگر جاوید نے منع کر دیا۔ مشعال اپنے ملک کا سسٹم بے کار ہونے اور لوگوں میں سوک سینس نہ ہونے کا شکوہ کرنے لگی۔ جاوید کافی کے سپ لیتا ہوا اس کی باتیں سنتا اور بیچ بیچ میں ہنکارا بھرتا رہا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہیں اسے چومنا شروع کر دے جس سے مشعال کو یہ پتا لگ جائے کہ وہ کتنی فالتو قسم کی بکواس کر رہی ہے۔ اس نے اس کے وی شیپ گریبان کو دیکھا جس میں ایک ہلکی سی لکیر جھلملا رہی تھی جس کی مشعال کو خبر تھی اور نہ شاید پروا۔ مشعال کافی پیتے ہوئے کہیں اور دیکھنے لگی اور جاوید اس کا چہرہ، اس کا جسم دیکھتا رہا جو کچھ بھرا بھرا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اس سے حسد بھی محسوس ہوا اور اس کو لگا جیسے مشعال کو چھوئے بغیر اس کا گزارا نہیں ہوگا۔ جب وہ دونوں اٹھے تو وہ مشعال کے پیچھے ہو لیا۔ اس کا ہاتھ مشعال کی پیٹھ کو چھو گیا۔ دونوں ایک اور شاپ پر گئے تو جاوید نے مزید پیش رفت کی کوشش کی، مگر اسے محسوس ہوا کہ مشعال اس کا لمس پاتے ہی الگ ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ مشعال کے قریب بھی ہونے کی کوشش کرتا تو وہ آگے نکل جاتی۔ دونوں الیکٹرک سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے تو وہاں رش تھا۔ جاوید جانتا تھا کہ یہاں مشعال کہیں بھاگ نہیں سکے گی اور وہ یہاں اپنی خواہش پوری کر سکے گا۔ وہ مشعال کے بالکل پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ مشعال کے آگے ایک اور

عورت اور اس کے بچے تھے اور اس کے لیے آگے بڑھنے کی جگہ نہیں تھی۔ جاوید نے اپنا ہاتھ اس کی کولھوں پر رکھا اور پھر ان کے درمیان میں ٹکا دیا۔ اسے خوشگوار حیرت ہوئی کہ مشعال ذرا بھی نہیں ہل رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سیدھا کیا اور اپنے کوٹ کی اوٹ میں اس کی پشت پر پھیرنے لگا۔ اس نے شلوار کے نیچے انڈر ویئر پہنی ہوئی تھی اور اس کی پیٹھ کی ملائمت اس سے چھن کر اس کی ہتھیلی تک پہنچ رہی تھی۔ الیکٹرک سیڑھی ختم ہوتے ہی مشعال تیزی سے پلٹی۔ اس کا چہرا لال سرخ تھا:

"وٹ دا فک آر یو ڈوئنگ؟ ہیں؟ وٹ دا فک؟"

"میں؟" جاوید بھونچکا رہ گیا۔ اسے مشعال سے اس کی توقع نہیں تھی۔ مشعال کی آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ آس پاس کے ایک دو لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن انھیں معلوم نہیں ہوا ہوگا کہ معاملہ کیا ہے۔

"دیکھو! آئی ایم گوئنگ مائی وے،" اس نے سر کو مضبوطی سے نیچے کیا اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے اسے انتباہ کرتے ہوئے بولی۔ "ڈونٹ فالو می۔ ڈونٹ کم نیئر می!" اس کی آواز رندھنے لگی۔ وہ خلافِ توقع اس بات کا لحاظ بھی نہیں رکھ رہی تھی کہ اردگرد کچھ لوگ اسے سن رہے تھے اور کچھ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اینڈ ڈونٹ ٹرائی ٹو سی می ایور اگین!" یہ آخری الفاظ بولتے ہوئے اس کی سرخ ہو چکی ہوئی آنکھوں میں سے ایک میں آنسو امڈ آیا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے دور چلی گئی۔ جاوید شرم کے مارے وہیں کھڑا رہ گیا اور پھر کنفیوژن میں ایک دکان اور پھر دوسری دکان میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

16

بھابھی کا فون آنے پر مشعال کافی خوش تھی۔ جاوید کو وہ اپنے لیے کافی بہتر خیال کرتی تھی لیکن اسے صرف ایک خدشہ تھا، اور وہ یہ کہ جاوید اس کے کریئر میں مداخلت نہ کرے جسے وہ اب بہت انجوائے کر رہی تھی۔ اسے بڑی بڑی پارٹیوں میں مدعو کیا جاتا تھا جہاں سیاست دان اور ملکی اشرافیہ کے بڑے اس سے بہت خوشی سے ملتے تھے۔ اپنے آپ کو یکا یک اتنی اہمیت ملنے پر اس نے خود میں توانائی

کی ایک نئی لہر محسوس کی تھی اور خود کو بہت پر اعتماد محسوس کرنے لگی تھی۔ کچھ ہی مہینوں میں اس کے پاس ان بڑوں کے دیے ہوئے کارڈوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا جنھیں وہ بڑی احتیاط سے، بہت سے چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں سنبھالتی تھی۔ پھر اس نے ان ڈبوں کو مختلف پیشوں کے حساب سے تقسیم کیا اور ان پر سیاست دان، فوج، بیوروکریسی، سول سوسائٹی، کھلاڑی، صحافی، سفارت کار وغیرہ لکھ دیا۔ ایک ڈبے پر کوئی نام نہیں لکھا تھا۔ اس میں وہ ان لوگوں کے کارڈ رکھتی تھی جو اسے بہت دلچسپ لگے تھے۔ اس میں اظہار دلچسپی کرنے والے مردوں کی تعداد کافی زیادہ تھی، لیکن ان میں سے زیادہ تر مرد اسے عیاش قسم کے لگتے تھے جو اسے فتح کر کے اپنے کوٹ پر ایک نیا پھول لگانے کے آرزومند تھے۔ ایسے مردوں کی نیت جان لینے کے باوجود مشعال ان سے خوش دلی سے ملتی۔ ان سے مصافحہ کرتی، ان کے ساتھ فوٹو یا سیلفی بنواتی اور کبھی کبھار ان کی کسی پارٹی میں آنے کی دعوت بھی قبول کر لیتی۔ لیکن اس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ کسی ایسے مرد کے ساتھ اکیلے میں ملاقات نہیں کرے گی۔ اسے خبریں ملتی رہتی تھیں کہ اس کی کچھ حریف اینکر خواتین ایسا کرتی ہیں، مگر وہ دل میں انھیں برا جانتی اور طے کرتی کہ وہ ایک اچھے گھرانے سے آئی ہے اس لیے وہ ویسا کچھ نہیں کرے گی جیسا اس کی حریف کرتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سب کچھ نہ کرنے کے باوجود اس کی حریف اینکر اور دیگر خواتین میں اس سے متعلق بھی کہانیاں مشہور تھیں۔ بنیادی طور پر یہ پاکستان کے کلچر کا حصہ تھا جہاں ہر خاتون خود کو نیک پارسا اور متعدد دوسری خواتین کو چھنال سمجھتی تھی۔ جس پہلے سیاست دان نے مشعال میں دلچسپی ظاہر کی تھی اور جو جاوید کا جذبہ حسد ابھارنے کا باعث بنا تھا، اس کا معاملہ کہیں کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ مشعال نے اپنی ناتجربہ کاری میں اس سے ملاقات بھی کی تھی جس میں وہ بہانے بہانے سے اسے چھونے کی کوشش کرتا رہا تھا اور اس نے اسے اپنے ساتھ امریکہ چلنے کی دعوت بھی دے دی تھی جس کا مطلب صاف تھا۔ مشعال نے اس کی پیشکش پر غور بھی کیا لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کا ایسا کوئی دورہ میڈیا میں چھپا نہیں رہے گا اور اس سے اس کی نیک نامی پر حرف آئے گا۔ اس ناکامی کو دیکھ کر اس سیاست دان نے اسے اپنے ساتھ ناران کاغان لے جانے کی پیشکش کی، مگر مشعال نے اسے بھی ٹال دیا۔ اس کی ایک سیاسی گھرانے میں شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنی بیوی کو جاہل مطلق قرار دیتا تھا۔ مشعال کی بہت تعریف کرنے کے باوجود اس نے کبھی اس بات کا اشارہ تک نہ دیا تھا کہ وہ مشعال سے شادی کا خواہش مند ہے۔ مشعال نے سوچا بھی

تھا کہ اگر وہ زیادہ دل جمعی سے اس کے پیچھے لگا رہے تو اسے ایک محفوظ مستقبل دے سکتا ہے، لیکن حیرت انگیز طور پر مشعال میں اس کی دلچسپی کم ہوتی گئی۔ دوسرے لوگوں سے ملتے ہوئے مشعال نے احتیاط کی اور بند جگہوں پر ان سے ملنے سے گریز کیا۔ تاہم ان میں سے جو لوگ اسے کسی ریسٹورنٹ یا کیفے میں ملتے ان میں سے کچھ اسے چھونے کی کوشش ضرور کرتے۔ ان سے گلے مل کر رخصت ہونا شروع میں ایک ناخوشگوار عمل تھا جسے وہ ان سے جان چھڑانے کا تاوان سمجھ کر کرتی تھی مگر بعد میں وہ اسے معمول کا حصہ سمجھ کر انجام دینے لگی۔

اس دوران جاوید کا خیال مسلسل اس کے ساتھ رہا۔ وہ اسے ایس ایم ایس کرتا جس کا جواب وہ فوری نہ دیتی تاہم دیتی ضرور۔ بھابھی کا فون آیا تو وہ اپنی چھٹی کے دن اس سے ملنے پر آمادہ ہو گئی۔

17

اس روز صبح وہ اٹھی تو اس نے اپنی طبیعت مضمحل پائی۔ اس کے سر میں گردن کے قریب سے ایک ٹیس اٹھ رہی تھی۔ وہ واش روم گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے بے قاعدہ پیریڈز نے اپنے آغاز کے لیے اس مرتبہ وہی دن منتخب کیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں غصے کی ایک لہر امڈ آئی۔ اس کی بلیڈنگ بے قاعدہ تھی اور مہینے کے بیس دن گزرنے کے بعد اس کا ہر دن اس خدشے میں گزرتا تھا کہ آج اس کی بلیڈنگ ہوگی اور کتنی ہوگی۔ اس بلیڈنگ کی ناگوار بو کم از کم اس کے اپنے تیز نتھنوں میں واضح طور پر محسوس ہوتی رہتی تھی جسے سونگھ سونگھ کر اس کا غصہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا تھا۔

دس بجے صبح اس کی جاوید سے ملاقات طے تھی اور وہ آخری وقت میں اسے ملتوی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ جاوید میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سے ملے مگر ایسے کہ جاوید کو پتا چلے کہ وہ کسی قیمتی چیز کا متمنی ہے اور اس کے لیے اسے ایکسٹرا محنت کرنا پڑے گی۔ اس نے طے کیا کہ وہ بہت زیادہ لیوش کپڑے نہیں پہنے گی اور جاوید سے اپنی ایمیشن کے بارے میں بات کرے گی۔ اس نے اپنے لیے ہلکا ناشتہ بنایا اور وارڈروب سے ایک ہرے رنگ کی قمیض نکالی جو وہ گھر میں زیب تن کیا کرتی تھی۔ اس نے ہلکا میک اپ کیا اور اس کا ارادہ تھا کہ پرفیوم بھی کم لگائے گی۔ مگر پھر اس کے تیز نتھنوں میں اسے اپنی نسوانی بو محسوس ہوئی۔ غصے کی ایک اور لہر کے ساتھ اس نے ایک

انڈر ویئر نکال لی۔ اسے پہنا اور پھر اسے چھپانے کے لیے ایک سیاہ شلوار بھی۔ پھر اسے بھی ناکافی جان کر اس نے پرفیوم کی خاصی مقدار اپنے انڈر ویئر پر چھڑک لی۔ ملاقات کے دوران جاوید نے جب اس کی چیئر کے نیچے سے کانٹا اٹھانے کی کوشش کی تھی تو غصے کی یہی لہر ایک مرتبہ پھر اسے محسوس ہوئی تھی۔ وہ جاوید کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا کر بھی مطمئن نہیں ہوئی تھی کیونکہ جاوید نے اس کے کام کے بارے میں کسی جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کے بجائے وہ اس کے جسم کے مختلف حصوں کو گھور گھور کر دیکھتا رہا تھا، جیسے اشرافیہ کے لوگ پارٹیوں میں کرتے تھے۔ وہ جاوید کو کچھ مختلف دیکھنا چاہ رہی تھی۔ کچھ انڈر سٹینڈنگ، کچھ کوآپریٹو، جس پر وہ اپنے مستقبل کے لیے اعتماد کر سکتی۔ ملاقات کے بعد نکلتے ہوئے اس نے اسے چھونے کی کوشش شروع کر دی۔ مشعال چاہتی تھی کہ وہ ایسا نہ کرے۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ ساری کی ساری اس کی ہونا چاہتی ہے، وہ کچھ صبر کرے اور اس کی ایمبیشن پوری کرنے میں اس کا ساتھ دے۔ لیکن جاوید تو جیسے کوئی موقع ضائع نہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ الیکٹرک سیڑھی سے نیچے اترتے ہوئے اسے جب جاوید کا ہاتھ محسوس ہوا تو وہ لرز کر رہ گئی۔ وہ اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن جب سیڑھی ختم ہوئی تو وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

18

جی ہاں، مشعال سے مایوس ہونے کے بعد جاوید کو زرینہ کا خیال ایک بار پھر آیا تھا۔ گلشن اقبال والا مالک مکان ایک دن اچانک اس کے مکان پر آیا تھا اور مکان میں جا بجا فلمی ہیروئنوں کی تصویریں لگی دیکھ کر اسے جاوید اخلاقی حوالے سے کافی مشکوک سا نظر آیا۔ اس نے اسے کہا کہ وہ خود اس فلیٹ میں شفٹ ہونا چاہتا ہے اس لیے وہ مکان چھوڑ دے۔ جاوید بھی اپنی توجہ زرینہ سے ہٹا کر مشعال پر مرکوز کرنا چاہتا تھا کیونکہ زرینہ نہ تو اس سے ٹھیک طرح مل رہی تھی نہ اس کی جان چھوڑ رہی تھی۔ اسے یہ خبط ہو گیا تھا کہ صادق ایک جن ہے اور وہ اب چاہتی تھی کہ جاوید اس کی کاؤنسلنگ کرے اور لمبی لمبی فون کالز کے ذریعے سمجھائے کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جاوید میں سوشل ورک کا ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا اور وہ بھی ایسے میں جب زرینہ اس سے صحیح طرح ملاقات سے بھی انکاری ہو چکی تھی۔

کچھ ہی دنوں میں اس نے صدر میں زینب مارکیٹ کے قریب ایک فلیٹ کرائے پر لیا اور اپنا

تھوڑا سا سامان اٹھا کر وہاں شفٹ ہو گیا۔

اب اسے ایک مرتبہ پھر زرینہ کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ شاید اس نے صادق کے جن ہونے کا خبط اپنے ذہن سے نکال دیا ہو اور وہ کوئی فائدہ مند عورت ثابت ہو سکتی ہو۔ اس نے ابتدا زرینہ کو ایس ایم ایس کرنے سے کی مگر اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ دو تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ پھر اس نے ایک روز اسے کال ملائی تو معلوم ہوا کہ وہ نمبر اب کسی کے استعمال میں نہیں۔ ایک روز وہ صبح سویرے اس کے گھر کی جانب چل دیا۔ زرینہ کے گھر کے باہر بہت سی چپلیں پڑی ہوئی تھیں اور اندر سے قرآن پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جاوید ہچکچایا اور اس نے سوچا کہ وہ وہاں سے واپس چلا آئے لیکن پھر اس نے دروازہ کھٹکھٹا ہی دیا۔ اسکارف سے سر ڈھانپے ایک لڑکی نکلی تو اس نے اسے زرینہ بھابھی کو بلانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد زرینہ دروازے پر آئی۔ اس نے ایک چادر کو اسکارف بنا کر اپنے سر کے گرد لپیٹا ہوا تھا اور وہی چادر اس کے سینے پر بھی پڑی تھی۔

"زرینہ بھابھی... میں... وہ... صادق بھائی سے ملنے آیا تھا۔"

اسے دیکھتے ہی زرینہ کے چہرے پر پہلی دراڑ درد کی آئی لیکن پھر وہ مسکرائی اور کہا کہ اندر گھر میں ذکر ہو رہا ہے۔ جاوید کو خاموش کھڑے کچھ دیر ہو گئی تو وہ بولی کہ "صادق تو گھر پر نہیں ہیں"۔ اس کی ہچکچاہٹ سے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ گھر کے اندر نہیں بلایا جائے گا بلکہ زرینہ کے جواب میں جو سپاٹ لہجہ تھا اس کا مطلب یہ کہنا تھا کہ اسے کھڑے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے اب وہ واپس کیوں نہیں جا رہا۔

"صادق بھائی کہاں ہیں؟"

"ہوں گے کسی مزار پر،" زرینہ نے طنز سے کہا۔ "ویسے آج کل قرآنی اوراق اکٹھا کرنے والی تنظیم کے ساتھ ہیں۔ دن بھر ادھر اُدھر سے پرزے جمع کر کے گھر میں لاتے ہیں اور پھر کہیں بلوچستان کے پہاڑوں میں جا کر رکھ آتے ہیں۔"

"یہ قرآن خوانی کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟" کچھ دیر بعد جاوید نے پوچھا۔

"میں مہینے میں ایک بار کراتی ہوں۔ اس کے بعد ذکر ہوتا ہے۔ اللہ ہو، اللہ ہو کا ورد کرتے ہیں ہم سب۔ بہت سکون ملتا ہے،" زرینہ نے سرور سے سر کو گھماتے ہوئے کہا۔ جاوید پھر کچھ دیر خاموش رہا۔ اسے لگ رہا تھا کہ زرینہ کی خاموشی اسے باہر کی طرف پُش کر رہی ہے کہ وہ اب وہاں سے چلا

جائے۔ وہ جلدی سے ذہن میں وہ تمام باتیں لانے لگا تا کہ ان میں سے فوری اور نہایت ہی ضروری قسم کی باتیں اس سے جلدی جلدی پوچھ ڈالے۔

''میں آپ کا موبائل ٹرائی کرتا رہا۔ مل ہی نہیں رہا تھا؟''

''وہ گن پوائنٹ پر چھن گیا ایک دن۔ میں گلی میں سبزی لینے گئی تھی۔ دولڑکے بائکوں پر آئے اور میرا پرس چھین کر چلے گئے۔ موبائل بھی اسی میں تھا۔ پیسے بھی تھے،'' زرینہ ایسے بولی جیسے وہ اچانک ملنے والے دو پڑوسی ہوں اور ان کے درمیان آس پڑوس میں رہنے والے دو افراد، یا ایک دوسرے کو معمولی سا جاننے والے دو افراد جیسا تعلق ہی رہا ہو۔

جاوید نے بے دلی سے افسوس کا اظہار کیا۔

''تو نیا موبائل تو لیا ہوگا آپ نے؟'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پھر نکالتے ہوئے کہا تا کہ یہ تاثر پیدا ہو کہ وہ بھی اب جلدی میں ہے۔

''ہاں لیا ہے۔''

''تو وہ نمبر مل سکتا ہے؟''

زرینہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی جسے اس نے کوشش کر کے دبالیا۔

''نمبر تو مل سکتا ہے، لیکن میں زیادہ بات وات نہیں کر سکوں گی۔''

''کیوں؟''

''بس، میرا جی نہیں چاہتا اب۔ خیر، ابھی مجھے جلدی ہے اور صادق بھی نہیں ہیں۔'' باہر کی جانب اسے جو پُش محسوس ہو رہی تھی وہ اس جملے سے باقاعدہ دھکے میں تبدیل ہو گئی تھی۔

''اچھا اچھا میں چلتا ہوں۔ تو آپ اپنا نیا نمبر دیں گی؟''

''مجھے اپنا نمبر یاد نہیں،'' اس نے کہا اور اندر کی طرف جھانکا جہاں ایک لڑکی اسے سیپارہ ختم ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔ ''ہاں بیٹا، دوسرا سیپارہ اٹھالو'' زرینہ نے اسے کہا اور پھر سوالیہ نظروں کے ساتھ جاوید کی طرف مڑی جیسے پوچھ رہی ہو کہ 'تم اب تک یہیں کھڑے ہو؟ جاؤ گے نہیں؟'

''یاد آ گیا تو میں تمھیں سینڈ کر دوں گی،'' شاید وہ نمبر دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرنے کے لیے کچھ ٹائم چاہ رہی تھی۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔ صادق بھائی کو سلام کہیے گا۔''

''اچھا۔ وعلیکم السلام،'' زرینہ نے پھر سے اندر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے دوبارہ جاوید کی طرف دیکھا تو وہ اپنا چہرا موڑ چکا تھا۔ وہ بے دلی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

''یہ جاوید ہے۔ یہیں رہتا تھا نا؟ ہاں ہاں وہی۔ صادق سے ملنے آیا تھا۔''

زرینہ کی آواز ہر اترتی ہوئی سیڑھی کے ساتھ دھیمی پڑتی جا رہی تھی اور پھر وہ اندر کی آوازوں میں تحلیل ہو گئی۔

19

وہ کہانی جو جاوید کی جانب سے مشعال کی پشت کی تعریف میں ایک انگریزی جملے سے شروع ہوئی تھی وہ ایسے ٹریجک موڑ پر کیسے پہنچ گئی؟ جاوید اگلے کئی روز اس بات پر غور کرتا رہا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ اسے بھابھی کو بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ بھابھی نے خود ہی ایک روز مشعال کو فون کیا تو مشعال نے انھیں صاف بتا دیا کہ ''ہی ٹرائیڈ ٹو گروپ می''۔ جاوید نے بھابھی کو مشعال سے بات کرنے سے منع کیا تھا لیکن بعد میں اسے اندازہ ہو گیا کہ بھابھی نے مشعال سے بات ضرور کی ہوگی۔ وہ ایسا شرمندہ تھا کہ ایسی شرمندگی اسے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں انسان کسی دوسرے زاویے سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ وہاں سے اسے سمجھ میں نہیں آ رہی ہوتیں۔ مشعال کو ہائی جیننگ رہنے کا خبط تھا۔ جب جاوید کے ہاتھ نے اس کے انڈرویئر کو محسوس کیا تو وہ غصے سے بھر گئی۔ ایک ایسی چیز جس نے اسے ہمیشہ سے شرم کا، اَن ہائی جیننگ ہونے کا اور اپنے پیشے میں ایک طیش دلانے والی رکاوٹ کا احساس دلایا تھا، وہ براہ راست ایک ایسے آدمی کے تجربے میں آ گئی تھی جس کے بارے میں اس نے زندگی میں اتنا زیادہ سنجیدگی سے سوچا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جاوید کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کے جسم سمیت کہیں دور بہت دور پھینک دے۔ وہ ملاقات کے دوران جاوید سے بہت زیادہ مطمئن نہیں ہوئی تھی، لیکن اس نے خود سے یہی کہا تھا کہ وہ اس بارے میں مزید سوچے گی۔ تاہم جاوید کی پیش رفت نے اسے ایسا اشتعال دلایا کہ وہ ایک ایسے فیصلے کا اعلان کر گئی جس پر وہ بعد میں پوری طرح مطمئن تو نہ ہو سکی لیکن جس کے بعد جاوید کی طرف مراجعت کے لیے اسے خود کو بہت زیادہ بے شرم قرار دینا پڑتا۔

مشعال کیا سمجھتی ہوگی کہ میں صرف ایک سیکشوئل اینمل ہوں؟ جاوید سوچتا۔ وہ اب مشعال کا سامنا کرسکتا تھا نہ کرنا چاہتا تھا۔ جاوید نے مشعال کے رویے کے بارے میں دنیا کی ہر ہر بات سوچ لی مگر وہ اس کی شرم، اس کی لجا کے بارے میں کبھی نہیں جان سکا۔

20

نہیں، ایسے نہیں۔ مشعال سے ملاقات کے بعد کی کہانی کا کچھ حصہ سنانے کا یارانہ جاوید کو ہے، نہ تخلیقی فوطے خشک کر چکے راوی کو۔ اس لیے وہ کہانی مجھ سے سنیے۔ مشعال سے جاوید کی ملاقات کے اگلے روز اسے بھابھی کا فون آیا تھا۔ بھابھی نے اس سے مشعال کے بارے میں پوچھا۔ جاوید نے کہہ دیا کہ بات نہیں بنی۔ بھابھی نے پوچھا کہ تم نے مشعال کو تنگ تو نہیں کیا۔ انھوں نے 'تنگ' کا لفظ یوں ادا کیا کہ جاوید بھی سمجھ گیا کہ ان کا مطلب کیا تھا۔ جاوید نے جواب دینے میں تاخیر کی تو بھابھی خود ہی بولیں:

''بہت افسوس کی بات ہے، جاوید۔ تم ذرا سا صبر نہیں کر سکتے تھے؟''

''جی وہ... میں نے تو کچھ ایسا نہیں کیا،'' جاوید نے کہا اور بھابھی نے اس سے پھر بات کرنے کا کہہ کر فون رکھ دیا۔

اس کے بعد جاوید بوجھل قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آیا اور بہت دیر مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد میرے سامنے بیٹھے بیٹھے اپنے دل ہی دل میں بھابھی سے یوں مکالمہ کرنے لگا۔

''اچھا تو بھابھی، مشعال نے آپ کو بھی بتا دیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی تبدیل ہو گئی ہے۔ پتا نہیں کون سے آسمان پر رہتی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہ اب میرے کام کی نہیں رہی۔ میں اس سے شادی کر بھی لوں گا تو مجھے یونہی تڑپائے گی۔ میں اس سے شادی کر بھی لوں تو ہم خوش نہیں رہ پائیں گے۔ نہ وہ، نہ میں۔ لیکن مجھے مشعال کی ضرورت بہت ہے بھابھی۔ آپ نہیں سمجھیں گی۔ آپ تو بس یہی کہیں گی ناں کہ مجھے بس مشعال میں سیکس کی تلاش ہے؟ ہے۔ وہ بھی ہے۔ لیکن میں اس سے محبت بھی کرتا ہوں۔ میں اس کی زندگی کی فلم میں سیکنڈری قسم کا کردار ادا کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ وہ پارٹیز میں جائے گی اور میرا انٹروڈکشن کرائے گی: 'یہ ہیں میرے ہسبینڈ۔ فلانے ٹی وی میں رپورٹر ہوتے ہیں۔' اور میں جھینپتے ہوئے اپنا کارڈ آگے بڑھاؤں گا اور مجھے ایسا محسوس ہوگا جیسے میرا وہ کارڈ بہت چھوٹا ہو۔ رات کو وہ مجھے

اپنی نئی کامیابیوں کے قصے سنایا کرے گی اور میں خاموش ہو کر انھیں سنتا رہوں گا، پھر سنتے سنتے اس کے کپڑے اتارنے لگوں گا اور وہ کرنے لگوں گا اور وہ بولے جائے گی، بولے جائے گی، بولے جائے گی.... بہت شوق ہے اسے بولنے کا۔ میرے پاس اس کی بولتی بند کرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ میں بھی خوش، وہ بھی خوش۔ لیکن وہ بہت زیادہ خوش نہیں رہے گی مجھ سے۔ میں بھی جلا کروں گا، مجھے بھی پتا ہے۔ ابھی مشعال کہاں ہوگی؟ ابھی مشعال کس کے ساتھ ہوگی؟ مجھے پتا ہے کہ مشعال کو حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنا ہی جذبہ مارنا پڑے گا۔ پتا نہیں وہ عورتیں اپنا یہ جذبہ کیسے مارتی ہیں جن کے میاں بہت کامیاب ہوتے ہیں اور یہاں سے وہاں گھومتے رہتے ہیں۔ امی کو بھی یہی محسوس ہوتا ہوگا اسی لیے وہ پاپا سے الگ ہو گئیں۔ آپ بتائیں ناں بھابھی۔ آپ کے میاں تو پاپا پر تحقیق کر رہے ہیں ناں!

''ٹھیک ہے بھابھی، آپ بھی ناراض ہو جائیں۔ مشعال بھی مجھ سے ناراض ہے۔ آفس والے بھی ناراض ہیں کہ میرا کام میں دل نہیں لگ رہا۔ پتا ہے بھابھی، اگر مجھے سیکس مل جائے، اور میری پسند کا سیکس مل جائے تو مجھے لگتا ہے کہ میں دنیا کا ہر کام کر سکتا ہوں۔ میں اپنی آفس کی جاب میں انٹرسٹ لے سکتا ہوں۔ مگر آپ 'تبدیلی' والوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آپ، آفتاب بھائی، مشعال، یہ سب تبدیلی والے ہیں۔ یہ پاکستان کو تبدیل کر سکتے ہیں، لیکن میرا مسئلہ حل نہیں کر سکتے۔ ہمارے لوگ بہت بھوکے ہیں۔ یہاں سے بھی اور یہاں سے بھی۔ پہلے اس بھوک کو ختم کرنا ہوگا بھابھی۔ اور آپ تبدیلی والے؟ کیا آپ کو بھوک نہیں لگتی؟ آپ کیا خیالات کے ساتھ سیکس کرتے ہیں؟ اگر آفتاب بھائی ٹُنڈے ہوتے تو کیا آپ ان کے ساتھ مطمئن زندگی گزار پاتیں؟ بڑی آئیں تبدیلی کی باتیں کرنے والی! اور بھوک کا پتا تب چلتا ہے جب ایک الگ قسم کا کھانا سامنے رکھا ہو۔ کوئی سوئی ہوئی بھوک ہوتی ہے جو کسی نئے اور منفرد سے کھانے کو دیکھ کر جاگ جاتی ہے۔ مجھ میں تو دس قسم کی عورتیں دس مختلف قسم کی بھوک پیدا کر دیتی ہیں۔ آپ؟ آپ سے بھی بہت باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کدھر آفتاب بھائی کو مل گئیں؟ چلیں، مل گئیں تو مل گئیں۔ مگر ہم ایک ہی ایج گروپ کے ہیں۔ جیسے آپ مجھ کو سمجھ سکتی تھیں اور میں آپ کو سمجھ سکتا تھا، ویسے آفتاب بھائی آپ کو یا مجھ کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ یہ باتیں آپ کو سمجھانا آسان ہوگا کیونکہ آپ تبدیلی والی ہونے کے باوجود زمین پر رہتی ہیں۔ مشعال تو آسمان پر رہتی ہے۔ اسے یہ باتیں ابھی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ کون سی باتیں؟ یہی بھئی کہ پہلے بھوک کا مسئلہ حل کر لو۔

ابھی اگلے دن کوئی اینکر کہہ رہا تھا کہ کراچی میں بھوک کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ ایدھی، چھیپا، سیلانی، پتا نہیں کس کس نے شہر میں مفت لنگر کھول رکھے ہیں۔ لوگ آتے ہیں اور عزت سے کھاتے ہیں۔ سیلانی والے تو صرف بکرے کا گوشت کھلاتے ہیں۔ ارے آپ چاہے جو مرضی کر لیں، کھانے والے کو بھی پتا ہے کہ یہ بھیک ہے۔ اور بھوک صرف روٹی کی نہیں ہوتی۔ یہ اتنا سارا گلیمر جو آپ ٹی وی پر دکھا رہے ہیں یہ بھی تو بھوک بڑھا رہا ہے۔ کپڑوں کی بھوک، جوتوں کی بھوک، اسٹیٹس کی بھوک اور عورت کی بھوک۔ پتا نہیں یورپ والوں کی بھوک ختم ہوئی یا نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہاں بھوک کو باعزت طریقے سے ختم کرنے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ کسی لڑکے کو لڑکی کی بھوک ستاتی ہے تو وہ سیدھا اس کے پاس جا کر اس سے دوستی کی خواہش ظاہر کر دیتا ہے۔ وہ کہیں تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں اور پھر اف دے فیل لائک تو وہ لڑکی یا لڑکے کے اپارٹمنٹ میں چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ ون نائٹ اسٹینڈ ہوتا ہے اور کبھی گاڑی آگے تک چلتی رہتی ہے۔ ایسا کچھ انتظام چاہیے یہاں پر۔ میں اور مشعال ایک دوسرے کے ساتھ کچھ دن، کچھ گھنٹے تو رہ سکیں تاکہ وہ پرکھ سکے کہ میں صرف جنسی درندہ نہیں ہوں۔ میں رومانس کا آدمی ہوں۔ مجھے وہ اچھی لگتی ہے۔ دلیری سے بات کرتی ہے۔ پتا نہیں... شاید میں اسے اوور پاور کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ پتا تو اس کے بعد ہی لگے گا ناں کہ میری اس سے محبت کتنی گہری ہے۔ ابھی تو محبت ایک شدید ضرورت ہے۔ جیسے بہت شدید بھوک لگی ہوئی ہو۔ مگر یہ سب کیسے ہوگا بھابھی؟ اور اب؟ اب یہ کیسے ہوگا بھابھی؟ آپ کیا مجھ سے یہ ساری باتیں نہیں سن سکتیں؟ اور کچھ نہیں تو میں اپنے دل کا بوجھ ہی ہلکا کر لیتا۔ آپ سے گلے لگ کر رو ہی لیتا۔ آپ بھی تو رو رہی تھیں ناں اس رات، جب میں آپ کے کمرے میں آیا تھا۔ آپ کو بھی کسی کی یاد ستاتی ہے ناں؟ اپنے امی ابو کی ہی سہی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا دکھ سمجھ سکتے ہیں۔ ہیں نا؟"

بھابھی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اتفاق میں اپنے سر کو جنبش دی۔ یہ اشارہ پاتے ہی جاوید نے بھابھی کو گلے لگایا اور انھیں ان کے بستر سے اٹھا کر قریب ہی کھڑا کر دیا۔ پھر اس کے ہاتھ ان کی کمر پر پھسلنے لگے۔ وہ ہاتھ نیچے جانے لگے اور انھوں نے بھابھی کی پشت کو چھو لیا۔ کولھوں کی دبازت اس کی انگلیوں کو سکون دینے لگی۔ جاوید کی ایک آنکھ آنسو سے بھر گئی۔

یکا یک وہ میرے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمپیوٹر کے پاس گیا اور انٹرنیٹ آن کر دیا۔ کچھ

دیر میں کمرے میں آواز گونجنے لگی:

"تیہو میں تیہو۔ دل میرا لے لو۔ دل دینے آئی۔ لے لو جی لے لو۔"

جاوید کے دکھی چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ آ گئی۔

21

اپنی زندگی کے آخری دن بے نظیر بھٹو لیاقت باغ میں جلسے سے خطاب کرنے کے بعد اسٹیج سے نیچے اتری تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، لیکن دل میں وہ ایک تلخی سی محسوس کر رہی تھی۔ اسٹیج سے اترنے سے پہلے اسے خیال آیا کہ اسے ان افراد کا خصوصی شکریہ ادا کر دینا چاہیے جو اس کی تقریر کے دوران اٹھ کر جانا شروع نہیں ہو گئے اور اب تک جلسہ گاہ کے اندر موجود ہیں۔ اس نے ان کی طرف دیکھ کر اپنا دایاں بازو ہوا میں لہرایا اور اسٹیج سے نیچے اترنے لگی۔

مری روڈ سے دیکھیں تو لیاقت باغ کے بائیں ہاتھ ایک دروازہ ہے۔ وہاں اس کی پجیرو کھڑی تھی۔ بے نظیر اس میں بیٹھی اور سوار ہو کر چل دی۔ ابھی پجیرو نے نصف میل ہی کا فاصلہ طے کیا تھا کہ جیے بھٹو کے نعرے لگاتے ہوئے درجنوں افراد نے اس کی پجیرو کا راستہ روک لیا۔ ایسے جیالوں کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ وہ بے نظیر کی ایک جھلک دیکھ لیں یا اس کے ہلتے ہوئے ہاتھ کی رسید حاصل کر لیں۔ بے نظیر اپنی لافانیت میں سے ایک لمحہ ان عام لوگوں کے لیے وقف کرتی تو وہ خوشی سے نہال ہو جاتے اور اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے۔ کچھ روز پہلے کشمور کے قریب انھی جیالوں کے بھائی بندوں نے جب سنا کہ بے نظیر سپر ہائی وے کے راستے پنجاب جا رہی ہے اور اس کا کشمور میں جلسے کا کوئی پروگرام نہیں تو وہ سڑک پر لیٹ گئے تھے۔ بے نظیر اب ان کے جسموں پر سے گاڑی گزار کر ہی آگے جا سکتی تھی، اور ظاہر ہے ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنی پجیرو سے باہر نکلی تھی اور میگا فون ہاتھ میں لے کر ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔

لیاقت باغ کے باہر جیے بھٹو کے نعرے لگانے والے نوجوانوں کی محبت کی رسید دینے کے لیے بے نظیر نے اپنی پجیرو سے سر باہر نکال کر ان کی طرف ہاتھ ہلانے کا فیصلہ کیا۔ اندر مخدوم امین فہیم، ناہید خان اور صفدر عباسی بیٹھے تھے۔ دن بھر کی مصروفیات کے بعد اب وہ سب کسی قیام گاہ پر پہنچنے کی جلدی

میں تھے اور انھوں نے بے نظیر کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وہ موقع تھا جب اس کے قاتلوں نے صورتِ حال کو اپنے مقصد کے لیے اپنے قابو میں کر لیا۔

کارکن اس کی پجیرو کے پیچھے لٹکے ہوئے تھے اور کچھ لینڈ کروزر کی چھت پر سوار تھے۔ گاڑی کے آگے پیچھے دائیں بائیں نعرے لگانے والوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں بالا بھی شامل تھا۔

22

صادق بھائی اس روز کمیٹی چوک کے پاس حضرت شاہ جہاں محمد بادشاہ المعروف ٹلیاں شاہاں کی درگاہ پر بیٹھے تھے۔ ایک فقیر نے انھیں سردائی گھول کر دی تھی جسے پی کر وہ کچھ سرور میں تھے۔ باہر مری روڈ پر چہل پہل تھی۔ بہت سے لوگ لیاقت باغ کے باہر لگے اسپیکروں سے بے نظیر کا خطاب سن رہے تھے اور بہت سے مری روڈ پر مٹرگشت کر رہے تھے جس پر آج لوگوں کا قبضہ تھا۔ سہ پہر کی اس گہما گہمی اور سردائی کے سرور نے صادق بھائی پر غنودگی سی طاری کر دی۔ اسی غنودگی کے دوران انھیں مزار میں ایک ایسا لڑکا نظر آیا جو انھیں کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ غنودگی کے درمیان آنکھیں کھول کر انھوں نے اس لڑکے کو دیکھنے کی کوشش کی تو وہ مزار سے باہر کی طرف بڑھا۔ صادق بھائی اٹھ کر اس کے پیچھے چلے اور مزار کے دروازے تک پہنچے تو وہ لڑکا مری روڈ پر لیاقت باغ کی جانب جاتا دکھائی دیا۔ صادق بھائی نے وہیں سے "پکڑو، پکڑو" کا شور مچانا شروع کر دیا۔ لوگ سمجھے کہ کسی نے ان کا موبائل چھین لیا ہے۔ دو تین لوگ ان کے پاس آئے جن کے سبب صادق بھائی کا ویو بلاک ہوا اور وہ لڑکا ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"میں نے... میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے..."

"کس کو؟ کس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟" ایک شخص بولا۔

"بابا جی، اِدھر سب ایک دوسرے کو اپنی آنکھوں سے ہی دیکھ رہے ہیں نا؟" ایک اور شخص پنڈی کے مخصوص لہجے میں بولا۔

"وہ... وہ کچھ کرنے والا ہے... مجھے چھوڑ دو۔"

"او وہ بابا جی اساں کی کرن تے دیو کج او" دوسرا شخص بولا۔

"میکی تے ایہہ پاگل لگنا!" پہلے نے دوسرے کو بتایا۔

صادق بھائی بازو سے اشارے ہی کرتے رہ گئے لیکن دو تین آدمیوں نے انھیں زبردستی پکڑ کر فٹ پاتھ پر بٹھا دیا۔ اتنے میں مزار کے احاطے سے ایک فقیر نکلا اور صورت حال معلوم کرنے کے بعد بولا:

"اساں کی سردائی پیائی اے۔ سرے تے نئیں چڑھ گئی؟"

اس پر باقی لوگوں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اگلی آواز ایک زوردار دھماکے کی تھی جس میں ان کا قہقہہ دب کر رہ گیا اور وہ صادق بھائی کو وہیں چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔

23

میں نے وہ منظر اپنے دفتر کی ایڈیٹنگ مشین پر بار بار دیکھا ہے۔ اتوار کے دن جب دفتر میں کام بہت کم ہوتا تھا، میں اس پوری وڈیو کو ایڈیٹنگ مشین پر رکھتا اور ٹائم لائن پر اسے بڑا کر کے ایک ایک فریم غور سے دیکھتا۔

وہ وڈیو کسی نے موبائل سے بنائی تھی اور بے نظیر کے مرنے کے بعد سوشل میڈیا پر وائرل ہو گئی تھی۔ ہمارے چینل نے بھی اسے یوٹیوب سے اٹھایا تھا۔ وڈیو میں بے نظیر گاڑی کے سن روف سے اپنا سر باہر نکالتی ہے اور لوگوں کے نعروں کا جواب دے رہی ہے۔ گاڑی کے آگے پیپلز پارٹی کے جیالے ہیں جو والہانہ رقص کر رہے ہیں۔ دو تین لوگ موبائل سے فلمیں بنا رہے ہیں۔ گاڑی کے اوپر بھی کارکن سوار ہیں اور انھوں نے گاڑی کو اردگرد سے بھی گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بے نظیر اپنے دونوں ہاتھ اوپر لے جا کر اپنے دوپٹے کو سمیٹ کر سر پر اور آگے لاتی ہے۔ پاکستان میں وہ اس بارے میں بہت حساس رہتی ہے کہ اس کا دوپٹہ اس کے سر سے ڈھلکنے نہ پائے۔ آج اس نے اپنے سر پر دوپٹہ آخری مرتبہ سیدھا کیا ہے۔

گاڑی آگے بڑھتی ہے تو بائیں ہاتھ پر ایک شخص اپنا بازو اوپر کرتا ہے۔ اس ہاتھ میں پستول ہے اور وہ سیدھا فائر بے نظیر کی کھوپڑی کی جانب کرتا ہے۔ پہلے فائر سے اردگرد موجود لوگ حیران رہ جاتے ہیں جبکہ گاڑی پر بیٹھے افراد بھی متوجہ ہوتے ہیں۔ پہلا فائر بے نظیر کی کھوپڑی کے برابر سے زن کر کے نکل جاتا ہے۔ میں اس شاٹ کو اتنا میکسی مائز کرتا ہوں کہ اس کے پکسل پھٹنے لگتے ہیں۔ ایک

فریم میں اس کے پستول سے شعلہ نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے، یہ فائر کا لمحہ ہے۔ یہ شاٹ بے نظیر کو نہیں لگتا۔ میں یہ واضح طور پر دیکھ سکتا ہوں۔

دوسرا شاٹ بھی بے نظیر کے سر کے اوپر سے یا برابر سے نکل جاتا ہے۔ تیسری آواز ایک زوردار دھماکے کی ہے جس کے ساتھ ہی منظر کی فلم بندی کرنے والے کیمرے اور موبائل فون لڑکھڑا جاتے ہیں اور ان کی اسکرینیں دھندلا جاتی ہیں۔ بعد میں تفتیش کاروں نے بتایا تھا کہ دھماکے کے وقت اس شخص نے ایک تیسرا فائر بھی کیا تھا، لیکن زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ شاٹ بھی بے نظیر کو نہیں لگا۔

دھند چھٹی تو بے نظیر کی گاڑی پر پیلٹ کے سیکڑوں نشانات تھے اور بے نظیر کا لینڈ کروزر کی چھت سے نکلا ہوا سراپ وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ دھڑام سے پچیرو کے اندر جا گری تھی۔ گوگل پکچرز پر اس کی گاڑی کے بہت سے شاٹس ہیں۔ اس کے ٹائر پنکچر ہو چکے تھے اور پچیرو کے اندر گری بے نظیر کے سر سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا اور ایک سفید سا مادہ بھی نکل رہا تھا۔

ڈرائیور نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی لیکن پنکچر شدہ ٹائروں پر اس کی اسپیڈ بہت کم تھی۔ گاڑی ٹائروں کے رِم پر چلتی رہی۔ اس گاڑی کے آگے رحمان ملک کی گاڑی تھی جو فوراً رفو چکر ہو گئی۔ ایک چینل پر اس نے اپنے بیپر میں کہا کہ بے نظیر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، مگر کچھ دیر بعد ہمارے رپورٹر بتا رہے تھے کہ ایک گاڑی اسپتال لائی گئی ہے جس میں بے نظیر کو بھی زخمی حالت میں لایا گیا ہے۔ وہ گاڑی شیری رحمان کی تھی۔ دھماکے کے بعد اپنی گاڑی بھگا کر نکل جانے کے بجائے وہ بے نظیر کی گاڑی کے قریب ہی رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ بے نظیر کی لینڈ کروزر تیز نہیں چل رہی تو اس نے لینڈ کروزر رکوائی اور اس میں موجود لوگوں کو پیشکش کی کہ وہ زخمی بے نظیر کو اپنی گاڑی میں ڈال کر لے جائے گی۔ بے ہوش اور بے سدھ پڑی بے نظیر کو اس کی گاڑی میں لٹایا گیا اور گاڑی تیزی سے راولپنڈی جنرل اسپتال کو روانہ ہو گئی۔

اسپتال میں ڈاکٹروں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ انھوں نے اس کا سینہ چاک کر کے اس کے دل کی دھڑکن بحال کرنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ بے نظیر دھماکے کے لمحے جب دھڑام سے اپنی لینڈ کروزر کے اندر جا گری تھی، شاید اسی لمحے اس کی زندگی کی کہانی بھی ختم ہو گئی تھی۔

24

بالا بے نظیر کی گاڑی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا دائیں ہاتھ میں موجود ایک بٹن پر تھا۔ اسے سگنل ملا تھا کہ پہلا فائر ہوتے ہی وہ یہ بٹن دبا دے گا۔ گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، وہ گاڑی کے ساتھ تیز تیز چلنے لگا۔ پہلے فائر کی آواز سنتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا اور اس لمحے وہ یہ بھی بھلا بیٹھا کہ اس کی آواز سنتے ہی اسے اپنے دائیں ہاتھ کا بٹن دبا دینا ہے۔ دوسرے فائر کی آواز کے ساتھ ہی اسے یاد آ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ مجمع میں کسی عورت کی چیخ بلند ہوئی تھی اور اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کی ماں ننگے سر ایک چیخ کی طرح اپنے دروازے سے باہر نکلی ہے اور اس نے اسے اُس گالی سے پکارا ہے جو بالے کو اس کا باپ دیا کرتا تھا۔ عورت کی چیخ سن کر بالے نے اپنے منہ میں کڑواہٹ سی محسوس کی۔ اسے کوڑ چڑھ گئی اور اس نے ایک عزم کے ساتھ اللہ اکبر کہتے ہوئے اپنے ہاتھ میں موجود بٹن دبا دیا۔ بٹن دباتے ہی اس نے خود کو فضا میں بلند ہوتے ہوئے پایا۔ اسے کسی قسم کے درد کا کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن اس کے جسم کے باقی اعضا اس کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ اس کے ساتھ بہت سی اور چیزیں بھی فضا میں پرواز کر رہی تھیں۔ ان میں ایک کتاب بھی تھی جس کا رخ بالے کی کھوپڑی کی طرف تھا۔ کتاب اس کی کھوپڑی سے ٹکرائی اور بالے کی آنکھوں کا رخ آسمان سے زمین کی طرف ہو گیا۔ زمین سے اوپر اڑنے والی تمام چیزوں نے زمین کی طرف اپنا سفر شروع کیا۔ بالے کی کھوپڑی میں کھلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ وہ بھی زمین کی جانب مراجعت کر رہی ہیں۔ کھوپڑی زمین پر گری اور پھر ٹپا کھا کر ایک طرف کو لڑھک گئی۔ بالے کے باقی ماندہ شعور کو آخری احساس ایک ٹھڈے کا ہوا جو بھاگتے ہوئے کسی شخص کا تھا۔ کیا ہے یہ سب؟ اس کے ذہن میں ایک سوال ترتیب پا سکا تھا لیکن اس سوال کو کوئی لفظ نہیں مل سکا تھا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں خوف اور سوال کا یہ تاثر باقی رہ گیا۔ دھماکے سے اڑنے والی گرد، جسے تپش نے سیاہ کر ڈالا تھا، اس کی آنکھوں میں جمنے لگی اور اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں غبار آلود اندھیرا تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔

ریسکیو والوں نے اس کی کھوپڑی کو اٹھایا تو اس کی پوری طرح کھلی ہوئی آنکھوں میں راکھ بھری ہوئی تھی۔

25

راوی: اقبال محمد خاں کی صبح

رات کے چار بجے ان کی آنکھ کھلی تو انھوں نے اپنی بندوق اٹھائی، گیراج سے جیپ نکالی اور رسول بیراج کا رخ کیا۔ وہ بیراج سے کچھ فاصلے پر اس ویران قطعے کو دیکھتے رہے جس میں پچھلے سال انھیں دنوں میں ان کی ملاقات عالمگیر سے ہوئی تھی۔ پھر انھوں نے اپنی جیپ بیراج اور ویران قطعے کے درمیان سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور خود اس سے نیچے اتر آئے۔ وہ ویران قطعے میں چلتے چلے گئے اور کچھ دور جا کر زمین پر بیٹھ گئے۔ رات کی تاریکی میں انھیں جھینگروں کے ٹرانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایک شکاری ہونے کے سبب تاریکی سے انھیں ڈر نہیں لگتا تھا لیکن آج انھیں اس تاریکی اور اس کی خاموشی میں سے جھینگروں کے ٹرانے کی آواز بہت طلسمی محسوس ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنا رک سیک زمین پر رکھا اور اس پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ جھینگروں کی آواز انھیں لوری سی دینے لگی۔ نم زمین کی ٹھنڈک ان کی پشت میں اترنے لگی۔ ایسا ہی انھیں پہلے بھی تو کبھی محسوس ہوا تھا۔ کہاں؟ وہ سوچنے لگے۔ پھر انھیں دور دراز کی ایک یاد آئی۔ مراد آباد میں ایک بڑا سا پریڈ گراؤنڈ ہوتا تھا، پولیس پریڈ گراؤنڈ۔ ابا انھیں صبح ہی صبح اپنے ساتھ دوڑ لگوانے لے جاتے تھے۔ ان دنوں زیادہ لوگ ایکسرسائز بھی نہیں کرتے تھے۔ ابا فِٹ رہنا پسند کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بیلٹ ذرا سی بھی ڈھیلی ہو تو انگریزی بھی ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ ننھے اقبال محمد خاں کچھ دیر تو ابا کے ساتھ ساتھ دوڑتے، پھر تھک کر زمین پر لیٹ جاتے۔ نم زمین کا ٹھنڈا ٹھنڈا لمس ان کی پشت میں سرایت کرتا جاتا۔ یہ زمین بھی میری اپنی ہے اور وہ زمین بھی میری اپنی تھی۔ اُس زمین کی مٹی میں کھیلتے ہوئے بھی تو ایسا ہی اپنا پن محسوس ہوتا تھا، پھر وہ زمین پرائی کیسے ہو گئی؟ ریٹائرمنٹ کے بعد میں ضرور وہاں جاؤں گا۔ وہاں کی مٹی کو چوموں گا۔ وہاں پھر سے کھیلوں گا۔ پتا نہیں وہاں وہ پریڈ گراؤنڈ اب موجود ہوگا کہ نہیں۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے کراچی بھی تو جانا ہے۔ سلطانہ اگر کراچی میں رہنے کی شرط پر میرے پاس واپس آ گئی تو کیا میں انکار کر سکوں گا؟ حالانکہ مجھے ان میدانی علاقوں کی کھلی فضا پسند ہے اچھی اور کیا چیز ہوگی؟ ہر نیا تعلق پچھلے تعلق کو توڑنے پر کیوں اصرار کرتا ہے؟ مراد آباد، منڈی بہاء الدین، سلطانہ، امتل، عالمگیر... میرے سارے بچے یہ سب ایک ساتھ کیوں نہیں ہو سکتے؟ کسی سے تھوڑا کسی سے زیادہ کیا ہوگا مگر ان سب سے

پیار کیا ہے میں نے۔ لیکن سلطانہ... سلطانہ میں پتا نہیں کیا الگ تھا۔ امتل میرے موڈ کو سمجھتی تھی مگر وہ کبھی میرے دل کی موج کے ساتھ ساتھ رواں نہ ہو سکی۔ سلطانہ میں ایڈونچر پسند کرنے والوں جیسی دلیری تھی۔ ہاں شی واز مائی بیسٹ فرینڈ اینڈ بیڈ۔ شی واز دا بیسٹ۔ پتا نہیں اتنی سی بات پر وہ کیوں اتنی زیادہ ناراض ہو گئی؟ بات کچھ اتنی بڑی تو نہیں تھی۔ میرے اتنے سارے رومانٹک ایڈونچرز کے مقابلے میں ذرا سی ہی تو تھی وہ بات!

اقبال محمد خاں کو وہ دن یاد آ گئے جب وہ سلطانہ کے ساتھ تھے۔ جب بھی وہ دونوں اکیلے ہوتے انھیں جو پہلی چیز سوجھتی تھی وہ کوئی ایسی شرارت ہوتی تھی جو ان دونوں کے جسموں کو ایک دوسرے سے ملا دے۔ سلطانہ ساتھ تھی تو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معمولات کا کوئی مطلب، کوئی معنی بھی تھا۔ اس کے بعد، اس کے بغیر بظاہر بڑے بڑے اہم کاموں میں سے بھی معنی تحلیل ہو گئے تھے۔

اقبال محمد خاں کچھ دیر اپنی یادوں کے حصار میں رہے اور مسکراتے رہے۔ ''شاید زندگی کے بھی کوئی معنی نہیں۔ اتنے بڑے آسمان کے نیچے بہت چھوٹی سی زمین اور اس زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر لیٹا ہوا یہ میں! جو دن محبتوں کے ساتھ کٹ گئے، وہی اچھے تھے۔ ورنہ ان کے علاوہ زندگی کے بھی کوئی معنی نہیں... '' وہ مسکراتے ہوئے سوچتے رہے۔ جانے کب انھیں نیند کی جھپکی سی آ گئی۔ انھیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کے سامنے ایک عورت کھڑی ہے۔ شاید سلطانہ... شاید عالمگیر... نیلے رنگ کی شرٹ اور سیاہ رنگ کی جینز۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ عورت اپنی شرٹ کے بٹن کھول دے۔ ان کے خواہش کرتے ہی عورت کے ہاتھ اپنی شرٹ کے بٹن کی جانب بڑھتے ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ سلطانہ ہے یا عالمگیر۔ اور اگر عالمگیر ہے تو اس نے جینز اور شرٹ کیوں پہن رکھی ہے؟ وہ سوچتے ہیں کہ عورت سے خود ہی پوچھ لیں، لیکن عورت اتنی اپنائیت سے انھیں دیکھ رہی ہے کہ وہ سوچتے ہیں کہ اس کا نام کنفرم کرنا اس کا دل توڑنے کے مترادف ہوگا۔

''میں پانی میں ڈبکی لگانے جا رہی ہوں۔ چلیں گے؟'' عورت ان سے پوچھتی ہے۔

اقبال محمد خاں پر سستی حاوی ہے اور وہ اس لمحے بس اسے دیکھتے رہنا چاہتے ہیں۔ وہ طے کرتے ہیں کہ اسے عالمگیر ہی ہونا چاہیے۔ تو وہ عالمگیر ہو جاتی ہے۔ عالمگیر کے ہاتھ اپنی جینز کی طرف بڑھتے ہیں اور جینز کے ساتھ ہی اس کی لانژری بھی نیچے آ رہتی ہے۔ ''عالمگیر بہت مُوڈ ہو گئی ہے... '' اقبال محمد

خاں سوچتے ہیں اور وہ ننگ دھڑنگ رسول جھیل کی طرف دوڑتی چلی جاتی ہے۔ پانی میں اس کے کودنے سے زوردار چھپا کا ہوتا ہے جس سے اقبال محمد خاں کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

اقبال محمد خاں ہڑبڑا کر اٹھتے ہیں اور اپنی گھڑی دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انھیں بس دو تین منٹ کی جھپکی آئی ہوگی۔ اتنے سے عرصے میں انھوں نے کیسا عجیب و غریب خواب دیکھا... وہ سوچتے ہیں۔ پھر وہ کھڑے ہو کر اپنے سامنے جھیل کو دیکھنے لگتے ہیں۔ جھیل ساکت ہے اور اس کے اوپر آسمان بھی خاموش۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ انھوں نے عالمگیر کو مغربی لباس میں کیوں دیکھا؟

انھیں یاد آتا ہے کہ اس خواب جیسا ہی ایک منظر انھوں نے کسی پرانی فلم میں دیکھا تھا۔ منظر انھیں یاد آ جاتا ہے۔ ہالی وُڈ کی کسی انگریزی فلم میں گاؤں کی ایک لڑکی ہے جسے بہت کھلی ڈلی دکھایا گیا ہے۔ دو دوست ایک ساتھ اس لڑکی کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ دونوں سے پیار کرتی ہے لیکن ان میں سے کسی سے بھی شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اقبال محمد خاں اپنے ذہن میں اس لڑکی کا نام لانے کی جدوجہد کرنے لگتے ہیں۔ جھیل کی طرف بھاگتی ہوئی ننگ دھڑنگ عورت کی پیٹھ سے اس کا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ ہاں مَولی۔ مَولی نام تھا اس کا۔ اور فلم کا نام *Lovin' Molly*۔ سلطانہ کے ساتھ ہی تو مل کر دیکھی تھی یہ فلم۔ جب وہ وی سی آر پر مل کر فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ انگریزی، فرنچ، ہالی وُڈ، بالی وُڈ، سب۔ ہاں تو مَولی دونوں دوستوں سے شادی سے انکار کر دیتی ہے مگر باقی کسی چیز سے اسے انکار نہیں۔ لیکن مَولی کا اصلی نام کیا تھا؟ کوئی مشہور ہیروئن تو تھی نہیں وہ۔ فلم بھی کچھ خاص نہیں تھی۔ ہاں یاد آیا۔ بلائیدڈینر نام تھا اس ہیروئن کا۔ ارے ہاں بلائید ہی تو تھا۔ اور انھیں اس نام سے ورڈز ورتھ کی نظم 'ٹو دی ککو' کی ابتدائی لائنیں یاد آ گئی تھیں:

O blithe New-comer! I have heard,
I hear thee and rejoice.
O Cuckoo! shall I call thee Bird,
Or but a wandering Voice?

یہ نظم انھوں نے اپنے اسکول کے زمانے میں یاد کی تھی۔ یہ فلم دیکھتے ہوئے انھوں نے یہ لائنیں سلطانہ کو سنائی تھیں۔ نہیں نہیں... یہ لائنیں تو انھوں نے اپنی لومیکنگ کے دوران دہرائی تھیں، انھوں نے اپنی یادداشت کی تصحیح کی۔ ہاں ہاں... سلطانہ فلم دیکھنا چاہ رہی تھی کیونکہ اس کا رخ ٹی وی کی جانب تھا۔

انھوں نے فلم دیکھ رکھی تھی اس لیے کبھی کبھار سر کو موڑ کر دیکھ لیا کرتے تھے۔ جھیل میں کودنے کا منظر آیا تھا تو وہ اپنا کام چھوڑ کر وی سی آر کی طرف بڑھے اور پاز کا بٹن دبا دیا تھا۔ بلائید ڈینر جھیل کی طرف جا رہی تھی اور اس کی پیٹھ ٹی وی اسکرین پر آ رہی تھی۔ انھوں نے سلطانہ کو مشنری پوزیشن میں بحال کیا اور اسے نظم کی یہ لائنیں سنانا شروع کر دی تھیں۔ اور سلطانہ نے قہقہے لگاتے ہوئے کہا تھا:

"یہ نظم اسے سنائیں جا کر۔ بلا ڈی بلائید کو..." اور انھوں نے اس کا منہ چوم لیا تھا۔

لیکن اس سے پہلے کیا ہوا تھا؟ انھوں نے اپنی یادداشت پر مزید زور دیا۔

"سلطانہ! میں تمھیں ایسے بھاگتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں،" انھوں نے ٹی وی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ایسی ویران جگہ کہیں ملے گی پاکستان میں؟" سلطانہ نے اپنی بھری بھری آنکھوں سے انھیں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ان کے خیال میں آئے ہوئے نئے ایڈونچر کے لیے سلطانہ کی فوری آمادگی نے ان کا اشتعال بڑھا دیا تھا اور وہ تیزی سے دھکم پیل کرنے لگے تھے۔

ہاں سلطانہ! یہ دیکھو... دیکھو یہ ایسی ہی جگہ ہے۔ اپنی یادوں سے باہر آ کر انھوں نے اپنی توجہ اپنے سامنے موجود منظر کی طرف مبذول کر دی۔ "یہاں تم اپنی شرٹ اور جینز اتارو اور بھاگتی ہوئی، اس جھیل میں چھلانگ لگا دو۔ میں تمھارے پیچھے پیچھے آؤں گا۔"

"سلطانہ!" ان کے منہ سے آواز نکلی جو اس خاموشی میں بہت اونچی محسوس ہوئی۔ انھوں نے جھیل کی طرف دیکھا اور انھیں ایسا لگا جیسے سلطانہ اپنی شرٹ اور جینز اتار رہی ہو۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ سلطانہ ننگ دھڑنگ جھیل کی طرف بھاگتی جا رہی ہے۔

"رکو سلطانہ! میں بھی آتا ہوں..." انھوں نے اپنے دل سے آواز ابھرتی ہوئی محسوس کی۔ انھوں نے اپنے لانگ شوز اتارے، شرٹ اتاری، بنیان اتاری اور پھر پینٹ بھی اتار دی۔ اب ان کے جسم پر صرف انڈرویئر باقی رہ گیا تھا۔ وہ انڈرویئر میں ہی بھاگتے ہوئے جھیل کے قریب پہنچے۔ کنارے پر پہنچ کر انھوں نے اپنا انڈرویئر اتارا اور جھیل کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں اترتے چلے گئے۔

26

جھیل کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں پہنچ کر انھیں ایسا لگا جیسے وہ بہشت میں داخل ہو گئے ہوں۔ وہ والہانہ انداز میں اپنے ہاتھوں اور پیروں سے جھیل کی خاموشی میں چھپاکے مارتے ہوئے تیرنے لگے اور ان کے منھ سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں:

"اووووووہ! ہاہاہاہاہا! اوووووووووووہ! ہاہاہاہا!"

یہی وہ لمحہ تھا جب انھیں ایسا احساس ہوا جیسے ان کے بائیں کندھے پر کسی نے کلھاڑی کا تیز وار کیا ہے۔ کچھ لمحوں کے لیے ان کے بایاں ہاتھ سن ہو کر رہ گیا اور انھوں نے خود کو پانی میں غوطہ کھاتے ہوئے پایا۔ ان کے حواس بحال ہوئے تو وہ صرف دائیں بازو کے سہارے تیر کر پانی کے اوپر آئے۔ کندھے سے شروع ہونے والا درد اب ان کے سینے کو چیر رہا تھا۔ انھیں اپنا دم بھی گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ انھوں نے مڑ کر جھیل کے کنارے کی طرف دیکھا جو کچھ ہی دور تھا لیکن تکلیف کی اس شدت میں وہاں تک پہنچنا بھی انھیں بہت مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ انھوں نے اپنے دائیں بازو کو تیزی سے حرکت دی۔ اسے دس پندرہ بار حرکت دینے کے بعد انھیں اپنے پیر زمین سے ٹکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اب وہ کنارے تک باقی سفر پانی میں چل کر طے کر سکتے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ انھیں دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔

اقبال محمد خاں کو جس شدت کا درد محسوس ہو رہا تھا اس کے ہوتے ہوئے انھیں اپنی جیپ تک پہنچنا، پھر اسے چلانا اور چلاتے ہوئے بنگلے تک لے جانا اور پھر وہاں سے کسی اسپتال میں پہنچنا ناممکن محسوس ہو رہا تھا۔ اور اتنی صبح منڈی بہاء الدین کے اسپتال میں کوئی ڈاکٹر بھی تو نہیں ہوگا، انھوں نے سوچا۔ اپنی باقی ماندہ ہمت کے ساتھ میں کہاں تک جا سکتا ہوں؟ انھوں نے خود سے پوچھا۔ انھیں احساس ہوا کہ وہ سرتاپا برہنہ ہیں اور اگر انھیں کچھ ہو گیا تو ان کی لاش اس حالت میں نہیں ملنی چاہیے۔ کم از کم انھیں اتنی ہمت کرنی چاہیے کہ اپنے کپڑے پھر سے پہن لیں۔ انھوں نے ہمت کی اور کنارے پر پہنچ گئے۔ انھوں نے خود کو کنارے پر گرا لیا اور انڈرویئر اٹھا کر اسے اپنی ٹانگوں سے اوپر چڑھا لیا۔ سڑک کے کنارے پر ان کی جیپ کھڑی تھی۔ اب ان کے سامنے دو راستے تھے۔ یا تو وہ اپنے کپڑے اٹھانے کے لیے ویران قطعے کی جانب بڑھیں، یا پھر جیپ میں بیٹھ کر جلد از جلد اسپتال یا بنگلے کا رخ

کریں۔ وہ جیپ تک پہنچے تو انھیں اس میں اپنا پسینہ پونچھنے والا تولیہ پڑا ہوا نظر آ گیا۔ تولیہ انھوں نے اپنی کمر کے گرد باندھنے کی کوشش کی تو انھیں احساس ہوا کہ تولیہ اس کام کے لیے بہت چھوٹا ہے اور اسے کمر کے گرد گھما کر اس کی دوسری تہہ کو پہلی تہہ پر چڑھایا نہیں جا سکتا۔ پھر بھی انھوں نے وہ تولیہ اپنے انڈرویئر کے اوپر ایسے باندھ لیا کہ اس کی نوک بمشکل ان کی کمر کا احاطہ کر کے تولیے میں اڑسی جا سکتی تھی۔ وہ کوئی سورت یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور ایسے وقت میں تولیے کے کمر کے گرد اچھی طرح بندھ نہ سکنے کا ایک معمولی سا مخمصہ ان کا دھیان بانٹ رہا تھا۔ ان کی مدد کے لیے ان کے پریشان ذہن میں ان کی والدہ کی وہ تصویر چمکی جس میں وہ جوان تھیں اور مراد آباد میں اپنے بیٹے کو سورۂ فاتحہ پڑھا رہی تھیں۔ پڑھو الحمدو... الحمدو... للہ... للہ... ربّل ربّل عالمین عالمین۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ ساتھ دہرا رہے تھے۔ وہ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے۔ دائیں ہاتھ سے اگنیشن میں چابی گھمائی اور بایاں ہاتھ گیئر پر رکھا۔ ابھی وہ گاڑی کو نیوٹرل سے نکال کر پہلے گیئر میں ڈال بھی نہ پائے تھے کہ انھیں یکایک اپنے بائیں کاندھے میں درد کی کاٹ دینے والی لہر محسوس ہوئی۔ ان کا ہاتھ گیئر پر سے چھوٹ گیا اور سیٹ پر ان کی گردن ڈھلک گئی۔

سورج کی پہلی کرن مشرق سے طلوع ہو رہی تھی اور ان کی رکی ہوئی جیپ کے چلتے ہوئے انجن کی گھرر گھرر صبح کی خاموشی کو توڑنے والی واحد آواز کی صورت دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔

❁❁